حفیظ جالندھری کی نثر نگاری : ایک تنقیدی جائزہ

(مقالہ برائے ایم۔ایس اُردو)

مقالہ نگار

ماریہ حسن کیانی

رجسٹریشن نمبر: 60-FLL/MS Urdu/F09

نگران مقالہ

ڈاکٹر طیب منیر

2059

16-06-16

شعبہ اُردو

کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

۲۰۱۳ء

9/1/2020

Accession No. TH-13866

MS
891.439808
م ا ح

اردو ادب ۔ نثر نگاری

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Maria Hassan Kaiani**

Title of the Thesis: "حفیظ جالندھری کی نثر نگاری: تنقیدی جائزہ"

Registration No: 60-FLL/MSURDU/FO9

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE	
External Examiner: **Dr. Shafiq Anjum** Assistant Professor Department of Urdu NUML University Islamabad	***Internal Examiner:*** **Dr.Aziz Ibnul Hassan** Assistant Professor Department of Urdu IIUI
Supervisor: **Dr.Tayyab Munir** Associat Professor Urdu Department IIUI	
Chairperson Department of Urdu	**Dean** Faculty of Language & Literature

تصدیق نامہ

ایم ایس اُردو کی سکالر ماریہ حسن کیانی نے اپنا مقالہ بہ عنوان: ''حفیظ جالندھری کی نثر کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' میری نگرانی میں تحریر کیا ہے۔ یہ مقالہ تحقیقی اور تنقیدی دونوں حوالوں سے ایم ایس کے معیار کے مطابق ہے۔

مقالہ نگار نے حتی الوسع بنیادی ماخذات سے استفادہ کیا ہے۔ زبان وبیان کے لحاظ سے بھی مقالہ تسلی بخش ہے۔ میں اس مقالے کو جانچ پرکھ کے لیے بیرونی ممتحین کو بھجوانے کی سفارش کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر طیب منیر)

نگران مقالہ

Rupees 20 ۲۰ روپیہ

حلف نامہ

میں مسماۃ ماریہ حسن کیانی دختر محمد عابد حسین کیانی رجسٹریشن نمبر 60-FLL/MSURDU/F09 یہ اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ بعنوان ''حفیظ جالندھری کی نثر کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' برائے حصول سند ایم ایس اردو میں نے خود اپنی محنت سے تحریر کیا ہے۔ یہ مقالہ سرقہ سے پاک ہے اور اس میں تحقیق وتنقید کے اصول وضوابط کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ نیز اس سے پہلے یہ کسی یونیورسٹی میں برائے حصول سند پیش نہیں کیا گیا۔ اس میں شامل تمام حوالہ جات کا استناد موجود ہے اور میں مقالہ کے تمام نتائج تحقیق کی ذمہ دار ہوں۔

المحلفہ

Maria Hassan

مسماۃ ماریہ حسن کیانی مذکورہ

شناختی کارڈ نمبر: 37201-0217927-8

پیش لفظ

حفیظ جالندھری اُردو کے عظیم شاعر ہیں۔آپ کے سفرِ زیست کا آغاز ۱۹۰۰ء سے ہوا۔حفیظ جالندھری کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنا شعری سفر بیسویں صدی کے ساتھ ساتھ جاری رکھا۔حفیظ جالندھری نے اپنی شاعری کی بنیاد علمی اور فکری سطح پر کلاسیکی روایت سے مربوط کر کے رکھی۔ان کی شاعری قیام پاکستان سے قبل اور بعد کی صورتِ حال کی عکاس ہے۔ان کی شاعری میں صوفیانہ تصورات کے ساتھ ساتھ زندگی کی حقیقتیں اور بصیرتیں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔

حفیظ جالندھری کی شاعرانہ حیثیت مستند اور مسلم الثبوت ہے۔ان کی شاعری پر بہت زیادہ لکھا گیا اور کہا گیا۔تحقیق کاروں نے حفیظ جالندھری کی شاعری پر تحقیقی مقالے تحریر کر کے اپنا تحقیقی فریضہ بخوبی سرانجام دیا۔لیکن ان کی نثر جو کسی طرح بھی ادبی معیار سے کم نہ تھی،قدرے نظر انداز ہوتی رہی۔اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان کی نثر کے مختلف پہلوؤں کو منظر عام پر لایا جائے۔

تحقیق کے عمل میں کس قدر تدقیق اور دشواری ہے شاید اس بات کا اندازہ صرف اور صرف وہی کر سکتا ہے جو اس دشت کی خاک چھاننے میں مصروف ہو۔تحقیق کے عمل کے لیے انسان کو جو حوصلہ،عزم اور رہنمائی ضروری ہوتی ہے۔سچی اور کھری بات یہ ہے کہ میرے پاس یہ سب کچھ تو موجود نہیں تھا مگر میں اس لحاظ سے اپنے آپ کو خوش قسمت خیال کرتی ہوں کہ مجھے ڈاکٹر طیب منیر نے حفیظ صاحب کی کم یاب نثری تحریریں فراہم کیں۔اس کے علاوہ ڈاکٹر رشید امجد اور ڈاکٹر نجیبہ عارف جیسے رہنماؤں کی رہنمائی میسر آئی۔ان سب کی رہنمائی نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اس مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکوں۔اس کے علاوہ میں اپنے والدِ محترم ڈاکٹر محمد عابد حسین کیانی،اپنی والدہ محترمہ ناہیدہ کیانی اور اپنے برادران، تیمور حسن کیانی،محمد زبیر حسن کیانی کی ممنون ہوں جنہوں نے مجھے ہر مقام پر حوصلہ مندی اور صبر و سکون کا درس دیا۔

اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اُس نے حفیظ جالندھری جیسی عظیم شخصیت کی نثر پر یہ مقالہ تحریر کرنے کی سعادت مجھے بخشی اور اس سفر کی تکمیل کا حوصلہ عطا کیا۔

ماریہ حسن کیانی

فہرست ابواب

پیش لفظ

باب اول: حفیظ جالندھری احوال و آثار

باب دوم: حفیظ جالندھری کی طبع زاد افسانوی نثر

باب سوم: حفیظ جالندھری کی متفرق نثری تحریریں

کتابیات

ضمیمہ جات

باب اول

حفیظ جالندھری: احوال و آثار

باب اول:

حفیظ جالندھری: احوال و آثار

پیدائش ____ تعلیم ____ اساتذہ ____ عائلی زندگی ____ ادبی رسائل کی ادارت ____ ماہنامہ ''اعجاز شباب اردو''، ''ہزار داستان''، ''نونہال'' اور ''مخزن'' ____ اسفار (دہلی، میرٹھ، لاہور، ماسکو، سائبیریا، سمرقند، لندن، مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، کابل، قندھار) ____ شاعری ____ چند باتیں

ابوالاثر حفیظ جالندھری اردو کے عہد ساز شاعر ہیں مگر ان کی شناخت جہاں شاعری قرار پائی ہے وہاں قومی ترانے کے خالق کی حیثیت سے ان کا تشخص قومی حوالوں سے اور بھی نمایاں ہے۔ اردو گیت نگاری کے میدان میں حفیظ جالندھری کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ شعری مہمات کے ساتھ ساتھ نثری تحریروں کا ایک خاطر خواہ ذخیرہ بھی ان کی یادگار ہے جس پر تحقیقی وتنقیدی کام نہیں ہوا۔ ہمارے پیش نظر حفیظ کی نثری نگارشات ہیں۔

حفیظ ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء کو موجودہ بھارتی پنجاب کے شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حافظ شمس الدین حافظ قرآن تھے۔ انہوں نے ان کا نام محمد عبدالحفیظ رکھا۔ حفیظ کے بزرگ ریاست جودھ پور کے چوہان خاندان کے ایک معزز فرد رانا ٹھاکر پرتھوی سنگھ جو مغل بادشاہ فرخ سیّر کے دورِ حکومت (۱۷۱۳ء۔۱۷۱۹ء) میں اپنے کنبے سمیت اپنا آبائی مذہب ترک کر کے مسلمان ہو گئے تھے اور رانا عبدالشکور کہلائے۔ وہ حفیظ کے سگڑ دادا تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد جودھ پور سے ہجرت کر کے ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر میں مقیم ہوئے۔ بادشاہ نے انہیں جالندھر میں جاگیر عطا کی جو ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم کی پاداش میں ضبط کر لی گئی۔ حفیظ کے دادا مہر الدین اسلحے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے والد حافظ شمس الدین بھی اسی کاروبار سے منسلک ہو گئے۔ معاشی اور مالی حالات اچھے نہ تھے۔ حفیظ کے والد نے دو شادیاں کیں۔ حفیظ اپنے والد کی دوسری بیوی بتول کی پہلی اولاد تھے۔ ان کی والدہ ماجدہ بتول کا انتقال ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ سوتیلے بہن بھائیوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ گھریلو حالات ناخوشگوار تھے۔ ان کی والدہ کی ایک قریبی رشتہ دار اور بے اولاد خاتون نے چار سال کی عمر میں انہیں اپنا متبنیٰ بنا لیا۔ وہ چار سال چار ماہ اور چار دن کے تھے جب محلے کی مسجد میں ان کی تعلیم کا آغاز ہوا۔

حفیظ کو ان کی والدہ نے کلمہ طیبہ، کلمہ شہادت، درود، الحمد اور قل ہو اللہ کی سورتیں تین چار برس کی عمر میں ہی یاد کرا دی تھیں۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز ۱۹۰۵ء میں جالندھر کی حوض والی مسجد میں ہوا۔ انہوں نے وہاں سے ناظرہ قرآن شریف پڑھا۔

۱۹۰۷ء میں مشن ہائی اسکول کی ایک شاخ میں داخل ہوئے۔ تین ہی مہینے میں دوسری جماعت میں بھیج دیا گیا۔

فطری شاعر کی طبیعت بچپن ہی سے شعروسخن کے لیے موزوں ہوتی ہے۔ جس کا وقتاً فوقتاً اظہار ہوتا رہتا ہے۔ اس قسم کا ایک جنونِ شعر جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے کافی شدید تھا حفیظ پر بچپن میں ہی حاوی ہو گیا تھا۔ حفیظ کی عمر صرف سات برس کی تھی اور وہ دوسری جماعت میں پڑھتے تھے تو انہوں نے ایک نظم کہی جو آنحضرتؐ کی تعریف میں تھی۔ یہ ان کی پہلی تعلیم یعنی مسجد کی تعلیم کے مذہبی نقوش کا پہلا واضح عکس تھا جو بعد میں حفیظ کے ذہن میں پختہ اور واضح تر ہوتا چلا گیا تھا۔

اس نظم کے دو شعر ہیں:

محمدؐ کی کشتی میں ہوں گا سوار
تو لگ جائے گا میرا بیڑا بھی پار
محمد حفیظ نے بنائی غزل
ہے اس وقت اس پر خدا کا فضل

پھر یہ اسکول چھوڑ کر گورنمنٹ ہائی سکول جالندھر کی دوسری جماعت میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۰۹ء میں دوآبہ آریہ اسکول میں چوتھی جماعت میں داخل ہوئے۔ وہاں ایک آریہ سماجی لڑکے کے ساتھ جھگڑے کی بنا پر اس اسکول سے نکلنا پڑا۔ کچھ دنوں بعد مشن ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ ان کی شعروشاعری اور قصے کہانیاں پڑھنے کی عادت تھی۔ اسکول سے ساتویں جماعت کا امتحان دے کر گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد وہ کسی تعلیمی ادارے سے منسلک نہیں ہوئے البتہ انہوں نے اپنے ذوق ووجدان سے وسیع پیانے پر مطالعہ کیا اور اردو کے علاوہ ہندی، فارسی اور انگریزی پر بھی قدرت حاصل کر لی۔

مسجد کے جدی امام کے علاوہ مولوی عبدالوہاب جو سید احمد شہید کی تحریک آزادی کے ایک مجاہد تھے ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت کا حفیظ پر بہت گہرا اثر رہا اور اسکول میں بابو لال جی کبڑے کی قمچیوں اور مولوی فتح دین کی گھرکیوں اور جھڑکیوں کا بھی گہرا اثر رہا۔ یہ وہ اساتذہ ہیں جن کا حفیظ کے دل پر گہرا نقش رہا۔ فارسی میں حفیظ نے مولوی سید احمد علی شاہ کی خصوصی توجہ سے بہت کام کیا۔ اوائل عمر میں قرآن مجید اور دیگر مذہبی کتب کے علاوہ اخلاقی کتابوں سے بھی متاثر ہوئے۔

شعروادب سے حفیظ کو فطری اور پیدائشی لگاؤ تھا۔ پانچ چھ سال کی عمر میں محلے میں منعقد ہونے والی میلاد شریف کی محفلوں میں نعتیں اور مسدس حالی کے اشعار ترنم سے پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ گو حفیظ ایک ذہین بچہ تھا جس کو طبعاً کھیل کود سے نفرت تھی مگر وہ اکثر سکول سے بھاگ جاتے جس کی پاداش میں جرمانے کے علاوہ اس کو جسمانی سزا بھی بھگتنا پڑتی مگر اس مار پیٹ کا حفیظ کے پروگرام پر قطعی اثر نہ پڑتا۔ حفیظ کے دل میں حسن فطرت کے لیے غیر شعوری کشش موجود تھی وہ بچپن میں اسکول سے بھاگ کر ہمیشہ کھلے میدانوں میں یا گاؤں کا رخ کرتا یہاں تک کہ انہوں نے بارہ برس کی عمر میں مظاہر فطرت میں باقاعدہ دلچسپی لینی شروع کر دی۔ وہ اس زمانے میں گھر سے اسکول کے لیے جب نکلتے تو سکول جانے کی بجائے کھلے میدانوں میں چلے جاتے اور اس طرح اپنے اندر کے کسی نامعلوم جذبے کی تسکین کا سامان فراہم کرتے۔ اس زمانے میں حفیظ کو اردو کی نظمیں اور کہانیاں پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ جو گھر والوں سے چھپا کر پڑھی جاتی تھیں۔ اس کے بعد ناول اور ہلکی پھلکی ادبی کتابوں کا وسیع پیانے پر مطالعہ کیا۔ ''طلسم ہوش ربا''، ''فسانہ آزاد''، ''آرائش محفل''، اور مولوی نذیر احمد کی کتابوں سے ان کا ذہن بہت متاثر ہوا۔ مولانا عبدالقادر گرامی سے تعلق قائم ہونے سے بعد فارسی شعروشاعری کا بھی مطالعہ کیا۔ ان کو عربی لغات اور قرآن پاک کی تفاسیر سے بھی بہت شغف تھا۔

سر عبدالقادر، سر راس مسعود، سید سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خان، سائل دہلوی کے علاوہ بنارس کے بابا خلیل داس چتر ویدی کی شخصیت سے بطور خاص متاثر ہوئے۔ شعر میں مذہبی رنگ مولانا حالی کا غالب رہا۔ جوانی میں مومن اور کبیر داس کے علاوہ داغ کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش میں اکثر ان کی غزلوں میں اپنا شعر شامل کر کے اس کی داد بھی داغ مرحوم کو دلوانے کا مزہ لیتے رہے۔ لیکن اپنے طرز خاص اور اپنی انفرادیت کا برصغیر میں لوہا منوایا۔

۱۹۱۱ء میں جب حفیظ چھٹی جماعت میں تھے جب پہلی غزل لکھی تھی۔ اس کا مطلع یہ ہے۔

خواب میں دلدار کی تصویر ہم نے دیکھ لی
رات کو جاگی ہوئی تقدیر ہم نے دیکھ لی

۱۹۱۱ء میں سب سے پہلے جالندھر کے ایک اسکول ٹیچر سرفراز خان سرور صاحب کو چند غزلیں دکھائیں لیکن چند غزلوں کے بعد اپنے ہی ذوق پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۱۵ء میں مکیو بان کے قریب ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی وہاں ٹائم کیپر کی حیثیت سے گھر سے بھاگ کھڑے ہونے کے دوران چند ماہ ملازمت کی اور ۲۲ روپے ماہوار تنخواہ پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۱۶ء میں حفیظ نے جالندھر میں عطر اور خوشبویات کی دکان کھولی۔ یہ دکان عشق و محبت کی دکان ثابت ہوئی۔ شاعروں کا جمگھٹا رہنے لگا۔ رنگ رنگ کے حسین صورت لوگ عطر کی قیمتی شیشیاں مسکرا مسکرا کر اٹھانے لگے۔ گرمی بازار ایسی بڑھی کہ دکان بڑھانی پڑی۔ اس کے بڑھانے میں حفیظ کے دوستوں اور ان کے حسین محبوبوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ سولہ برس کی عمر میں حفیظ نے باقاعدہ شعر کہنے شروع کر دیے۔ حفیظ اس زمانے میں لاابالی مزاج کا ایک لاپرواہ لڑکا تھا مگر اس زمانے میں ان کی مالی حیثیت کچھ اچھی نہ تھی۔ اس کے علاوہ ان کے قریبی رشتہ داروں کے یکے بعد دیگرے اموات کے ردعمل کے طور پر حفیظ کے اس زمانے کے اشعار میں حزن و کرب اور دنیا کی بے رخی اور غم واندوہ کے نقوش ملتے ہیں۔ اس زمانے کے چند اشعار یہ ہیں۔

میں وہ برگ خزاں دیدہ ہوں اس گزار ہستی میں
بگولہ جس کے شائق جس کے عاشق باد صرصر ہو

غنچہ غنچہ خوف سے مجھ کو نظر آیا قفس
پتہ پتہ پر ہوا دھوکہ کف صیاد کا

ہوئی یہ رات بھر میں خندہ ہائے عیش کی صورت
چمن کا غنچہ غنچہ صبح کو اک چشم گریاں تھا

اس کے بعد کے زمانے میں حفیظ ملازمت کرتے رہے تب بھی ان کی توجہ شعروشاعری پر ہی مرکوز رہی اور ایک نقاد کے مطابق حفیظ نے شاعری کو اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۸ء میں جنگ کے دوران فوجی وردیوں کی تیاری کا ٹھیکہ لیا اور پھر خیاطی کے علاوہ ٹوپیاں بنانے کا کام بھی سیکھنا چاہا تاکہ خیاطوں سے کام لے سکیں لیکن اس میں وہ ناکام رہے۔ ۱۹۱۷ء میں یعنی دوران جنگ میں اس نے بڑے انعامی مشاعرے کا اشتہار دیکھا۔ بڑی جھجک کے بعد دوستوں کے اصرار سے انہوں نے جنگ پر لکھی ہوئی اپنی دو نظمیں اس مشاعرے میں پڑھیں۔ مقابلے میں حصہ لینے والے شاعر دیکھتے ہی رہ گئے اور سترہ برس کے حفیظ نے انعام کے دونوں طلائی تمغے جیت لیے۔ اس مشاعرے میں شاعر حفیظ پہلی مرتبہ عوام سے متعارف ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں حفیظ ۱۷ برس کے ہوئے تھے کہ گھر والوں نے شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔ اس خیال سے کہ شادی کے بعد حفیظ کی آوارگی اور بیکاری میں کوئی فرق پڑ جائے اور احساس ذمہ داری پیدا ہوگا۔ ان کے سسرال لاہور میں رہتے تھے۔ ان کی پہلی بیوی کا نام زینت خاتون تھا جو کہ ان کی خالہ زاد تھیں۔ اس بیوی کے بطن سے آٹھ لڑکیاں پیدا ہوئیں جن میں سے پانچ زندہ رہیں۔ فکر سخن کے ساتھ بیوی کی دیکھ بھال اور اس کے نان نفقہ کی فکر بھی آدامن گیر ہوئی۔ انہیں اپنی رفیقہ حیات کی دلجوئی کا خیال بہر حال ملحوظ خاطر تھا۔ ایک مشاعرے میں سونے کا تمغہ انعام ملا تو گھر جانے سے پہلے سنار کی دکان پر گئے۔ سونے کے تمغے کے بدلے وہاں سے بیوی کے لیے زیور لیا اور اس طرح اپنی بیوی کو بھی اپنی خوشی میں شریک کرلیا۔ حفیظ کی عمر ابھی سترہ سال ہی تھی کہ ان کو کنبہ کی پرورش کی خاطر ملازمت کرنا پڑی۔ اس زمانے میں انہوں نے ہر چھوٹی سے چھوٹی نوکری کی اور مالی حیثیت سے بہت پریشان رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۷ء ہی کے قریب ان کو اپنا مکان بیچنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ مشاعروں میں غیر معمولی شہرت حاصل کر رہے تھے اور اس وقت کے مشاعروں میں وافر داد وصول کر رہے تھے مگر ان کی جیب میں جب کوئی پیسہ نہ ہوتا تو وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے ریلوے اسٹیشن جاتے اور لائسنس یافتہ قلیوں کی نظروں سے بچ بچا کر مسافروں کا سامان اٹھاتے تھے اور کوئی عار نہ سمجھتے تھے تاکہ رات کو گھر جاتے وقت بیوی بچوں کے لیے چار پیسے بن جائیں۔ شاعری کی مشق جاری رہی اور ۱۹۱۸ء میں حفیظ کی پہلی ملاقات اپنے والد کے ایک دوست مولانا عبدالقادر گرامی سے ہوئی اور انہوں نے مولانا گرامی کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ انہوں نے سہل ممتنع پر مائل کیا۔ گرامی کے ساتھ ان کی بہت گہری وابستگی رہی۔۔ گرامی فارسی کے مشہور شاعر تھے اور نواب سر محبوب علی خان (نظام حیدر آباد) کے درباری شاعر تھے۔ اس کے بعد حفیظ کی شاعری گرامی کے سایہ میں پرورش پاتی رہی۔ گرامی ہی کی محبت میں حفیظ نے فارسی میں اپنی استعداد خاص بڑھالی۔ اب حفیظ اردو کا ایک مشہور شاعر تھا۔ وہ شعروشاعری کے افق کا ایک نیا مگر درخشاں ستارہ بن کر ابھرے۔ شعروسخن کی محفلوں میں بھی ان کے چرچے ہونے لگے کیونکہ انہوں نے اپنے کلام سے کئی بار محفل کو تڑپا دیا۔ اور کئی پرانی لکیر کے فقیر شعرا کی شہنائیاں ان کی آواز کے سامنے گنگ ہوگئیں۔

۱۹۲۰ء میں ضلع فیروز پور اور اوکاڑہ ضلع منٹگمری میں سنگر کمپنی کے منیجر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ حفیظ نے چند سال مختلف کام کیے۔ اس کے بعد حفیظ کی ادبی صحافت سے وابستگی کا دور شروع ہوا۔ انہوں نے سب سے پہلے ۱۹۲۱ء میں ملک الشعرا فارسی مولانا عبدالقادر گرامی کی زیر سرپرستی اور اپنی ملکیت و ادارت میں رسالہ ''اعجاز'' جالندھر سے نکالا۔ اس رسالے کی صرف پانچ شمارے شائع ہو سکے کہ جلد ہی معیاری مضامین دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے بند ہو گیا اور حفیظ کو ان کے والد نے نقصان سرمایہ سے باعث گھر سے نکال دیا اور حفیظ کے لاہور آنے اور شہرت دوامی کے جھنڈے نصب کرنے کی راہ ہموار ہو گئی۔ حفیظ سیر و سیاحت کے شائق تھے ابتدا میں گھر سے بھاگ کر دہلی، میرٹھ، بمبئی، کلکتہ اور اطراف لاہور کے چکر لگاتے تھے اور پھر جب ذمہ دارانہ زندگی کا آغاز کیا تو ۱۹۲۱ء میں ماہنامہ ''اعجاز'' کے سلسلے میں لاہور، دہلی اور یوپی کا سفر کیا۔ لکھنو میں سرائے کی کوٹھڑی میں ٹھہرے اور عزیز لکھنوی، شرر لکھنوی، جالب دہلوی، یاس یگانہ چنگیزی اور صفی لکھنوی سے ملاقاتیں کیں۔ کان پور میں نواب جعفر علی خان اثر کے مہمان ہوئے اور دیا نرائن نگم، حسرت موہانی سے ملے۔ رام پور میں شوق قدوائی سے نیاز حاصل کیا۔

۱۹۲۲ء میں حفیظ رسالہ ''شباب اردو'' لاہور کے جائنٹ ایڈیٹر رہے اور ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ وصول کرتے تھے۔ جب حفیظ نے کشمیر جنت نظیر کا پیادہ سفر کیا جموں کے مشاعروں میں شرکت کی اور لوگوں کو چونکاتا ہوا وادی کی سمت بڑھا اس سفر کا حاصل اس کی وہ معرکہ آرا نظم تھی جو چشمہ ویری ناگ پر ''ایک آنسو'' کے عنوان سے ماہ نامہ ''شباب اردو'' لاہور میں شائع ہوئی جو ان دنوں حفیظ ہی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ حفیظ جب لاہور آئے تو انہیں بچوں کے اخبار پھول کی ادارت کا موقع ملا۔ انہوں نے بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر متعدد نظمیں لکھیں جو زیادہ تر ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۶ء کے دوران لکھی گئیں۔ پہلے ''بہار کے پھول''، ''پھول مالا'' زیر عنوان دو مجموعوں میں نظمیں شائع ہوئیں اور بعد ازاں ''حفیظ کے گیت اور نظمیں'' کے زیر عنوان چار جلدوں میں یکجا کر دی گئی ہیں۔

۱۹۲۳ء میں حفیظ نے تین ماہ روزنامہ ''زمیندار'' میں مراسلات کی زبان درست کرنے کے لیے پارٹ ٹائم ملازمت کی۔ کچھ دن رسالہ ''تبلیغ'' کے نائب مدیر رہے پھر اسی سال لاہور کے بہترین ادبی رسالہ ''ہزار داستان'' اور ''نونہال'' کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ اسی سن میں مرتضیٰ احمد میکش کے ہمراہ دوبارہ کشمیر کا پیدل سفر کیا۔ حفیظ کی علامہ اقبال سے پہلی ملاقات لاہور میں ایک مشاعرے میں ہوئی۔ ان کو علامہ صاحب سے بہت عقیدت تھی۔

وہ بیان کرتے ہیں:

> ''۲۴-۱۹۲۳ء میں ''تہذیب'' اور ''پھول'' میں کام کرتا تھا یعنی ان کا ایک طرح سے مدیر تھا۔ انہی دنوں میں ایک ہندو روزنامے میں ڈاکٹر صاحب کے کلام پر اعتراضات آنے لگے۔ لاہور کے کچھ لوگ جن میں

لال دین قیصر آگے آگے تھے یہ سمجھتے تھے کہ یہ میری کارستانی ہے۔ ڈاکٹر صاحب پر اعتراضات کرنے والے بزرگ ''جراح'' کے نام سے لکھتے تھے۔ میں اور میرے بعض شاگردان اعتراضوں کے جواب لکھتے تھے۔ مگر جو لوگ مجھ سے بدظن تھے وہ کہتے تھے کہ میں نے ایک پاکھنڈ کھڑا کر رکھا ہے۔ خود ہی اعتراض کرتا ہوں، خود ہی جواب لکھتا ہوں۔ نوبت باینجا رسید کہ ان لوگوں نے میری پٹائی کا پروگرام بنایا۔'' ۱

میں ''سوز و ساز'' کی کاپیاں پڑھ رہا تھا۔ اچانک سر راس مسعود ماڈل ٹاؤن میں میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ میرے سامنے میری نظم تین نغمے ٹیگور، اقبال، حفیظ کی کاپی کھلی پڑی تھی۔ یہ شاہنامہ جلد اول کے شائع ہونے سے بعد کی بات ہے۔ سر راس مسعود کو یہ نظم بہت ہی پسند تھی۔ لہٰذا دیکھتے ہی فرمایا ''پکڑا گیا''۔ اور پھر کاپی چھین لی۔ لپیٹی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھ سے کہا ''چلو میرے ساتھ''۔ میں چل دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے سر محمد شفیع مرحوم کے ٹھکانے پر لے جائیں گے کیونکہ وہ لاہور میں عموماً انہی کے یہاں ٹھہرتے تھے مگر وہ مجھے ڈاکٹر صاحب کے مکان پر لے گئے اور جاتے ہی کہا ''میں تمہارے چور کو پکڑ لایا ہوں۔ یہ تمہارے لیے لکھتا ہے اور تمہیں سناتے ہوئے شرماتا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب بولے ''حفیظ جی کیا بات ہے؟ سناؤ۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کر کے اپنا کلام سنایا۔ مجھے اس امر پر بڑا احساس فخر ہوا اور تا حال میرے احساس کا وہی حال ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس حصے سے بہت ہی متاثر ہوئے جہاں میں نے انہیں دریا سے تشبیہہ دی تھی اور ان کے حضور اپنی عقیدت کا ہدیہ پیش کیا تھا۔ میں نے کہا تھا۔

درد کی چیخیں اٹھیں میرے شکستہ ساز سے
آب دیدہ ہو گیا دریا میری آواز سے

ڈاکٹر صاحب کے آنسو نکل آئے اور جب میں نے یہ شعر پڑھا

میرا نغمہ نغمہ دریا سے کم آواز تھا
ہاں مگر ہم رنگ وہم آہنگ و ہم آواز تھا

تو ڈاکٹر صاحب نے بے ساختہ کہا ''ہم آواز۔ ہم آواز''۔ نظم ختم ہوئی تو سر راس مسعود بولے ''دیکھا میرا بیٹا؟ کیسا ہے؟'' خدا نے میرے دادا کو حالی عطا کیا تھا مجھے حفیظ دیا ہے''۔

''سر راس سراپا اخلاص تھے۔ اپنے انداز میں کہے جا رہے تھے۔ میں کچھ ان کی بے پناہ شفقت اور کچھ ڈاکٹر صاحب کے رعب سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا ''حفیظ جی، تمہارا انداز بیاں گرامی مرحوم کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ مرحوم نے تمہاری خوب تربیت کی ہے۔ ان کے شکر گزار رہو اور حفیظ جی! کبھی کبھی آ بھی جایا کرو۔'' ۲

''جب میں نے شاہنامہ شروع کر دیا اور جب پہلی جلد چھپ گئی اور ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گزری تو انہوں نے پسند فرمائی۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب میں حج پر جانے لگا اور ڈاکٹر صاحب کے حضور وداعی ملاقات کے لیے پہنچا تو انہوں نے آبدیدہ ہو کر فرمایا تھا ''حفیظ جی! شاہنامہ ساتھ لے جاؤ۔ اگر ہو سکے تو سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں پیش کرنا''۔ پھر جب ڈاکٹر صاحب کو گردے کی تکلیف ہوئی تو مجھے بلوایا اور مجھ سے شاہنامہ کے مختلف حصے سنے۔ خصوصاً وہ حصے جن میں حضور اکرم ﷺ کا ذکر جمیل تھا''۔۳

''ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں جب ''یوم اقبال'' منایا گیا تو اس محفل میں میں بھی شریک تھا۔ میں نے اپنی نظم ''میرا اقبال'' اس محفل میں پڑھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اگلے روز مجھے اپنے گھر پر بلوایا اور یہ نظم دوبارہ سنی۔ ایک روز بیماری کی شدت میں مجھ سے کہا ''حفیظ جی! تم میرا مرثیہ ضرور لکھنا''۔ میں رو دیا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے سفر آخرت اختیار کیا تو میں ملک سے باہر تھا۔ بہر حال میں نے ڈاکٹر صاحب کے ایک سے زیادہ مرثیے لکھے۔''۴

حفیظ ابتدا ہی سے برصغیر پاک و ہند کی بیشتر انجمنوں، اداروں، تنظیموں اور تحریکوں کے لیے چندے کی فراہمی کا سب سے بڑا ذریعہ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی مشہور و معروف قومی اور رومانی نظموں کی بدولت لاکھوں روپے انجمنوں کے لیے فراہم کیے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق انہوں نے صرف انجمن حمایت اسلام لاہور کے لیے کم از کم بیس لاکھ روپے فراہم کیے تھے۔

۱۹۲۴ء میں ''ہزار داستان'' اور ''نونہال'' کے مالک کی غلط روش پر ادارت سے دست کش ہو گئے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ سید امتیاز علی تاج، سالک، پطرس بخاری وغیرہ سے حفیظ کی دوستی تھی۔ ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' کو ''ہزار داستان'' اور ''نونہال'' کا مالک رقیب سمجھتا تھا۔ اس نے حفیظ کو اپنے مدمقابل کا دوست جان کر ان سے تعلقات کا طعنہ دیا تھا۔ یہ بات حفیظ کو ناگوار گزری تھی اور وہ علیحدہ ہو گئے تھے۔ کچھ دنوں بعد ''پھول'' اور تہذیب نسواں'' میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں ملازمت کے علاوہ حفیظ نے معرکہ آرا مشاعروں اور جلسوں میں حصہ لے کر اپنے فن سے جادو جگایا اور شہرت و مقبولیت کی منزلوں کو سر کر لیا۔

۱۹۲۵ء میں کئی ماہ تک ریاست خیر پور میرس (سندھ) میں بحیثیت شاعر دربار مقیم رہے تھے۔ جولائی میں ایک نظم ''رقاصہ'' پڑھنے پر ان کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ تین دن تک محبوس رہنے کے بعد خارج از ریاست کیے گئے۔ حفیظ اردو ادب میں ایک دھماکے کے ساتھ نمودار ہوا اور یہ دھماکہ ۱۹۲۵ء میں نغمہ زار کی اشاعت تھا جو اپنے دامن میں اردو شاعری کے لیے کچھ نئے پھول اور کچھ انوکھے نغمے لایا۔ خوبصورت اور شیریں۔ حفیظ نے اردو شاعری کو پہلی مرتبہ اتنے میٹھے اور رسیلے گیت دیئے

جو اس سے پہلے نہیں لکھے گئے تھے۔ ان گیتوں کی مٹھاس ان کے رس رچاؤ بہاؤ اور سبھاؤ نے یک بارگی ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ شاہنامہ اسلام کے بعد حفیظ کی مقبول ترین کتاب یہی ہے۔ اب تک اس کے لاتعداد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ متعدد نظمیں اپنے انداز و اسلوب کی وجہ سے ''گیت'' قرار دی جا سکتی ہیں۔ غزلیات زیادہ تر روایتی اشعار پر مشتمل ہیں۔

برصغیر ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں جہاں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی تھی شعری ذوق رکھنے والوں کی زبان پر حفیظ کا نام تھا اور علم و ادب سے وابستہ کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں حفیظ کا کلام شاہنامہ اسلام کے نام سے موجود نہ ہو۔

شاہنامہ کی غایت کے بارے حفیظ لکھتے ہیں:

> ''میں نے ساقی نامہ ۱۹۲۸ء میں لکھا تھا۔ اس وقت اس نیم براعظم میں مسلمان ایسی لمبی تان کر سو رہے تھے کہ ان کا جاگنا اور مردانہ وار زندگی کا ارادہ کرنا خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ آج میں پچاس برس کا ہوں میں نے یہ سارا زمانہ اس ملک کے مسلمانوں کو اس کتاب کے اشعار خود اپنی زبان سے سنانے اور دور و دراز گوشوں میں طبع شدہ آواز پہنچانے میں صرف کیے ہیں۔ آج ۱۹۴۹ء ہے مسلمانوں نے زندگی کا ثبوت دیا ہے اور پاکستان قائم کر لیا ہے۔ شاید مسلمانوں کو جگانے کے سلسلے میں اللہ نے میری اس آواز سے بھی کام لیا ہے جو شاہنامہ کے اشعار میں قلمبند ہے۔''۵

۱۹۲۵ء کے اواخر میں حفیظ ہفتہ وار ''حمایت اسلام'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ ان کی ماہوار تنخواہ ڈیڑھ سو روپیہ تھی۔

۱۹۲۶ء میں حفیظ نے ماہنامہ ''مخزن'' کے ادارتی فرائض سرانجام دیتے تھے۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۳ء تک لاہور میں قیام پذیر رہے لیکن ہندوستان کے ہر شہر بلکہ مشہور قصبات میں بھی شاعروں یا اسلامی انجمنوں کے جلسوں کے لیے جاتے رہتے تھے۔

''ہندوستان ہمارا'' ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے بچوں کے لیے نصابی کتاب کی حیثیت سے لکھی گئی اس میں ہندوستان کی تاریخ کے مختلف ادوار کی اہم شخصیات پر چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ شخصیات میں ہر مذہب و ملک کے لوگ شامل ہیں۔ 'ہفت پیکر' کے افسانے کتابی صورت میں یکجا ہونے سے پہلے مختلف رسائل میں ۱۹۲۷ء سے قبل طبع ہو چکے تھے۔

حفیظ کو مسدس حالی سننے اور پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کا نعتیہ حصہ ''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا'' خصوصاً بہت مقبول تھا۔ غالباً انہیں شاہنامہ اسلام لکھنے کا خیال مسدس ہی سے آیا۔ جس کے اثرات شاہنامے پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۷ء تک یعنی بیس برسوں میں انہوں نے اس کی چار جلدیں شائع کیں۔ اس کا آغاز ''قطب الدین ایبک'' کے مزار کی خستگی سے ہوتا ہے جس سے شاعر کو یہ خیال آتا ہے کہ اسلام کے بڑے بڑے خدمت گزار بھلا دیئے گئے ہیں

چنانچہ وہ ارادہ کر لیتا ہے کہ خدمت اسلام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے گا۔

تمنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کر جاؤں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمت اسلام کر جاؤں

حفیظ کے سات افسانوں کا مجموعہ "ہفت پیکر" کی ۱۹۲۹ء میں اشاعت ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں ماڈل ٹاؤن لاہور سے ہفتہ وار "کارزار" نکالا جو دو سال تک جاری رہا۔

شعری مجموعہ "سوز و ساز" ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ غزلوں، نظموں اور گیتوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں حفیظ کی چند اہم تخلیقات بھی شامل ہیں اس کتاب میں پہلی دفعہ "گیت نگار" کے طور پر نمایاں ہونے کی کوشش ملتی ہے۔

۱۹۳۵ء میں مدینہ منورہ میں دربار رسالت پر حاضری دی پھر مکہ معظمہ میں حج کی سعادت حاصل کی۔ ۱۹۳۷ء میں حفیظ پہلی بار لندن گئے تھے۔ سر عبدالقادر جو ان دنوں انڈیا آفس کے ممبر تھے لاہور آئے ہوئے تھے۔ آپ نے حفیظ کو بیمار دیکھ کر لندن چلنے کا مشورہ دیا۔ وہاں ڈیڑھ سال قیام کیا کئی اجتماعات میں اپنا اردو کلام سنایا۔ سر عبدالقادر اس کا انگریزی میں ترجمہ کر دیتے تھے۔ حفیظ نے اخبارات اور بات چیت سے انگریزی کی استعداد پیدا کی۔ اسی زمانے میں انیلا سے ملاقات ہوئی اس سے بھی انگریزی پڑھی۔ انیلا نے اپنی کتاب کے لیے مواد حاصل کیا۔

دوسری شادی پہلی بیوی کی موجودگی میں ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ دوسری بیوی کا نام انیلا تھا۔ حفیظ نے اپنے قیام انگلستان کے دوران میں ایک انگریز خاتون انیلا سے انگریزی کی استعداد بڑھائی۔ انیلا سے حفیظ کی ملاقات انگلستان ہی میں ہوئی تھی۔ جو اردو سے ناواقف ہونے کے باوجود محض ان کے صوتی اعجاز سے مسحور حفیظ کی بحثیت شاعر مداح ہوگئی تھیں۔ شادی سے پہلے اس انگریز خاتون نے "Hafeez Poet Son of India" نامی کتاب لکھی۔ اس میں حفیظ کی سوانح حیات بیان کی گئی ہے۔ یہ شادی حفیظ کی پہلی بیوی کے ایماء پر ہوئی تھی اس امید میں کہ شاید ایک اولاد نرینہ ودیعت ہو لیکن اس سے بھی ایک بیٹی ہی ملی اور اس کے ساتھ حفیظ کی دونوں بیویوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ حفیظ صاحب کے دورۂ انگلستان کا حاصل صرف انیلا ہی نہ تھی بلکہ انہوں نے وہاں دو اہم نظمیں بھی لکھیں جنہوں نے ان کے سرمایہ شعر و سخن میں قابل قدر اور قابل ذکر اضافہ کیا۔ ایک نظم کا عنوان ہے "اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے" اس نظم میں انہوں نے اپنے ہم وطنوں کا جو انگلستان میں آ کر بس گئے تھے اور انگریزوں کی تہذیب و تمدن پر فریفتہ تھے بڑے انوکھے اور دلکش انداز سے اپنے وطن کی یاد دلائی۔ دوسری نظم میں انہوں نے انگلستان کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کیے۔ اس نظم کا عنوان ہے "افرنگ کی دنیا"۔ دونوں نظمیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ افرنگ کی دنیا میں تو حفیظ نے انگریزوں کو آئینہ دکھایا ہے۔ یہ دونوں نظمیں حفیظ کے تیسرے مجموعہ کلام تلخابہ شیریں میں شامل ہیں۔

۱۹۴۱ء میں سر اکبر حیدری کی ایما پر حفیظ نے حکومت ہند کو سمع و بصر جنگی پبلسٹی کا ایک منصوبہ پیش کیا جسے وزیر دفاع فیروز خان نون وائسرائے کے پاس لے گئے یہ منصوبہ انوکھا تھا جو منظور کر لیا گیا تھا۔ اس منصوبے کو چلانے کے لیے حفیظ ہی کو حکومت کا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک عہدہ پیش کیا گیا تھا۔ حفیظ سرکاری ملازمت کے خلاف تھے لیکن بہت بڑے بڑے مسلمان اہل الرائے جن میں شیخ سر عبدالقادر، سر اکبر حیدری، نواب محمد اسماعیل خان اور ہز ہائی نس بھوپال حمید اللہ خان بھی تھے۔ اس جنگ میں انگریزوں کی فتح اس لیے چاہتے تھے کہ اگر انگریز ہار گئے تو ہندوستان پر جاپان ہندوؤں کے ساتھ مل کر چھا جائے گا اور مسلمان پھر غلام رہیں گے۔ حفیظ ''نان پارٹی میں'' تھے لہٰذا انہوں نے حفیظ کو مشورہ دیا کہ وہ پبلسٹی پر قابض ہو جائیں چنانچہ پہلے وہ آرگنائزر، پھر ڈائریکٹر اور آخری دور ملازمت میں ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ جنگی پبلسٹی کے سلسلے میں ان کے لکھے ہوئے فوجی گانے اور گیت سادھوؤں اور فقیروں کے ذریعے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور ان کو شہریوں میں بے مثال مقبولیت حاصل ہوئی۔ سپاہیوں کے لیے بھی ولولہ انگیز گیت تھے۔ جیسے

ع میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے۔۔۔ سب گیتوں میں ہندوستان کی آزادی کی روح سموئی ہوئی تھی۔

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک دہلی میں بسلسلہ ملازمت مقیم رہے۔ اس دوران میں ہندوستان میں شاید ہی کوئی چھوٹا یا بڑا شہر بچا ہو جسے حفیظ نے نہ دیکھا۔ حفیظ جالندھری کو متعدد اعزازات و خطابات سے نوازا گیا۔ ابھی شہرت کا آغاز ہی تھا کہ ان کے استاد مولانا عبدالقادر گرامی نے ایک مشاعرے میں ان کے کلام سے متاثر ہو کر انہیں ابوالاثر کا خطاب دیا۔ جو ان کی کنیت کے طور پر ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ وہ حفیظ جالندھری سے ابوالاثر حفیظ جالندھری ہو گئے۔ ریاست کپورتھلہ کے ایک مشاعرے میں جو مولانا گرامی کی زیر صدارت منعقد ہوا جب حفیظ نے یہ دو شعر پڑھے تو مولانا گرامی نے خوش ہو کر فرمایا ''حفیظ! تم ابوالاثر ہو۔''

رزاق دو جہاں کے خزانے کو کیا ہوا
ملتا ہے رنج، وہ بھی کسی کا دیا ہوا

وہ ہوئے پردہ شکن، انجمن آرا ہو کر
رہ گیا میں ہمہ تن، چشم تمنا ہو کر

مولانا عبدالقادر گرامی نے نہ صرف انہیں ابوالاثر کہا بلکہ اصرار کے ساتھ فرمایا کہ تم اب ابوالاثر کی کنیت اپنے نام کے ساتھ لگالو۔ حفیظ کی خداداد شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ مبدائے فیض سے انہیں جو ترنم اور آواز کا جادو عطا ہوا تھا اس نے ان کے کلام کی تاثیر کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ اس لحاظ سے ابوالاثر کی کنیت ان پر خوب سجتی تھی۔

برطانوی حکومت نے انہیں پہلے ''خان صاحب'' اور پھر ''خان بہادر'' کے خطابات سے نوازا مگر یہ دونوں خطابات ۱۹۴۶ء میں تحریک پاکستان کے دوران انہوں نے انگریزی حکومت کو واپس کر دیے اور اپنے نام کے ساتھ کبھی خان بہادر نہیں لکھا۔

ریاست ٹونک نے انہیں ''ملک الشعرا'' کا خطاب عطا کیا اور اس سلسلے میں وائس رائے ہند کو چٹھی لکھ کر اس خطاب کا نوٹیفیکیشن جاری کرایا مگر حفیظ صاحب نے کبھی اپنے نام کے ساتھ ''ملک الشعرا'' نہیں لکھا۔

نظام حیدرآباد دکن والی ریاست حیدرآباد نے حفیظ جالندھری کو ''نواب احسان الملک بہادر'' کے خطاب سے نوازا۔ حفیظ جالندھری کی اصلاحی اور نعتیہ شاعری کے اعتراف میں ان کے لیے حسان الملک کا خطاب تجویز کیا گیا تھا۔ ہز ہائی نس نواب سر حمیداللہ خان والئی بھوپال نے شاہ نامہ اسلام کی گراں قدر تصنیف پر حفیظ کو فردوسی اسلام کا خطاب دیا۔

ع مبارک ہو تمہیں فردوسی اسلام ہو جانا

''تلخابہ شیریں'' ۱۹۴۷ء کے شروع میں یہ مجموعہ منظر عام پر آیا۔ اس میں غزلیات کے بعد ضرب الامثال اشعار کے علاوہ بہت سی کامیاب نظمیں اور گیت شامل ہیں۔ بعض مؤثر شخصی مرثیے بھی اس مجموعے کا سرمایہ ہیں۔

۱۹۴۷ء میں قائداعظم کے ایما پر شملہ میں مقیم تھے۔ وہاں سے ستمبر میں اپنے کنبے کی عورتوں سمیت ننگے سر، ننگے پاؤں سب کچھ لٹا کر لاہور پہنچے۔ شملہ میں حفیظ اور ان کے مربی سر عبدالقادر فائلوں میں گھر گئے تھے۔ ان کے بیٹے منظور قادر بیرسٹر اور الطاف قادر جو ان دنوں کرنل تھے طوفان ہلاکت میں پھنسے ہوئے حفیظ اور ان کے کنبے کو لاہور لائے۔ پاکستان کے صدر بھی انبالہ سے اس کانوائے کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ صدر ایوب سے حفیظ کی پہلی ملاقات اسی راہ میں ہوئی۔

تقسیم ہند کے فوراً بعد حفیظ نے جنگ کشمیر میں عملی حصہ لیا اور اس دوران زخمی بھی ہوئے۔ کشمیر کی جنگ سے متعلق شروع سے آخر تک کمیونک شائع کرتے رہے۔ آزاد کشمیر کی ریڈیو کی تنظیم کی۔ ۱۹۴۸ء میں مارچ میں کشمیر کی پبلسٹی کے سلسلے میں مشرقی پاکستان گئے اور وہاں موجودہ صدر پاکستان کے مہمان ہوئے جو ان دنوں میجر جنرل اور مشرقی بنگال کے G.O.C تھے۔

۱۹۴۸ء میں ہی پاکستان کی مسلح افواج کا شجاعانہ اسلامی اور سرفروشانہ معیار بلند کرنے کے لیے ڈائریکٹر آف موریل (مسلح افواج پاکستان) میں ۱۹۵۳ء تک پندرہ سو روپے ماہوار تنخواہ پر اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے تھے۔ وہ نیوی، ایئر فورس اور بری افواج کے نوجوانوں کے ہمیشہ قریب رہے اور ان کی ذہنی تربیت میں ہمیشہ نمایاں

حصہ لیا کرتے تھے۔

حفیظ کا اپنی انگریز بیوی کے ساتھ رشتہ ۱۹۵۲ء میں طلاق پر ختم ہوا۔ اس انگریز بیوی سے حفیظ کی ایک بیٹی ہے جس کی پرورش حفیظ کی دوسری بیٹیوں کے ساتھ ہی ہوئی اور لاہور کے ایک ہاشمی خاندان میں اس کا عقد ہو چکا ہے۔ یہ خاندان لندن میں کاروبار کرتا ہے۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء تک حفیظ کراچی میں مقیم رہے تھے۔

حفیظ نے پاکستان کا قومی ترانہ ہی نہیں لکھا بلکہ آزاد کشمیر کا قومی ترانہ بھی لکھا ہے۔ آج بھی فضائیں اس کے رس بھرے الفاظ سے گونج رہی ہیں۔

وطن ہمارا آزاد کشمیر

حفیظ نے اپنی غزلوں، نظموں، گیتوں اور دیگر شعری اصناف کے چار مجموعے شائع کیے۔ بچوں کی نظموں کے چار چھوٹے چھوٹے مجموعے بھی ان کی یادگار ہیں۔ شاہنامہ اسلام کی چار جلدیں مکمل کیں مگر چوتھی جلد اچانک ختم ہو جاتی ہے۔ بعد ازاں انہوں نے اس کی تکمیل کی طرف توجہ نہیں کی۔ بچوں کے لیے ایک کتاب ''ہندوستان ہمارا'' بھی لکھی اور قیام پاکستان کے بہت بعد ''بزم نہیں۔ رزم'' شائع ہوئی۔

حفیظ کی پہلی بیوی زینب کا ۱۹۵۴ء میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حفیظ کا تیسری شادی کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن ان کی مصروفیات ملّی اور گھریلو ذمہ داریوں کے علاوہ شاید بہنوں کے لیے ایک بھائی کی حسرت بھی تھی۔ گھر میں نا کتخدا لڑکیوں اور دو بیمار لڑکیوں کی اہم ترین ذمہ داری اور رات دن قومی جلسوں اور ہر مقام پر قومی شاعر کی طلب اسے پریشان کر رہی تھی۔ حسن اتفاق سے آپ کے کلام کی ایک قدردان خاتون نے جو حفیظ کی بیگم کا پرسہ دینے آئی تھیں رفتہ رفتہ حفیظ کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانے کا حوصلہ دے کر ۱۹۵۵ء میں حفیظ کی رفیقہ حیات بن گئیں۔ ان کے بطن سے بھی ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ حفیظ نے اس کا نام ''رضائے حفیظ'' رکھا۔ یہ بچی حفیظ کی ساتویں بیٹی تھی اور حفیظ اسے اپنی روح بھی کہتے تھے اور اپنی ساری زندگی کا آخری حرف گردانتے تھے۔ حفیظ کے ہاں اولاد نرینہ نہیں تھی۔ بیٹیاں ہی بیٹیاں تھیں کوئی کسی بیوی سے کوئی کسی بیوی سے۔ اس لیے سگی ماں والا پیار کم ہی کسی کو ملا۔ بدمزگی ہی بدمزگی رہی۔ ایک بیٹی تسنیم تو آخر پاگل ہو گئی تھی۔ حالانکہ اچھی خاصی شاعرہ تھی۔ تسنیم حفیظ کے نام سے مشاعروں میں شریک ہوتی تھی اپنا رنگ جما لیتی تھی۔ جس مشاعرے میں حفیظ جاتے تھے تسنیم نہ جاتی تھی۔ جس میں تسنیم پہنچ جاتی تھی حفیظ نہیں پہنچتے تھے۔ غرض ایک دوسرے کو آپس میں شکایتیں ہی شکایتیں تھیں۔ گھر کا سکون عنقا ہی عنقا تھا۔ گھر کے تمام افراد میں ایک دوسرے سے بیزاری ہی بیزاری تھی۔

۱۹۵۵ء میں دیہی امداد و ترقی کے مرکزی دفتر میں فیلڈ ڈائریکٹر آف پبلسٹی مقرر ہوئے اور ان کی نگرانی میں رسالہ ''پاک سرزمین'' جاری ہوا۔ اگرچہ حفیظ صحافت سے تادیر وابستہ نہ رہ سکے لیکن چند سال اخبارات و جرائد میں کام کرنا ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوا تھا۔ شہرت ملی، شاعری کو پذیرائی حاصل ہوئی اور بہت سے اہم لوگوں سے تعلقات قائم

ہوئے۔

۱۹۵۸ء میں پاکستان کے وفد کے لیڈر کی حیثیت سے افریشیائی رائٹرز کانفرنس میں شمولیت کے لیے تاشقند گئے۔ کانفرنس کے بعد طفلس اور کوہ قاف کی سیر کی۔ ماسکو بھی گئے سائبیریا کا علاقہ بھی دیکھا۔ اسٹالن آباد میں فارسی کے اولین شاعر رودکی کی گیارہ سو سالہ برسی کی تقریب میں بھی شامل ہوئے۔ وہاں سے سمرقند اور اشک آباد گئے۔ واپسی میں کابل اور قندھار کا سفر بھی کیا۔

حفیظ نے سفر نامہ ''حفیظ۔ تاشقند میں'' کے نام سے لکھا۔ حفیظ ۱۹۵۸ء میں افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کے لیے روس گئے تھے جہاں انہیں روس کے متعدد دیگر شہروں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ پندرہ سال بعد یہ سفر نامہ چند قسطوں میں سیارہ ڈائجسٹ میں شائع ہوا لیکن کتابی شکل میں کبھی نہیں چھپا۔

''چراغ سحر'' ۱۹۷۳ء میں منظر عام پر آئی۔ اس مجموعے میں کچھ کلام آزادی سے پہلے کا مگر بیشتر بعد کا ہے۔ غزلیں بہت اچھی ہیں۔ نظموں میں متعدد تجربات ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد کے حالات کی عکاسی اکثر تخلیقات میں موجود ہے۔ پاکستان کا قومی ترانہ، نامنظور کردہ ترانہ اور آزاد کشمیر کا ترانہ بھی اس مجموعے میں شامل ہے۔

''بزم نہیں۔ رزم'' ۱۹۷۳ء میں منظر عام پر آئی۔ اس مجموعے کی بیشتر نظمیں کشمیر کی جدوجہد آزادی پر مبنی ہیں۔ ان میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو قبل ازیں ان کے بعض دوسرے مجموعوں میں آچکی ہیں۔

پیدل چلتے ہوئے کسی دکان پر کوئی سائن بورڈ لکھا نظر آجاتا تو اس کو پڑھے بلکہ گائے بغیر قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ اور پیدل چلتے وقت ان کی سب سے زیادہ توجہ چیونٹیوں کی طرف رہتی تھی۔ حفیظ نے چیونٹی نامہ لکھ کر نثر کے میدان میں اپنا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ اس کتاب کو لکھ کر حفیظ نے زبان اور انسان دونوں کی خدمت کی ہے۔ چیونٹیوں کے معاشرے کی تصویر، ایسے دلکش اور مؤثر انداز میں کھینچی ہے کہ اس میں انسانوں کے لیے ایسی بہت سی عبرتیں سمٹ آئی ہیں کہ بے اختیار چیونٹی کے نقش قدم پر چلنے کو جی چاہتا ہے۔

''چیونٹی نامہ'' ۱۹۷۳ء میں مشاہدے اور علم حیاتیات کی مدد سے بتایا گیا ہے کہ چیونٹیوں کی سوسائٹی کس طرح کام کرتی ہے اور چیونٹیاں پیدائش سے موت تک کن مراحل سے گزرتی ہیں۔

حفیظ کے ''معیاری افسانے'' اٹھارہ افسانوں پر مشتمل مختلف زبانوں کے مشہور افسانوں کا اخذ و انتخاب ہے۔ کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے یہ افسانے مخزن میں شائع ہوئے تھے۔ ''نثرانے'' ۱۹۷۶ء میں انشائیوں اور تاثراتی تحریروں پر مشتمل مجموعہ ہے۔

حفیظ نے طلسم ہوش ربا اور الف لیلہ سے بعض کہانیاں اخذ کر کے آسان اردو میں بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ عمرو عیار، شہزادہ صنم اور جنوں کا بادشاہ ۱۹۸۲ء، شہزادہ خداداد اور شہزادی دریاباد ۱۹۸۲ء اور بدر شہزادہ۔ جواہر شہزادی ۱۹۸۲ء لکھی ہیں۔

شاعری کے علاوہ پیدل چلنا اور ہانڈی ریندھنا ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ نہ وہ دوسروں کا شعر آسانی سے پسند کرتے ہیں نہ دوسروں کی ہانڈی کو، گھر میں اپنا کمرہ اور اپنی ہانڈی الگ رکھتے تھے۔ ان کا کمرہ دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ

آگ ہے، ہانڈی ہے، چولھا ہے دھواں ہے زندگی

حفیظ کے خطوط بھی نثری سرمائے کی ذیل میں آتے ہیں۔ اس طرح ان کے دیباچے اور انٹرویوز بھی موجود ہیں۔ ''جنگ'' کراچی میں کچھ عرصہ وہ کالم بھی لکھتے رہے۔ ان متفرق نثری تحریروں کا یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے ''دیوان حالی'' کا انتخاب مع مقدمہ بھی شائع کرایا ہے۔

حفیظ کی بنیادی حیثیت شاعر کی ہے لیکن ادبی صحافت سے وابستہ رہنے کی وجہ سے انہیں نثر میں طبع آزمائی کرنی پڑی۔ میرا موضوع تحقیق حفیظ کی نثر ہے۔ حفیظ ہماری ان چند اہم شخصیتوں میں سے ہیں جو زندگی کے ایک پورے دور کی دھڑکن اور علامت بن جاتی ہیں۔ حفیظ کے شاعرانہ مقام اور مرتبے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ان کی نثری تحریروں پر خال خال قلم اٹھایا گیا ہے۔ نثری کاوشیں ہمارا موضوع ہیں مختصر احوال کے بعد آئندہ کے صفحات پر حفیظ کی نثری کاوشوں پر تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالیں گے۔

حفیظ عمر کے آخری چند برسوں میں بہت کمزور ہو گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۸۲ء میں طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی تھی۔ سروسز ہسپتال لاہور میں زیر علاج رہے جہاں ۲۱ دسمبر کو وفات پائی۔ پہلے ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں امانتاً دفن ہوئے۔ بعد میں مینار پاکستان کے زیر سایہ آسودہ خاک ہوئے۔

حوالہ جات

۱۔ طاہر تونسوی، (مرتبہ) "حیات اقبال" مشمولہ، مرزا منور، "ابوالاثر اقبال کے حضور میں" اقبال اکادمی، لاہور، س ن، ص ۲۵۸

۲۔ ایضاً ص ۲۶۰

۳۔ ایضاً ص ۲۶۳

۴۔ ایضاً ص ۲۶۳

۵۔ حفیظ جالندھری، ''شاہنامہ اسلام''، جلد اول، مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار لاہور، س ن، ص ۷۸

۶۔ سید ضمیر جعفری، ''کتابی چہرے''، مکتبہ المختار، راولپنڈی، س ن، ص ۴۵

۷۔ جمیل یوسف، ''حفیظ جالندھری''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء

۸۔ صہبا لکھنوی (مرتبہ)، ''افکار''، حفیظ نمبر، مکتبہ افکار، رابسن روڈ، کراچی، ۱۹۶۳ء

۹۔ سیدہ ناصرہ، ''حفیظ، فن اور شخصیت''، نیاز دانہ پبلی کیشنز، ۱۶ ابی ٹیمپل روڈ، لاہور، ۲۰۱۰ء

۱۰۔ خواجہ محمد زکریا (مرتب)، ''کلیات حفیظ جالندھری''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء

۱۱۔ عزیز ملک، (تالیف)، ''حفیظ جالندھری (شخصیت اور فن)''، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء

۱۲۔ جمیل یوسف، ''باتیں، کچھ ادبی، کچھ بے ادبی کی''، منظور عام پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۱۰ء

باب دوم:

حفیظ جالندھری کی طبع زاد افسانوی نثر

(۱) طبع زاد افسانے

(۲) افسانوں کی تدوین

(۱) طبع زاد افسانے

ادب اردو میں حفیظ صاحب کو بحیثیت شاعر بہت شہرت اور ناموری حاصل ہے۔ حفیظ نے اپنے مختصر افسانے کتنے ہی چاؤ سے لکھے ہوں اور مختصر افسانہ سے دلچسپی رکھنے والے گنتی کے چند لوگ ان کو کتنا ہی پسند کرتے ہوں ان کے افسانوں کو اب وہ داد نہیں ملتی جس کے وہ حقیقت میں مستحق ہیں۔

حفیظ جالندھری نے اردو نثر میں سات طبع زاد افسانے 'ہفت پیکر'' کے عنوان سے لکھے تھے۔ میرے پیش نظر 'ہفت پیکر'' کے دو ایڈیشن موجود ہیں۔ دونوں کے سرورق ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ 'ہفت پیکر'' کا زیر نظر مجموعے کے سرورق پر انتساب ''سید سجاد حیدر یلدرم کے نام ان کی اجازت کے بغیر'' دیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۴۰ء میں ہوئی اور یہ افسانے مجلس اردو لاہور سے شائع ہوئے ہیں۔

ہفت پیکر کے دوسرے مجموعے پر سال اشاعت درج نہیں ہے لیکن اس کے آغاز میں حفیظ صاحب کی ایک مختصر تحریر ''گھروندے'' کے نام سے شائع کی گئی ہے۔ اس مجموعے کے سرورق میں انتساب کے بعد ایک شعر کا اضافہ ہے۔ اس مجموعے کا سرورق اس لحاظ سے بھی مختلف ہے کہ یہاں ٹائٹل صفحے پر یہ شعر درج ہے کہ

بے حقیقت سا دل جو ٹوٹ گیا
بن گئے بے شمار افسانے

'ہفت پیکر'' ابوالاثر حفیظ جالندھری کے عہد جوانی میں لکھے ہوئے افسانوں کا مجموعہ ہے اس مجموعے کا دیباچہ سید امتیاز علی تاج نے لکھا ہے

(اس اشاعت میں اہل قلم کے لیے حفیظ کی اسی دور کی ایک اہم تحریر بھی شامل ہے ہفت پیکر کا یہ مجموعہ ''مجلس اردو، کتاب خانہ حفیظ، اردو بازار لاہور'' سے شائع ہوا تھا اس کے علاوہ اس ایڈیشن کی یہ بات بھی اہم ہے کہ اس میں انتساب کے بعد اس شعر کا اضافہ بھی ہے۔

محشر کا تماشا ہے اک نقل جوانی کی
گزرا ہوا ہنگامہ بھولا ہوا افسانہ

پہلی تحریر جو اس ایڈیشن میں شائع کی گئی ہے وہ حفیظ صاحب کی تحریر ''گھروندے'' ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ بچے گھروندے بناتے ہیں اور کھیلتے ہیں اس طرح ایک قلم کار کی تحریر بھی ایک گھروندہ ہے۔ جس کو بنا کر وہ اس سے کھیلتا رہتا ہے اس طرح ان کے طبع زاد افسانے ان کے نزدیک ان کے گھروندے ہیں۔ اس تحریر کے آخر میں ۳۰ جون ۱۹۵۹ء کی

تاریخ درج ہے۔

اگلی تحریر ''یہ افسانے'' کے نام سے حفیظ صاحب کے بھتیجے علاؤالدین مظہر نے لکھی ہے جس میں یہ درج کیا گیا ہے کہ ''ہفت پیکر'' حفیظ صاحب کے سات طبع زاد افسانوں کا مجموعہ ہے۔ طبع زاد افسانوں کی اولیت کا سہرا قریب قریب حفیظ صاحب کے سر جاتا ہے۔

''اہل قلم سے'' کے عنوان سے حفیظ صاحب کی یہ تحریر رسالہ ''مخزن'' دسمبر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں حفیظ صاحب نے اہل قلم کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کا لکھا گیا ایک ایک لفظ رہتی دنیا تک باقی رہے گا اور انہیں اپنی تحریروں کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لفظوں کا انتخاب کرنا چاہیے۔ کیونکہ خراب لفظ یا تحریریں کبھی ختم نہیں ہوتیں بلکہ ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے اچھے لفظ اور اچھے خیالات ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ بری مثالیں اور برے الفاظ معاشرے کے لیے بھی زہر قاتل ثابت ہوتے ہیں اور پھر اس طرح یہ ورثہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ جس کا نتیجہ آنے والی نسلوں کی تباہی کی صورت میں رونما ہوتا ہے کیونکہ ایک قلم کار مر جاتا ہے مگر اس کے قلم سے نکلنے والی تحریر ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

حفیظ کے خیال میں اس دور میں ترقی پسندی کی آڑ میں مخرب الاخلاق اور ادب شائع کیا جا رہا ہے۔ جو کہ نوجوان نسل کی تباہی کا سبب بن رہا ہے۔ اسی طرح سے آرٹ بھی بچوں کے اخلاق کو تباہ کرنے کا اہم ذریعہ بن رہا ہے۔ حفیظ نے اس کی مثال اس بات سے پیش کی کہ آج کل کے افسانے پڑھ کر نوجوان خود بھی ان کے ہیرو بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ کسی شریف خاندان کی عزت پر ڈاکہ ڈالنا نکلتا ہے اور نوجوانوں کو ہیجان انگیز ادب پیش کر کے ان کے جذبات بھڑکائے جاتے ہیں۔ ایسے مصنف جو ایسا گندہ ادب پیش کرتے ہیں۔ وہ دراصل اپنے گندے ذہن سے تمام معاشرے کو بدبودار بنا دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے تمام معاشرہ بدبودار ہو جاتا ہے اس کے بجائے اچھا اور صحت مند ادب پیدا کرنے والے مصنف ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور ان کا اخلاق بھی ہمیشہ اعلیٰ اور عمدہ رہتا ہے۔ آخر میں حفیظ صاحب نئے قلم کار احباب سے کہتے ہیں کہ ایسا ادب جو کہ فحاشی اور عریانی پر مبنی ہو اس کو بند ہونا چاہیے۔ ورنہ یہ ادب قوم کی تباہی کا سبب بنتا ہے اور آنے والی نسلیں اس دور پر لعنت کریں گی جس دور میں ایسا ادب تخلیق ہوگا۔

مصنف اور ڈاکو:

یہ حفیظ صاحب کی ایک ایسی کہانی ہے جہاں عالم ارواح میں قاضی کے ساتھ دو مجرم پیش ہوئے۔ ان میں سے ایک ہلاکو ڈاکو اور دوسرا ایک مصنف تھا۔ قاضی نے فوراً فیصلہ سنا دیا کہ دونوں کو ایک ایک دیگ میں ڈال کر نیچے آگ جلا دی جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکو کی دیگ کے نیچے آگ کے شعلے بلند ہوئے اور وہ چیختا رہ گیا اس کی سزا

بہت سخت معلوم ہوتی تھی اوراس کے مقابلے میں مصنف کی سزا بہت کم معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ یہ بہت آہستہ آہستہ سلگتی آگ تھی مگر صدیاں گزر گئیں ڈاکو کی سزا بہت جلد ختم ہوگئی لیکن مصنف کی سزا ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے خدا سے شکوہ کیا کہ اس کی سزا ختم کیوں نہیں ہورہی تو ایک فرشتہ سامنے آیا اوراس نے کہا کہ یہ سزا اس لیے ختم نہیں ہورہی کیونکہ تم نے دنیا میں جو برا اخلاق پھیلایا اس کی تباہ کاریاں صدیوں سے نسل در نسل منتقل ہورہی ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی سزا ختم نہیں ہو رہی کیونکہ مصنف نے اپنے دور میں جس آزادی کی بات کی تھی وہ یہ آزادی تھی جس میں مصنف نے لوگوں کو خدا سے برگشتہ کیا۔ انہیں پیار کے نام پر ہوس سکھائی اور ان کے اخلاق کو تباہ کیا۔ جس کا نتیجہ آنے والی نسلوں کی تباہی ہے۔ فرشتے نے مصنف کو برا بھلا کہا اوراس کی دیگ کا ڈھکن بند کر دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی سزا قیامت تک قائم رہے گی۔ کیوں کہ اس کی تصنیفات قیامت تک لوگوں کو گمراہ کرتی رہیں گی۔

ہفت پیکر کے زیرِنظر مجموعے میں ''سہاگ کی رات'' ''ہوشیار دیوانہ''، ''خودکشی'' ''آوارگی''، ''ملمع''، ''حیات تازہ''، افسانہ در افسانہ'' سات افسانے ہیں۔ ہر افسانہ اپنی الگ پہچان اور حیثیت رکھتا ہے اور ہر افسانے میں حفیظ نے واقعات کو نہایت ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ ہفت پیکر کے تمام افسانوں میں معاشرتی پہلو نظر آتا ہے۔ تمام افسانوں میں معاشرے کی مختلف تصویریں جھلکتی نظر آتی ہیں۔ یہاں ان افسانوں کا مختصرا جائزہ لیتے ہیں۔

افسانہ ''سہاگ کی رات'' ایک کردار کی زبانی بیان ہوا ہے اور کسی کردار کا نام نہیں بیان ہوا اور افسانے کی تمہید سے پہلے سرورق پر مصنف نے یہ جملہ لکھا۔

''میری پلکوں پر غنودگی کا ہلکا سا بوجھ تھا'' ۱

اس افسانے "سہاگ کی رات" میں حفیظ نے کہیں کہیں شاعرانہ انداز بیان اختیار کیا ہے۔ مثال کے طور پر

'' میرے دل میں مسرت کے سمندر موجیں مار رہے تھے میں صحرائے ہستی میں ایک خوش نصیب مسافر کی طرح ریگستان کی جلتی دھوپ سے نکل کر ایک ایسے گلزار پر بہار میں جا رہا تھا جہاں طرح طرح کے سایہ دار درخت میووں سے لدے کھڑے تھے جہاں سرد پانی کے مصفا چشموں کے کنارے رنگین اور معطر جھاڑیوں میں خوش الحان پرند مبارک باد کے نعرے الاپ رہے ہے''۔۲

اس افسانے "سہاگ کی رات" میں سادہ اور سلیس اسلوب بیان بھی دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر

''میں دیوانہ وار ریل کی پٹری کے کنارے کنارے بھاگ رہا تھا اور آنکھیں پھاڑ
پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ خاردار جھاڑیوں میں میرا لباس الجھ الجھ
جاتا تھا۔ لیکن میں دوڑتا رہا، دوڑتا رہا۔ بے تحاشا دوڑتا رہا۔''۳

افسانہ ریل کے سفر سے شروع ہوتا ہے جہاں ایک نو بیاہتا جوڑا دولہے کے والدین کے ساتھ محو سفر ہے اور افسانہ اسی دولہے کی زبانی بیان کیا گیا ہے وہ ''سہاگ رات'' کے بارے میں بہت پر جوش اور پر امید ہے۔ اس نے اس سہانی رات کے حوالے سے بہت سے رومانی تصورات باندھ رکھے ہیں جب وہ سفر میں ہوتا ہے تو اچانک اسے لگتا ہے کہ اس کے علاوہ باقی تینوں افراد جو سو رہے ہیں ان پر ڈاکو حملہ آور ہو چکے ہیں اور اس کی نئی نویلی دُلہن کے زیورات اتار رہے ہیں اس کو یہ دیکھ کر بہت غصہ آتا ہے اور وہ ان حملہ آور ڈاکوؤں سے لڑنا شروع کر دیتا ہے لیکن اس سارے واقعہ کے دوران اس کا باپ سویا رہتا ہے۔

وہ کسی بھی آہٹ پر نہیں جاگتا حتیٰ کہ اس کی ماں اور وہ دلہن بھی جس کا زیور ڈاکو اتار رہے ہیں کسی قسم کے مزاحمتی رویے کو ظاہر نہیں کرتیں بلکہ کہانی بیان کرنے والے کے بقول وہ سوئی رہتی ہے اور جب وہ اپنی غیرت کے تابع ہو کر ڈاکوؤں پر حملہ کرتا ہے۔ تو اچانک ایک ڈاکو اس کی بیوی کو اٹھا کر ریل گاڑی سے باہر پھینک دیتا ہے اور وہ اپنی بیوی کو بچانے کے لیے ریل گاڑی سے چھلانگ لگا دیتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو جنگل میں وحشتناک اور خوفناک آوازوں اور منظروں سے نکال کر ایک ویران ریلوے اسٹیشن پر لاتا ہے۔ جہاں اس کی بیوی ایک مرتبہ پھر اس کے سوئے ہوئے ارمانوں کو جگاتی ہے اور وہ خوش کن تصوراتی لمحات سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے کہ اچانک بجلی کے گرنے سے اس کی بیوی مر جاتی ہے۔ وہ اس ایسے پر ساکت رہ جاتا ہے کہ اچانک کہیں سے ایک اسٹیشن ماسٹر اور دولڑ کے مجھے جھنجھوڑ کر حال کی دنیا میں لے آئے اور کہا کہ تمہیں پولیس کے حوالے کرتا ہے اور تمہاری بیوی گناہگار عورت تھی اس لیے بجلی نے صرف اُسے جلا کر خاکستر کیا ہے اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے یہ میری بیوی ہے تو وہ اسے چور، ڈاکو سمجھ کر کہتے ہیں کہ تم نے اسے عورت کا زیور چرایا ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے کہ ان برے حالات میں اب کون میرا ساتھ دے گا۔ کیونکہ دنیا تو اب میری سچائی پر یقین نہیں کر رہی ہے تو وہ ٹرین کے نیچے آ کر اپنی جان دے دیتا ہے۔

اچانک اس کے والد نے اس کا کندھا ہلا کر کہا کہ ہمارا اسٹیشن آ گیا میں جاگ گیا تو پتا چلا کہ یہ ایک بھیانک خواب تھا اور ہر چیز میری دلہن سمیت سلامت تھی۔

اس افسانے سے پتا چلتا ہے کہ انسان کو خوشی اور غم کے ہر پہلو پر نظر رکھنا چاہیے اور یہ بھی کہ انسان اپنے تحت الشعور کے باعث جو سوچتا ہے وہ اس کے لاشعور میں جمع ہو کر خوابوں کی صورت میں رونما ہوتا ہے اور انسان کبھی بھی کسی بھی قسم کے

مختلف حالات سے دوچار ہوسکتا ہے اور بعض اوقات حالات کی وجہ سے دوسرے لوگ آپ کی سچائی کا اعتبار نہیں کرتے اور دنیا مرنے والے پر بھی ہر طرح کی بہتان طرازی کرتی ہے۔

دوسرا افسانہ "ہوشیار دیوانہ" ہے۔اس افسانے کے آغاز میں یہ جملہ رقم ہے: "میں یادِ ماضی کے خونیں سیلاب میں بہتا پھرتا ہوں" ۴

اس ایک فقرے میں پورے افسانے کی کہانی بیان کردی گئی ہے۔ یہاں بھی افسانہ بیان کرنے والا کردار اپنی زبانی کہانی بیان کر رہا ہے اور پورے افسانے کے دوران کسی کردار کا نام سامنے نہیں آتا حفیظ نے اس افسانے "ہوشیار دیوانہ" میں سادہ اور دلکش انداز بیان اپنایا ہے۔مثال کے طور پر

> "میں بہت زیادہ محتاج نہیں ہوں ۔میرے پاس ایک رقم موجود ہے جسے میں آہستہ آہستہ خرچ کرتا ہوں۔میرا ایک مکان بھی ہے۔اگرچہ میں مدت سے وہاں نہیں گیا کیونکہ وہاں ایک بڈھا آدمی جو میرا باپ ہے۔مجھے محبت سے آغوش میں لینے اور آنسو بہانے کے لیے آمادہ نظر آیا ہے میں اس کی کمزور اور حسرت بھری نگاہوں سے بچتا ہوں۔گریز کرتا ہوں۔" ۵

اس افسانے میں ایک دیوانے کی کہانی ہے جو اپنے دیوانے پن کی کہانی خود ہی بیان کر رہا ہے۔ کہ اس سے ایک گناہ سرزد ہوگیا ہے جس سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ خود پر دیوانگی طاری کر لیتا ہے اور جنون اور وحشت کو اپنے اوپر مسلط کر لیتا ہے۔ یہ جنون اور وحشت اسے دنیا کی نظروں میں دیوانہ بنا دیتی ہے وہ اپنی کہانی کے دوران بتاتا ہے کہ اب وہ ایک پرانے بستر میں کسی نانبائی یا تنور یا کسی بارونق جگہوں کا انتخاب کرتا ہے جہاں اس کا گناہ اس کا پیچھا نہ کر سکے اور وہ ماضی کی اس بھیانک بازگشت سے جان چھڑا سکے مگر اکثر راتوں کو اس کا پاگل پن اس کے کسی کام نہیں آتا اور وہ مسلسل اپنے احساس گناہ سے شرمندہ ہوتا رہتا ہے مگر پھر اس کو خیال آتا ہے کہ اس نے یہ سب اپنی آبرو اور عزت کے لیے کیا جو لوگ شہر میں اس کے جاننے والے ہیں ان کے نزدیک اس کے پاگل پن کی بڑی وجہ اس کے جوان بھائی کی اچانک حادثاتی موت ہے اور بعض کے نزدیک اس کی وجہ اس نوجوان کی حسین بیوی کا گم ہوجانا ہے۔ وہ لوگوں کے ان قیاسوں پر دل میں ہنستا ہے اور سوچتا ہے کہ بھائی کی موت کسی کے لیے ایک گھاس کے تنکے برابر ہے اور بیوی کے گم ہو جانے پر پتا نہیں کون مخبوط الحواس ہوتا ہوگا۔ پھر وہ ماضی میں پہنچ جاتا ہے جہاں اس نے محض ایک شک کی بنا پر کہ اس کا بھائی اس کی حسین وجمیل اور خوبرو بیوی پر عاشق ہے۔اس کا قتل کر دیتا ہے اور اس افسوس ناک سانحے پر دھاڑیں مار مار کر روتا ہے اور ڈاکٹر اس کو حرکت قلب بند ہو جانے کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں جبکہ اپنی بیوی کو وہ ایک ایسی شام جب اس کا باپ شہر کے باہر گیا ہوتا ہے اور نوکر چھٹی پر گیا

ہوتا ہے تو وہ اسے گھمانے پھرانے کے لیے دریا کے قریب لے جاتا ہے اور وہاں وحشتناک طریقے سے اس کا خون کر دیتا ہے۔ جب وہ اس کا خون کرتا ہے تو وہ عورت اس کو واسطے دیتی ہے کہ وہ حاملہ ہے اور اس کے پیٹ میں ایک بچہ بھی ہے مگر وہ اس کی کسی التجا پر غور نہیں کرتا اور نہ ہی رحم کھاتا ہے اور وہ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے دریا میں پھینک دیتا ہے اور تمام خون آلود مٹی اور خون آلود کپڑے پھاڑ کر دریا میں پھینک دیتا ہے تاکہ اس کے اوپر کوئی شبہ نہ کر سکے اس کے بعد وہ اپنی بیوی کی اچانک گمشدگی کا ڈھونگ رچاتا ہے اور اپنے باپ کے ساتھ مل کر اسے تلاش کرتا ہے لیکن جب وہ اپنے کمرے میں آتا ہے تو اسے بیوی کی روح ایک معصوم بچے کے ساتھ دکھائی دیتی ہے تو پھر اسے اپنے گناہ کی شدت کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنے اوپر یہ مصنوعی دیوانگی طاری کر لیتا ہے۔ ایک دفعہ اس کا باپ زبردستی سے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آتا ہے۔ تو وہ ہر چیز کی توڑ پھوڑ کر کے خود کو دیوانہ ظاہر کرتا ہے، کیوں کہ باپ کی غمزدہ حالت اس سے دیکھی نہیں جاتی اور وہ خود کو پریشانی سے اور موت سے بچانا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کو بھیانک سزا ملنے والی ہے اس لیے وہ مرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی پھر وہ دوبارہ کبھی اپنے باپ کے سامنے جاتا ہے۔

افسانہ اپنے عنوان ''ہوشیار دیوانہ'' کے موضوع سے عین مشابہ ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار اپنے اوپر اتنی ہوشیاری سے دیوانگی طاری کرتا ہے کہ کسی کو اس پر ذرا بھی شک و شبہ نہیں ہوتا۔ تین انسانوں کا خون کر کے بھی وہ اپنے حواس بحال رکھتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دنیا کے سامنے دیوانہ ظاہر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ یقیناً ''ہوشیار دیوانہ'' ہی ہے۔

ہفت پیکر میں موجود تیسرا افسانہ ''خودکشی'' ہے۔ افسانے کے عنوان سے پہلے یہ عبارت درج تھی۔

''وہ تھک گیا اور ایک ٹھنڈا سانس اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے نکل گیا''[۶]

حفیظ کے افسانے ''خودکشی'' کا افسانوی اسلوب ہے۔ مثال کے طور پر

> ''ماں نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ میں برتن میں پانی لے آیا اور اس کے رخساروں سے خون کے دھبے دھوئے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے دو تین گھونٹ پی لیے پہلے تھکی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر اٹھی اور آہستہ آہستہ تیسری منزل کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی کسی نے میرے دل سے پوچھا۔ اوپر کیا ہے؟''[۷]

افسانہ ایک گیارہ سال کے بچے کی زبانی بیان ہوا ہے۔ اس کا سوتیلا بھائی مجید جو کہ اس کے چچا کا بیٹا بھی ہے اپنی محبت کی خاطر خودکشی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی ماں اس کو بچانے کے لیے ہر طرح کی تگ و دو کرتی ہے وہ بچہ حکیم کو بلانے خود جاتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں اس کا باپ انتہائی سنگ دل اور شقی القلب ہے جو اس مرتے ہوئے شخص کے

بارے میں کچھ نہیں سوچتا اور اپنے بیٹے کو سیڑھیوں سے چھت کی جانب جانے سے منع کرتا ہے اور پھر اس کی ماں کو کہتا ہے کہ یہ سب مجید کا ڈھونگ ہے۔آخر کب مرے گا وہ اور یہ کہہ کر گھر سے نکل جاتا ہے۔وہ بچہ اپنی ماں کے ہمراہ چھت پر جاتا ہے تاکہ اپنے مرتے ہوئے بھائی کو دیکھ سکے جو اس وقت تڑپ رہا ہوتا ہے۔اس سے اپنے بھائی کی یہ بے چینی دیکھی نہیں جاتی اور وہ حکیم کو بلانے جاتا ہے اس کو اپنی ماں کی مفلسی پر رحم آتا ہے کیوں کہ اس کی ماں کے پاس حکیم کو دینے کے لیے پیسے نہیں ہوتے اس کی ماں اپنے کانوں کی بالی اتار کر حکیم کو دیتی ہے کہ وہ اس کے بیٹے کو بچالے اور وہ اس کو کچھ سفوف دے جاتا ہے کہ گھول کر مجید کو پلا دے وہ ایسا ہی کرتی ہے اور اپنے بیٹے کے اٹھنے کے انتظار میں ہے جب حکیم چھت کی سیڑھیوں سے نیچے آتا ہے تو گھر کے باقی ماندہ افراد سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہیں کہ آیا واقعی اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے یا پھر یہ ڈھونگ ہے؟ اس کا باپ اور دادا یہ سن کر حیران رہ جاتے ہیں کہ اس نے زہر کھالیا ہے وہ اس کا احوال پوچھنے اس کے کمرے میں آتے ہیں تو اس کا باپ بہت تاسف کا اظہار کرتا ہے کہ اس نے مجید کو غلط سمجھا جبکہ دوسری جانب جب وہ بچہ حکیم کو بلانے جارہا ہوتا ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے کہ یہ بات تو کسی کو بھی نہیں معلوم پھر اس کو کیسے معلوم ہے تو وہ اپنا نام عزیزہ بتا کر اس بچے کو کہتی ہے۔کہ تمہارے بھائی نے زہر کھالیا ہے اسے بچالینا اور کہا کہ ''جیسا وہ چاہتا ہے میں ویسا کرنے کو تیار ہوں'' اور وہ واپسی پر جب حکیم وہاں سے گزرتا ہے تو وہ ان کو دس روپے کا نوٹ بھی پیش کرتی ہے تاکہ وہ اس کی جان بچا سکیں۔بچہ اس عزیزہ کی پہیلی کو سمجھنے میں ناکام رہتا ہے کہ اس کا مجید بھائی سے کیا رشتہ ہے؟ اور جب وہ سب سے چھپا کر حکیم کو اپنی ماں کی بالی پیش کرتا ہے تو اس کا ایک سوتیلا بھائی اس بالی کو چھین لیتا ہے کہ اب اس پر ہمارا حق ہے۔

دوسرے کرداروں میں اس بچے کی سوتیلی ماں اور سوتیلی بہن جو کہ مجید کی بیوی بھی ہے کو صرف طنز سے ہنستا ہوا دکھایا گیا ہے اور ان کا زیادہ کردار پیش نہیں کیا گیا۔بچہ آخری وقت جب مجید بھائی کے پاس آتا ہے تو وہ اکیلے ہوتے ہیں وہ ان کے کان میں یہ بات کہتا ہے کہ عزیزہ آپ کی بات ماننے کو تیار ہے تب مجید بھائی کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آتی ہے اور کچھ منٹوں کے بعد ان کی روح اس خاکی جسم سے پرواز کر جاتی ہے۔

اس افسانے میں کرداروں کی بے چینی اور محبت کی عدم تکمیل کی صورت میں خودکشی کے بھیانک نتائج سامنے لاتے ہوئے دکھائے گئے ہیں اور روپیہ پیسہ حرص و ہوس کے موضوعات بھی نظر آتے ہیں۔اس افسانے میں ایک عورت کی بے بسی بھی دکھائی گئی ہے ہے کہ کس طرح ایک عورت ماں ہونے کے ناطے بے بس اور مجبور ہے۔

ہفت پیکر میں موجودہ چوتھا افسانہ " آوارگی " ہے۔افسانے کے شروع میں یہ جملہ درج ہے۔

''مجھے ایسا معلوم ہوا کہ سینے کے نہانخانے میں کوئی جوان عورت میری دلیل کے بودے پن پر مسکرا رہی ہے۔"۸

حفیظ کے افسانہ'' آوارگی'' کا اسلوب بیان سادہ اور سلیس ہے۔مثال کے طور پر

''آج مجھے گھر سے نکلے پورے اکیس دن ہو چکے تھے وہ گھر جسمیں میں نے اپنی زندگی کے تیئس سال خوشی اور ہر طرح کی بے پروائی میں بسر کئے تھے۔اب صرف ایک دھندلا سا خیال بن کر باقی تھا۔سیاہ بادل اسے گھیرے ہوئے تھے اور اس پر حسرت کے آنسو بہا رہے تھے۔ "میں نے گھر کو چھوڑ دیا" یہ الفاظ میرے کانوں میں کوئی آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔میں نے لیٹے لیٹے ایک گہرا سانس لیا اور کوشش کی کہ ماضی کی ناگوار یاد میرے حافظے سے محو ہو جائے۔''۹

افسانہ'' آوارگی'' کی کہانی بھی ایک فرد کی زبانی بیان کی گئی ہے۔افسانے کا مرکزی کردار افسانے کے شروع میں بازار میں چہل پہل کرتا دکھائی دیتا ہے اور اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لیے وہ رات دیر تک بازاروں میں چلتا پھرتا رہتا ہے۔ کیوں کہ جس مکان میں وہ مقیم تھا وہ اس قدر رختہ حال تھا کہ وہاں کسی انسان کا گزارا نہیں ہوسکتا تھا۔اس لیے وہ اس گھر کی تنہائی سے بچنے کے لیے اور یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے اور ایک رات وہ کمرے میں لیٹے لیٹے سوچتا ہے کہ آج اسے گھر سے نکلے ہوئے اکیس دن گزر چکے ہیں اور یہ بھی خیال کرتا ہے کہ اس کا گھر وہ جگہ تھی جہاں اس نے اپنی زندگی کے ۲۳ سال گزارے وہ سوچتا ہے کہ اس کے بوڑھے باپ نے اپنا سب کچھ اس کے لیے لٹا دیا۔ اس کی ضعیف ماں اس کا راستہ دیکھتی رہتی ہے۔اور غمزدہ ہے۔وہ کوشش کرتا ہے کہ اسے اس کے ماں باپ کے خیال نہ ستائیں کیوں کہ اس کے خیال میں یہ سب کچھ اس کی وجہ سے ہو رہا ہے پھر وہ سوچتا ہے کہ یہ میرا مقصود نہیں یہ میرے ماں باپ کا قصور ہے۔جنہوں نے میری تربیت میں کوتاہی کی۔اس کو اپنی بیوی کا خیال آتا ہے۔اور وہ سوچتا ہے کہ اس نے پورے تین سال اپنی بیوی کا امتحان لیا اور اس نے میرا ہر ظلم صبر سے برداشت کیا اور وہ شخص اپنی ذمہ داریوں سے بھاگتا رہا کیونکہ وہ عیش وعشرت میں مبتلا تھا۔وہ ایک طوائف کے کوٹھے پر جاتا اور آوارگی میں مبتلا رہتا اور ہر طرف عیاشی میں پھرتا رہتا اس نے اپنی دولت اپنے باپ کی کمائی اور اپنی بیوی کے زیورات اس طوائف کے قدموں کی نذر کر دیئے تھے وہ اس عورت کو سوچتا رہا یہاں تک کہ اسے اس بات کی شدید ندامت ہوئی کہ اس نے ایک طوائف کے لیے سب گھر والوں کو چھوڑ دیا۔اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ اسے گھر واپس لوٹ جانا چاہیے۔افسانے کے آخر میں وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسے لوٹ کر جانا ہے اور اچانک اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا دل خوشی سے دھڑک رہا ہے۔

زیرِنظر افسانہ " آوارگی " میں معاشرے کے ایک بگڑے ہوئے نوجوان کی تصویر دیکھائی گئی ہے۔ افسانہ نوجوان کی آوارگی پر مشتمل ہے اور ایک ہی رات میں وہ نوجوان اپنے سود و زیاں کا احساس کرتا ہے کہ اس نے اس آوارگی میں کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے اور شدید ندامت کے احساس تلے وہ یہ سوچتا ہے کہ اس نے اس آوارگی میں مال و دولت کے ساتھ ساتھ اپنے قریب ترین رشتوں کو بھی کھو دیا ہے تب ہی وہ یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے عزیزوں کے پاس لوٹ جانا چاہیے تا کہ وہ اس ''آوارگی'' میں سب کچھ برباد نہ کر دے اور ایک طمانیت بھرا احساس اس کے جسم میں سرایت کر جاتا ہے۔

ہفت پیکر کا پانچواں افسانہ ''ملمع'' ہے۔ اس افسانے ''ملمع'' کی ابتداء اس جملے سے ہوتی ہے۔

''وہ اس اجنبی کے سامنے کچھ جھینپی ہوئی اور غیر معمولی طور پر خاموش معلوم ہوتی تھی۔'' ۱۰

اس افسانہ " ملمع " کا اسلوب بیان سادہ اور دلکش ہے۔ مثال کے طور پر

''کھانا کھانے کے دوران میں تارا مہمانوں سے نہایت بے تکلفی سے گفتگو کرتی رہی۔ اس گفتگو کا موضوع سکول کی دلچسپیاں، ہمجولیوں کے تذکرے اور قدرتی مناظر کا ذکر تھا مگر اس کی پیاری پیاری باتوں میں لطف یہ تھا کہ ہر چیز کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتی تھی۔'' ۱۱

افسانہ ایک نوجوان خوبصورت دوشیزہ ''تارا'' کے اردگرد گھومتا ہے جو بہت خوبصورت دوشیزہ تھی اس کی عمر سولہ برس تھی۔ اس کا باپ مسٹر رستم جی بہت امیر تھا اور جب تارا نے سکول کی تعلیم مکمل کر لی تو اس خوشی کے موقع پر ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں شہر کے امراء شریک ہوئے ایک کروڑ پتی مہاجن اور اس کا بیٹا نریمان بھی شریک ہوئے۔ نریماں اکیس برس کا خوبصورت نوجوان تھا اور قدرے ذہین بھی واقع ہوا تھا۔ نریماں تارا کے والدین کو بہت پسند آیا اور نریمان کو تارا اس قدر بھائی کہ اسے لگا کہ اسے اس سے عشق ہو گیا ہے اس طرح نریماں روز روز تارا کے گھر جانے لگا ان کی ملاقاتوں میں روز بروز اضافہ ہونے لگا لیکن نریمان تارا سے اپنے دل کی بات کہنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں تارا برا نہ مان جائے۔ ایک دن نریماں نے ہمت کر کے تارا کی ماں سے تنہائی میں بات کی کہ وہ تارا سے شادی کی بات کر سکتا ہے۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ سب انکار نہ کر دیں مگر خلاف توقع اس کی ماں بہت خوش ہوئی کہ وہ تارا میں دلچسپی لے رہا ہے اس کی ماں نے اپنی رضامندی سے کہا کہ وہ تارا سے اظہار محبت کر سکتا ہے۔ جس کے بعد اس نے خوشی خوشی تارا سے بات کی اور یوں تارا کے باپ نے ایک پروقار تقریب میں ان دونوں کی نسبت کا اعلان کر دیا اور تین مہینے کے بعد شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ نریمان خوش تھا اس تقریب میں نریمان کا ایک دوست فرامرز لوگوں میں بہت جلد مقبول ہو گیا۔ اس قدر مقبول ہوا کہ وہ تارا سے روز روز کی ملاقاتیں کرنے لگا اور اپنے دفتر کے لیے جگہ بھی تارا کے باپ کے مکان میں حاصل کی اور تارا کے قریب ہوتا چلا گیا۔ نریمان کو یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے تارا بیمار اور اداس رہنے لگی ہے۔ وہ بہت سوچتا رہا کہ کیا مسئلہ ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن اسے فرامرز کے

گھر سے تارا کی وہ جڑاؤ آلپین ملتی ہے۔ جو اس نے تارا کو تحفہ کے طور پر دی تھی۔ وہ تھوڑا سا شک میں مبتلا ہوتا ہے مگر تارا یہ کہہ کر کہ وہ فرامرز کو کسی کام کے سلسلے میں ملنے گئی تھی تو اس کی آلپین وہاں گر گئی تھی یہ کہہ کر مطمئن کر دیتی ہے مگر ایک طوفانی رات اچانک تارا نریمان کو ملنے آتی ہے جب ان کی شادی میں چند دن باقی رہ جاتے ہیں وہ نریمان سے کہتی ہے کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتی اور اسے اصل چاہت کا پتا ہی اب چلا ہے۔ نریمان کو یہ سن کر بہت غصہ آتا ہے کہ وہ کون ہے؟ جس نے تمہیں مجھ سے بے وفائی کروائی ہے ابھی تارا نے کوئی نام نہیں لیا ہوتا کہ نریمان خود کہتا ہے کہ وہ فرامرز ہے نا؟ تو تارا کانپ اٹھتی ہے نریمان غصے میں پستول اٹھا لیتا ہے اور فرامرز کے گھر کی طرف چل پڑتا ہے۔ تارا اسے بہت روکتی ہے، مگر وہ اس کے گھر کا دروازہ زبردستی کھولنے کی کوشش کرتا ہے مگر اندر سے نکلنے والی عورت کو دیکھ کر نریمان اور تارا دونوں پریشان رہ جاتے ہیں کہ وہ ایک انگریز عورت ہوتی ہے جو کہتی ہے کہ وہ فرامرز کی بیوی ہے اور وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی یہاں تک پہنچتی ہے مگر فرامرز اسے بتائے بغیر روپوش ہو گیا ہے۔ یہ دیکھ کر تارا کی آنکھوں سے ملمع اتر جاتا ہے اور اس کی شادی مقررہ تاریخ پر نریمان سے ہو جاتی ہے۔

اس افسانے کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں متعدد کرداروں کے نام دیئے گئے ہیں اس سے پہلے کے افسانوں کے کرداروں کے نام نہیں دیئے گئے ہیں۔ اس افسانے کا انداز بیانیہ ہے۔ افسانے میں ملمع تارا کی آنکھوں پر چڑھا ہوتا ہے جو فرامرز کے گھر انگریز عورت کو دیکھ کر اتر جاتا ہے۔

ہفت پیکر کا چھٹا افسانہ ''حیات تازہ'' ہے۔

افسانے کے شروع ہونے سے پہلے یہ جملہ درج ہے۔

''وہ اپنے واہمے پر ہنسا'' ۱۲

اس افسانے ''حیات تازہ'' کا اسلوب نہایت سادہ اور آسان ہے۔ مثال کے طور پر

> ''شام کے وقت جب مغرب کی جانب سے ایک نورانی شعاع تمام پہاڑوں اور ندی کے نالوں کو ارغوانی رنگ میں رنگ دیتی۔ اس وقت وہ فریضہ مغرب کے لیے کھڑا ہو جاتا اور اس سچے دل سے خداوند قدوس کی تعریف و تسبیح کرتا کہ اس کا دل خوشی سے معمور ہو جاتا تھا۔'' ۱۳

افسانہ ریاض نامی کردار سے شروع ہوتا ہے جس کی زندگی کے مصائب کی المناک کہانی بیان کی گئی ہے جب اس کی شادی ہو گئی تو ایک سال کے اندر اندر اس کے ماں باپ چل بسے ابھی وہ نا تجربہ کار ہی تھا کہ اس کا سب مال و متاع چھین لیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اسے ایک اور عظیم صدمہ برداشت کرنا پڑا کہ اس کی بیوی بھی فوت ہو گئی۔ ریاض ابھی ان صدموں

کو برداشت بھی نہ کر پایا تھا کہ اس کے رشتہ داروں نے اس پر طنز کے تیر برسانے شروع کر دیئے۔اس کے دوستوں نے اس سے بے وفائی کی وہ دنیا کے تہذیب وتمدن اور آسائشات کو ترک کر کے ایک سنگلاخ پہاڑوں میں رہائش اختیار کر لی اور اس طرح وہ اپنے شب وروز ایک پہاڑی میں بنائی گئی اپنی عارضی رہائش میں بسر کرنے لگا وہ اپنا چمڑے کا مخصوص لباس پہنتا۔ اللہ کی عبادت کرتا اور پرندوں کا شکار کر کے ان سے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا۔کبھی کبھی اسے سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان تنہائی کا شدت سے احساس ہوتا اور اناج کی طلب اسے ستاتی۔مگر وہ اپنے احساس کو دبا دیتا اور اپنی خواہش کو پس پشت ڈال کر یہ سوچتا کہ میں اس دنیا میں کیوں لوٹ کر جاؤں جس نے مجھ سے اتنی بے التفائی برتی اور یوں وہ اس وادی میں زندگی گزارتا رہا۔ایک رات اس نے اپنے جھونپڑے کے باہر ایک انسان کے کراہنے کی آواز سنی۔اس نے باہر جا کر دیکھا تو ایک بوڑھا زخمی اور ایک نوجوان حسین دوشیزہ وہاں پتھروں پر بیٹھے تھے۔بوڑھے نے ریاض پر پستول تان لیا مگر ریاض نے کہا کہ وہ بھی انہی کی طرح کا ایک انسان ہے اور ان کا کوئی دشمن نہیں یہ سن کر بوڑھا مطمئن ہو جاتا ہے اور ریاض کے جھونپڑے میں اپنی بیٹی کے ساتھ رہنے آ جاتا ہے۔وہ بوڑھا ریاض کو اپنی بپتا سناتا ہے کہ نوجوانی کے دور میں وہ ایک نامی گرامی ڈاکو تھا اور اس نے پنجاب میں بہت سے ڈاکے ڈالے تھے اور پھر جب اس نے ایک زمیندار کی بیٹی سے شادی کر لی تو ڈاکے ڈالنے سے توبہ کر لی اور اپنے گھر آباد کر لیا کیونکہ وہ ایک پیاری سی بیٹی کا باپ بن چکا تھا۔اس کی بیوی کی وفات کے بعد اس نے اپنی بیٹی کو نازوں سے پالا مگر ایک دن اسے پتا چلا کہ پنجاب پولیس نے اس کے ٹھکانے کا پتا لگا لیا ہے اس کی بیٹی نے اپنے باپ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا جمع شدہ روپیہ اور مال ومتاع لے کر روپوش ہو جائیں اور اس طرح پانچ دن کی مسافت طے کر کے وہ اس وادی میں پہنچے تھے۔ریاض کو ان کی کہانی سن کر بہت افسوس ہوا۔انہوں نے ریاض کی شرافت اور عمدہ طبیعت کے باعث ہمیشہ کے لیے ریاض کے پاس رہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک سہانی صبح اپنی بیٹی کی شادی ریاض سے کر دی اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا جس سے ریاض اور اس کی بیوی بہت اداس ہوئے مگر ان کی اداسی کچھ ہی دنوں بعد ان کے ہونے والے بیٹے اقبال نے ختم کر دی اور بوڑھے کے مرنے کے آٹھ سال بعد اقبال آٹھ برس کا اور پانچ سالہ شوکت نے اس وادی کے سنگلاخ پہاڑوں کا مقابلہ کرنا سیکھ لیا مگر اب ان کی ماں کو اس وادی کی بجائے دنیا کی یاد ستانے لگی اور وہ اٹھتے بیٹھتے دنیا کا تذکرہ کرتی اور کہتی کہ بہر حال ہمیں اس دنیا میں اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے واپس لوٹ کر جانا ہے اور ایک رات انہوں نے اس وادی سے روانگی کا فیصلہ کر لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وادی کی ہر شے اداس نظر آ رہی تھی اور وہ چاروں متمدن دنیا کا مقابلہ کر رہے تھے۔

اس افسانے کا مرکزی خیال تہذیب یافتہ انسان کی دنیا کی آلائشوں سے قطع تعلق ہے اور وہ اس قطع تعلقی کے باعث اس دنیا کو چھوڑ کر ایک ویران وادی کو انسان کے وجود سے آباد کرتا ہے۔اسی وادی میں اتفاقاً ایک بوڑھا اور اس کی بیٹی وارد ہوتے ہیں اور ان کی ملاقات افسانے کے ہیرو سے ہوتی ہے جو کہ نیک اور شریف انسان ہے اور یوں انسانوں کے میل

TH-13866

ملاپ سے یہ وادی بہت آباد رہتی ہے اور آخر میں یہ وادی انسان کے وجود سے اس وقت خالی ہو جاتی ہے جب ریاض اور اس کی بیوی متمدن دنیا میں جانے کا فیصلہ کرتے ہوئے وادی کو چھوڑ دیتے ہیں۔

ہفت پیکر کا ساتواں افسانہ ''افسانہ در افسانہ'' ہے۔ اس کے شروع میں یہ جملہ درج ہے۔

پہلا یوں ہے:

''سمندر نے کہا آبرو اتر گئی تو ناک کٹ جائے گی'' ۱۴

"افسانہ در افسانہ" میں حفیظ کا انداز بیان سادہ اور آسان ہے۔ مثال کے طور پر

> ''ان دہشت ناک خیالوں میں مجھے ایک نازک سے قہقہے کی آواز سنائیدی۔ نیچے کی منزل میں میری ننھی لڑکی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ اور ایک شیریں راحت نے میری پلکیں ملا دیں۔ مجھے اپنے گوشہ چشم پر آنسوؤں کی ہلکی ہلکی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔'' ۱۵

حفیظ صاحب نے اس افسانے کو بیان کرنے میں کہانی کو ایک شخص کی زبانی بیان کیا ہے۔ کہانی ''افسانہ در افسانہ'' کے نام سے ہے اور واقعی اس افسانے کے اندر تین مختلف کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی کہانی اس شخص کی زبانی بیان کی گئی ہے جو تین بیٹوں کا باپ ہے اور جب اس کے ہاں تیسری بیٹی کی پیدائش ہوئی تو دایہ افسوس کرنے بیٹھ گئی تو اس شخص کو انتہائی غصہ آیا اور اس نے دایہ کو منع کر دیا کہ آئندہ اس قسم کی بات نہ کرے کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو بیٹیوں کی پیدائش کا برا مناتے ہیں اور پھر اس نے دایہ سے کہا کہ وہ چلی جائے کیونکہ اس شخص کو تیز بخار ہے، پھر دایہ دوسرے کمرے میں اس کی بیوی کے پاس آ گئی اور اس کی بیوی نے اس دایہ سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ بڑھیا کے خاندان کے تمام لوگ طاعون کی نذر ہو چکے تھے اور اب اس کا سوائے ایک اندھی نواسی کے اس دنیا میں کوئی نہیں رہا تھا۔ وہ شخص بڑھیا کے غم انگیز الم سے نکل کر اپنے رشتہ داروں کی موت پر سوچنا شروع ہو گیا۔ ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک حال کی دنیا میں واپس آ گیا۔ جہاں وہ بڑھیا کو کہتے ہوئے سنتا ہے کہ جب وہ بڑھیا کم سن تھی تو اس کا بیاہ کیسے ہوا؟ یہاں سے افسانے کی دوسری کہانی شروع ہوتی ہے جہاں وہ بتاتی ہے کہ اس کا دادا انتہائی سخت طبیعت کا مالک تھا اور ہر وقت اس کے باپ سے کہتا تھا کہ اس کا بیاہ کر دو اور یہ بھی کہتا تھا کہ اس کی عمر گزر رہی ہے حالانکہ اس وقت اس کی عمر نو سال بھی نہیں ہوئی تھی مگر اس کے دادا کا خیال تھا کہ لڑکی کو بٹھائے رکھنے سے آبرو اتر جائے گی پھر اس کا دادا اس رات گاؤں میں چودھری کے بیٹوں کا قصہ سنانے بیٹھ گیا۔

یہاں سے افسانے کی تیسری کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ جہاں اس کا دادا چودھری دولو کے بیٹوں کا قصہ لے بیٹھتا ہے اس کے دو بیٹے تھے اور ایک بیٹی تھی ابھی وہ کم سن ہی تھی کہ ان کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ دونوں بھائی محنت مزدوری کر کے ماں اور بہن کا پیٹ پالنے لگے۔ بڑھیا کا دادا کہانی سناتا رہا کہ ایک رات اس نے دیکھا کہ سرکنڈوں میں دو سائے لہرا رہے

ہیں اس نے سمجھا کہ وہ کوئی ڈاکو ہیں جب وہ ان کے قریب پہنچا تو وہ اپنی بہن اوراس کے عاشق کے بارے میں بات کر رہے تھے کہ ان کی بہن کی وجہ سے ان کی آبرو کٹ جائے گی۔ اس بوڑھی عورت کا دادا انہیں مشورہ دیتا ہے کہ وہ اپنی بہن کو نانی کے گھر چھوڑ آئیں اوراس کے عاشق کو مار کر مردوں کی طرح بہادری دکھائیں۔ چنانچہ انہوں نے ان کے مشورے کو قبول کرلیا اور دوسری صبح جب وہ اپنی بہن کو چھوڑنے جارہے تھے تو اس کا عاشق ان بھائیوں کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ سخت طیش میں تھا۔ اس بوڑھی عورت کے دادا نے ان بھائیوں کو بچانے کے لیے ان کے پیچھے جانے کا ارادہ کیا اور جب وہ جنگل میں پہنچا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ ان دونوں بھائیوں نے اپنی بہن اوراس کے عاشق کو مار ڈالا۔ ان کی بوڑھی ماں اپنے بیٹوں کا راستہ دیکھتی رہ گئی اوران کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی اور سزا کے طور پر انہیں کالے پانی بھیج دیا گیا۔

اور آخر میں بوڑھا آدمی کہہ رہا تھا کہ جوان لڑکی کو گھر میں بیٹھا کر رکھنے سے وہ گھر برباد ہوگیا اوراس واقعہ کے تین ماہ بعد اس بڑھیا کی شادی اس کے باپ نے کردی اوراچانک افسانہ بیان کرنے والے شخص نے اپنی بیٹی کے ہنسنے کی آواز سنی اور وہ ماضی کے دریچوں سے حال میں جھانک سکتا تھا۔ یہ کہانی افسانہ درافسانہ بیان کی گئی ہے۔ کہانی کا مرکزی خلاصہ جو تینوں کہانیوں کا بنیادی نکتہ تھا وہ یہ تھا کہ تینوں کہانیوں میں لڑکیوں کو عزت و ناموس کے حوالے سے بات کی گئی ہے اوران افسانوں میں معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔

(ب) افسانوں کی تدوین

طبع زاد افسانوں کے علاوہ حفیظ نے مختلف رسائل میں شائع ہونے والے مترجم افسانوں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں بھی شائع کیا ہے۔

حفیظ جالندھری رقم طراز ہیں:

> ''رسالہ ''ہزار داستان'' اور رسالہ ''مخزن'' کی ادارات کے دنوں میں میرے پاس بے شمار تراجم شائع کر نے کے لیے موصول ہوتے تھے جن کو دیکھ کر میں نے یہ رائے قائم کی کہ ترجمہ کے شوقینوں کو یا تو اچھے افسانے دستیاب نہیں ہوتے ہیں یا وہ ذوقِ صحیح سے بے بہرہ ہیں۔ خدا کے فضل سے میرا حلقہ احباب ایسے اصحاب پر مشتمل ہے جن میں متعدد وجود مختلف اصناف ادب میں کمال رکھنے کے علاوہ افسانہ نگاری کے بھی جید نقاد ہیں اور خود مشہور افسانہ نگار ہیں۔ میں نے اپنا معیار بیان کر کے ان سے فرمائش کی کہ مجھے دوسری زبانوں کے ایسے افسانے مہیا کردیں جو میرے ذوق کی تشنگی بجھانے کے علاوہ عام افسانہ پڑھنے والوں اور افسانہ نگاروں اور افسانہ کے مترجموں کے لیے مشعل راہ بن سکیں۔ احباب نے بکمال عنایت ایک بڑی تعداد ایسے افسانوں کی مہیا کردی اور چند افسانوں کو خود بھی اردو کا لباس پہنا دیا تا کہ دوسروں کی رہنمائی ہو۔ بقیہ افسانے میں نے اپنے بعض نوجوان انگریزی داں دوستوں کو ترجمہ کرنے کے لیے دیئے۔ جب یہ

ترجمہ ہو کر میرے سامنے آئے تو میں نے بعض کو باوجود انگریزی نہ جاننے کے اپنے مذاق کے مطابق اصلاح دی بعض کو از سرِ نو لکھا اور بعض کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ پلاٹ تو وہی رہنے دیا لیکن فضا اور ماحول تبدیل کر کے ایک اور ہی قالب میں ڈھال دیا۔ جب یہ اس صورت میں شائع ہوئے تو ان احباب نے بھی پسند کیے جنہوں نے یہ مہیا کیے تھے اور وہ بھی مسرور ہوئے جنہوں نے ترجمہ کرنے کی تکلیف اٹھائی تھی''۔۱۶

حفیظ جالندھری کے ذاتی لکھے گئے افسانوں کے علاوہ ان کے کچھ تراجم شدہ اور کچھ مرتبہ و منتخبہ افسانے بھی ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ جن کے افسانوں کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے وہ دنیا کے عالمی ادب سے کیے گئے اردو تراجم کا مجموعہ ہے۔

زیرِ نظر مجموعے ''معیاری افسانے'' میں حفیظ جالندھری نے ۱۸ افسانے مرتب کیے ہیں۔ یہ تمام افسانے مختلف ادیبوں کے لکھے ہوئے ہیں اور ان کو مختلف اصحاب علم نے ترجمہ کیا ہے۔ لیکن ان تمام افسانوں کو مرتب اور منتخب بھی حفیظ صاحب نے کیا ہے۔

پیش نظر مجموعے میں شامل افسانوں کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ ''عورت یا شیر'' مصنفہ ''فرینک۔آر۔سٹاکٹن''

۲۔ ''شہزادی کا معمہ'' مصنفہ ''اینتھنی ہوپ'' مترجم مفتی محمد اقبال

۳۔ ''مرد کی خواہش'' مصنفہ ''اولیو شرینر''

۴۔ ''جاں نثار دوست'' مصنفہ آسکر وائلڈ

۵۔ ''شرط'' مصنفہ اینٹون چیکف'' (روس)

۶۔ ''محتاج کا دل'' مصنفہ ''فریڈرک بوتے''

۷۔ ''لختِ جگر'' مصنفہ ''شولم آش''

(ان پانچوں افسانوں کو غلام عباس صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔)

۸۔ ''اندھی دنیا'' مصنفہ ''لارنس ہاؤس مین''

۹۔ ''پتھر کا دل'' مصنفہ ''لارنس ہاؤس مین''

۱۰۔ ''شکستہ پر'' مصنفہ ''ایک رومانوی افسانہ نگار کی تصنیف'' نام نہیں معلوم ہے۔

(ان تینوں افسانوں کو سراج الدین احمد نظامی صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔)

۱۱۔ ''جواہرات'' مصنفہ مارجوری بوون''

(اس افسانے ''جواہرات'' کو بدر الدین صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔)

۱۲۔ ''چنگیز خان اور اس کے پوتے کی کہانی'' مصنفہ ''میکسم گورکی''

(اس افسانے کو سید نذیر ایم ایس سی نے ترجمہ کیا ہے۔)

۱۳۔ ''زندگی کا سانس'' مصنفہ ''مصنف نامعلوم ہے

۱۴۔ ''بربطی مغنی'' مصنفہ ''سنہالتاسین''

(ان دونوں افسانوں کو شمس عارف صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔)

۱۵۔ ''شکست کی فتح'' مصنفہ ''رابندراناتھ ٹیگور''

(اس افسانے ''شکست کی فتح'' کا ترجمہ عزیز احمد صاحب نے کیا ہے۔)

۱۶۔ ''وہ بدمعاش مرن'' مصنفہ ''مدرس لیول''

(اس افسانے ''وہ بدمعاش مرن'' کا ترجمہ سید امتیاز علی تاج نے کیا ہے۔)

۱۷۔ ''انوکھا انتقام'' مصنفہ ''مصنف کا نام معلوم نہیں ہے

(اس افسانے انوکھا انتقام کا ترجمہ سید عبدالمغنی دہلوی صاحب نے کیا۔)

۱۸۔ ''مسافر کی کہانی'' مصنفہ مصنف کا نام معلوم نہیں ہے۔

(اس افسانے، مسافر کی کہانی کا ترجمہ سید ذوالفقار بخاری نے کیا ہے۔)

مصنف فرنیک۔آر۔سٹاکٹن نے افسانہ " عورت یا شیر " میں تصوراتی نوعیت کی کہانی بیان کی ہے۔اس افسانے میں ایک سنگدل اور بے رحم بادشاہ کا ذکر کیا گیا ہے جس نے اپنی رعایا کے ذہنی قواء کو مضبوط رکھنے کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کیا اور ایسی تماشا گاہ کا اہتمام کیا گیا یہ تماشا گاہ ایک لحاظ سے بہت عجیب وغریب تھی۔ یہ جگہ اپنی بھول بھلیوں کی وجہ سے اور اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے نہ صرف مختلف تھی بلکہ اس لحاظ سے بھی مختلف تھی کہ اس کے وسیع میدان میں جب کسی مجرم کو لاکھڑا کیا جاتا تو تماشا گاہ کے دو مختلف دروازوں کے پیچھے مجرم کے لیے خفیہ سزا پوشیدہ ہوتی۔ایک دروازے کے پیچھے ایک خونخوار شیر ہوتا اور دوسرے دروازے کے پیچھے ایک حسینہ۔اب فیصلہ مجرم کی قسمت پر چھوڑ دیا جاتا کہ وہ چور دروازہ کھولتا ہے اس کے پیچھے سے شیر نکل کر اسے چیر پھاڑ کھاتا ہے یا پھر دوسرے دروازے کے پیچھے سے ایک حسینہ برآمد ہوتی ہے اگر مجرم کے دروازہ کھولتے ہی حسینہ برآمد ہوتی تو بادشاہ اسی وقت اس مجرم اور اس حسینہ کی شادی کروا دیتا اور دروازے کے پیچھے سے ایک حسینہ کا برآمد ہونا مجرم کی بے گناہی کا ثبوت ٹھہرتا اور اس طرح جو لوگ تماشا دیکھنے آتے ان کی خوشی بھی دیدنی ہوتی۔

جو بادشاہ یہ تماشا منعقد کراتا تھا اس کی ایک راجکماری بھی تھی۔ یہ شہزادی بہت خوبصورت اور بادشاہ کی ہر دلعزیز تھی۔ بادشاہ بھی اسے دل و جان سے چاہتا تھا اس بادشاہ کی رعایا میں ایک حسین اور بہادر نوجوان تھا جس کو اس راجکماری سے عشق ہو گیا اور راجکماری بھی اسے دل و جان سے چاہنے لگی۔ بادشاہ کو اس بات کی خبر ہوئی تو اس نے نوجوان کو ملزموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ ہر چند یہ ایسا معاملہ تھا جہاں نوجوان نے اپنے عشق کا اقرار کر لیا تھا اور کسی قسم کے فیصلے کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ مگر بادشاہ اپنے اصول توڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس نوجوان کو بھی تماشا گاہ میں پیش کیا جائے گا اور بادشاہ کے فیصلے کے مطابق خونخوار اور کئی دن کے بھوکے شیر کو ایک دروازے کے پیچھے بند کر دیا گیا اور اس کے مقابلے میں دوسرے دروازے کے پیچھے سب سے خوبصورت اور نوخیز ترین دوشیزہ کا انتخاب کر کے چھوڑا گیا جب نوجوان کو سزا کے لیے پیش کیا گیا تو وہ بادشاہ کی تعظیم کے لیے جھک گیا اور اس نے بادشاہ کو دیکھنے کے بجائے نگاہیں راجکماری پر ہی مرکوز رکھیں۔ شہزادی اپنے اندر متلاطم جذبوں پر قابو نہ پا رہی تھی اور وہ اس کے چہرے سے خوب عیاں تھا اور وہ سفید پڑ رہی تھی۔ نوجوان کو معلوم تھا کہ شہزادی ہونے کی حیثیت سے اس کی معشوقہ کو خوب معلوم ہوگا کہ کس دروازے کے پیچھے موت چھپی ہے اور کس کے پیچھے لڑکی۔ نوجوان نے نگاہوں کی زبان سے پوچھا کہ کس دروازے کا انتخاب کیا جائے؟ کیوں کہ اسے شہزادی پر پورا بھروسہ تھا اور وہ شہزادی سے پوچھ رہا تھا۔ شہزادی نے نگاہوں ہی نگاہوں کے اشارے سے بتایا کہ دائیں دروازے کے پیچھے اور نوجوان نے بے دھڑک دایاں دروازہ کھول دیا۔

اس افسانے ''عورت اور شیر'' میں مصنف کا انداز بیان سادہ اور سلیس ہے۔ مثال کے طور پر

> ''راجہ نے اپنے فرائض ادا کرنے میں زیادہ تامل نہیں کیا۔ کسی تذبذب یا سوچ بچار کے بغیر نوجوان کو حراست میں لے لیا اور مقدمے کی تحقیقات کے لیے آخری دن مقرر کر دیا۔ یہ دن واقعی ایک یادگار دن تھا۔ رعایا اور خود راجہ اس مقدمے کی تحقیقات میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔ اس سے پیشتر کبھی ایسی بات نہ ہوئی تھی کہ ایک غلام خاص راجہ کی بیٹی سے محبت کرنے کی جرات کرے۔ شاید دنیا کے آغاز میں یہ بات معمولی خیال کی جاتی ہو۔ مگر ان قوموں کے لیے معاملہ نہایت اہم تھا۔''۱۷

افسانہ نگار نے یہاں کہانی کو ایک جملہ ''یہ معمہ ہے کہ اس دروازے کے پیچھے سے شیر برآمد ہوا یا حسینہ؟'' کے ذریعے قارئین کے اوپر یہ فیصلہ چھوڑ دیا ہے کہ وہ سوچیں یہاں سے کیا برآمد ہوا ہوگا؟

افسانہ نگار نے قارئین کو سوچنے کے لیے بہت سارے سوالات مہیا کرتا ہے کہ انہیں یہ سوچنا چاہیے کہ اس شہزادی کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی کہ اس نوجوان کو اگر شیر کھا گیا تو بھی وہ اپنے محبوب کو کھودے گی اور اگر اس نوجوان کو کوئی اور

عورت لے جاتی ہے تب بھی اس شہزادی کے خوابوں کا محل چکنا چور ہو جائے گا؟ افسانہ نگار عورت کے جذبات کی عکاسی عمدہ طریقے سے کرتا ہوا یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتا ہے کہ اب وہ سوچیں کہ اس میں سے شیر نکلا یا عورت؟

دراصل افسانہ نگار اس افسانے کو ایک خاص مقام پر آ کر چھوڑ دیتا ہے اور مرد و عورت کے جذبات کی خوبصورت عکاسی کرتے ہوئے کہانی کو ایک ایسے موڑ پر ادھورا چھوڑ دیتا ہے۔ جسکی وجہ سے قاری تجسس میں رہتا ہے اور وہ اپنے طور پر اس افسانے کو مکمل کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ افسانے میں تحیر اور خوف کی فضا دلچسپی کے عنصر کو بڑھا کر قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ میرے خیال میں مصنف اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتا ہے۔

انتھنی ہوپ نے اس افسانے ''شہزادی کا تحفہ '' میں بیان کرتے ہیں۔ کہ بادشاہ عبدالرحمٰن نے ایک بہادر لشکر ساتھ لے کر اشبیلیہ کے سامنے ڈیرے ڈالے جو شاہ سانکو کی بیٹی ملکہ کیتھرائن کے قبضہ میں تھا۔ بادشاہ نے شہزادی کو پیغام بھیجا کہ اطاعت کر لو اور اگر ایسا نہ ہوا تو اشبیلیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ شہزادی نے جواب دیا کہ آپ بادشاہ ہیں مگر میرے بادشاہ نہیں اور شہزادی اپنے قلعے پر حکومت کرتی ہے اور بادشاہ کو شہر کی فصیل گرزنے سے پہلے قلعہ کو فتح کرنا پڑے گا۔ بادشاہ یہ سن کر غضب ناک ہو گیا۔ اس نے تین بار شہزادی کو پیغام بھیجا اور تینوں بار شہزادی نے یہی جواب دیا۔ بادشاہ کی فوج میں غازان نامی شخص تھا۔ اس نے یہ پیغام سن رکھا تھا۔ اس نے بادشاہ سے سوال کرنے کی جرات کی کہ جہاں پناہ فوج کا قلعہ کیا ہوتا ہے۔ اس نے تین مرتبہ یہی سوال بادشاہ سے کیا۔ تیسری مرتبہ بادشاہ کو بات معنی خیز لگی اور سوچنے لگا اور بولا '' فوج کا قلعہ وہ مضبوط دل ہے جو فوج پر حکومت کرتا ہے '' بادشاہ کا ایک سپاہی شہزادی کیتھرائن کے محل میں قیدی بن کر رہا تا کہ وہ اس معمے کا حل نکال سکے۔ ہر روز کیتھرائن اس کو بلاتی اور بادشاہ اور اس کی سلطنت کے حوالے سے باتیں کرتی۔ ساتویں رات آخری رات تھی۔ شہزادی اسے بلاتی ہے۔ اور پوچھتی ہے کہ تم بادشاہ کو کیا تحفہ پیش کرو گے۔ اس نے کہا اس کے پاس قلعے کی کنجیاں نہیں تو کچھ بھی نہیں اور وہ قلعے کی دیواروں کے باہر ہم دوبارہ ملیں گے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ کہ فوج کا قلعہ ملکہ کا دل ہے۔ دوسرے دن بادشاہ اپنی فوج کے ساتھ اشبیلیہ کے جنوبی دروازے کے پاس فصیل کی طرف چلنے لگا۔ اور فصیلوں کے قریب جا کر بادشاہ کا حکم قاصد نے پکارا کہ بادشاہ ملکہ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ اس پر شہر کا دروازہ کھل گیا۔ اور بادشاہ نے گھوڑے کو تیز کیا اور آن کی آن شہزادی کے پاس پہنچ گیا۔ اور بادشاہ نے شہزادی کو اٹھا کر گھوڑے پر آگے بیٹھا لیا۔ اور بادشاہ نے کہا، ملکہ اب قلعہ میرے قبضے میں ہے اور میں شہر کی دیواروں سے گزر جاؤں گا۔ ملکہ کیتھرائن اور بادشاہ دونوں اسی طرح خوشی کے نعروں اور پھولوں کی بارش کے درمیان اشبیلیہ کے اندر داخل ہو گئے۔

اس افسانے میں انتھنی ہوپ کا اسلوب بیان سادہ ہے۔ واقعات بغیر کسی الجھاؤ کے اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔

''بادشاہ جھنجلا کر بولا۔ یہ کام جنات کی فوج کے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا۔ وہ کھسیانا ہو رہا تھا۔ اگر اسے یہ خیال نہ ہوتا کہ یہ ناکامی اسے اپنی رعایا کے سامنے حقیر اور فوج کے سامنے بزدل ثابت کر دے گی۔ تو وہ شہر اشبیلہ پر قبضہ کئے بغیر واپس پلٹ جاتا۔ وہ گومگو کی حالت میں پڑا ہوا تھا کیونکہ واپس جانے میں بدنامی تھی اور دوسری طرف ایک لشکر جرار کی سلامتی اور مقامی نزاکت کا بوجھ ناقابل برداشت بن رہا تھا۔''۱۸

اس افسانے کا مرکزی نقطہ قلعہ ہے اور قلعہ کیا ہے؟ افسانے میں قلعہ شہزادی کے دل کو کہا گیا ہے۔ عبدالرحمٰن بادشاہ اشبیلیہ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور کیتھرائن اشبیلیہ کی شہزادی ہے۔ وہ بادشاہ کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ ملکہ قلعہ کو فتح کرنے کا کہتی ہے جبکہ بادشاہ شہر کو اور لوگوں کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا اور اس کے بغیر قلعہ تک وہ نہیں پہنچ سکتا۔ بادشاہ کہتا ہے۔

''یہ کام جنات کی فوج کے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا''

اس کے ساتھ ساتھ اس افسانے میں ایک سپاہی کی اپنے بادشاہ کے ساتھ محبت اور فرمانبرداری دکھائی گئی ہے۔ فاران نامی سپاہی اپنے بادشاہ کی پریشانی دیکھ کر سوال کرتا ہے کہ فوج کا قلعہ کیا ہے؟ بادشاہ بہت سوچ وبچار کے بعد سمجھ پاتا ہے کہ فوج کا قلعہ تو وہ مضبوط دل ہے جو فوج پر حکومت کرتا ہے۔ آنہی تو کیا اس کا دل قلعہ ہے اور اسی طرح بادشاہ کا ایک سپاہی ملکہ کیتھرائن کے محل میں قیدی بن کر جاتا ہے اور وہ سات روز اپنے دشمنوں کی قید میں رہتا ہے اور اس دوران وہ اس معمے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ بادشاہ اس کی بات پر پورا یقین کرتا ہے اور وہ اب یہ نہیں چاہتا کہ اس کی بے وقوفی کی وجہ سے بہادرانِ اسلام اپنی قیمتی جانیں گنوائیں۔ وہ اس معمے کو حل کرنے سے قاصر ہے جس کی وجہ سے بادشاہ اس کو موت کی دھمکی دیتا ہے لیکن وہ ساتویں روز اس کا حل شہزادی کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھ لیتا ہے کہ ''فوج کا قلعہ ملکہ کا دل ہے'' اور جب وہ قیدی یہاں سے چلا جاتا ہے تو ملکہ خود سے ہمکلام ہوتی ہے کہ ''میرا دل اپنے مالک کو پہچانتا ہے تو کیا میں بادشاہ کے ساتھ سرگرم کلام تھی'' اور یوں یہ معمہ حل ہو جاتا ہے۔

''مرد کی خواہش'' افسانے میں مصنف اولیو شریز نے تصوراتی نوعیت کی کہانی بیان کی ہے اس افسانے میں دنیا کے دو اہم اور بنیادی اجزا مرد و عورت کا ذکر کیا گیا ہے افسانہ نگار اپنے تخیل کی بنیاد پر مرد و عورت کو ایک حسین ستارے کی آباد دنیا میں بتاتے ہیں جہاں اس دنیا کے عین وسط میں ایک اتنا گھنا جنگل تھا کہ اس کے تمام درختوں کی شاخیں آپس میں پیوست تھیں وہ اتنا گھنا جنگل تھا کہ دن رات وہاں اندھیرا رہتا۔ اس جنگل کے درمیان میں ایک قربان گاہ تھی اگر کوئی وہاں جا کر خود کو زخمی کر کے کوئی بھی خواہش کرے تو وہ پوری ہو جاتی ہے۔

مصنف نے افسانے میں فطری انداز میں کہانی کو روانی سے سپرد قلم کیا ہے۔

> ''کشتی بلا کی تیزی سے بہی جا رہی تھی۔ نظر آ رہا تھا جیسے اسے کوئی بھی چلا نہ رہا ہو بلکہ کسی پوشیدہ طاقت کے زور سے آپ ہی آپ جا رہی ہو۔ صاف صاف کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ مزید یہ کہ کشتی لحظہ بہ لحظہ دور ہی ہٹتی جاتی تھی تاہم دھندلکے میں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کشتی کے سرے پر ایک اور سایہ سا بھی بیٹھا ہوا ہے۔ عورت نے پوری تیزی سے دوڑنا شروع کیا۔ مگر جس وقت کنارے پر آئی تو کشتی کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی۔''۱۹

اس افسانے میں عورت مرد کو سچے دل سے چاہتی ہے وہ مرد کو اس کی مرضی کے مطابق تحفہ دینا چاہتی ہے۔ وہ جنگل میں موجود قربان گاہ کے پاس جا کر خود کو زخمی کر لیتی ہے تاکہ اس کی خواہش پوری ہو جائے۔ جب وہ واپس آتی ہے تو آدمی کو کشتی میں بیٹھ کر واپس جاتے ہوئے دیکھ کر بہت روتی ہے۔ اس کو پیچھے سے آواز آتی ہے کہ تیری خواہش کے مطابق مرد کو تحفہ دیا گیا ہے اور مرد کی خواہش یہ تھی کہ عورت کو چھوڑ دے اور یہاں سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔

اس افسانے کا ایک الم ناک پہلو یہ ہے کہ عورت وفا کی حدیں پار کرتے ہوئے مرد سے محبت کرتی ہے مگر مرد بے وفائی کرتے ہوئے اپنی خواہش کے عین مطابق عورت کو تنہا چھوڑ جاتا ہے۔ عورت وفا کا پیکر ہوتی ہے اس کے سامنے مرد کی خواہش بہت اہمیت رکھتی ہے وہ اس کے لیے خود کو ہر قسم کی تکلیف دینے سے بھی گریز نہیں کرتی اس کے برعکس مرد اپنی خواہش پوری کرنے کے بعد عورت سے بے وفائی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا یہاں تک کہ وہ اسے تنہا چھوڑ کے چلا جاتا ہے۔

آسکر وائلڈ کا افسانہ ''جاں نثار دوست'' میں غریب فیروز کی کہانی ہے۔ جو کہ بلبل کی زبانی بیان کی گئی ہے۔
آسکر وائلڈ کے افسانے ''جان نثار دوست'' کے اسلوب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے افسانے کے کرداروں اور مقامات کو حسب خواہش تبدیل کر دیا ہے۔ درج ذیل اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسکر وائلڈ کے ہاں '' فیروز'' یا ''مسجد'' کا ذکر کہاں ہوا ہوگا۔ یہ حفیظ صاحب کی اپج ہے کہ افسانے کو کچھ کا کچھ بنا دیا ہے جیسا کہ انہوں نے تعارف میں اس بات کا ذکر بھی کیا ہے۔

> ''جب لوگ ننھے فیروز کو دفنا چکے۔ اور ایک چھوٹی سی مسجد میں افسوس کرنے جمع ہوئے تو لوہار بولا۔ ننھے فیروز کی ناگہانی موت سے ہر شخص کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ چودھری نے زوردار لہجے میں کہا۔ کسی کو ہو نہ ہو لیکن مجھے تو بے حد نقصان پہنچا ہے کیونکہ میں تو اپنی ٹھیلا گاڑی اسے دے ہی چکا تھا۔ لیکن اب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس کو کیا کروں۔ جب گھر میں قدم رکھتا ہوں۔ اس کی وجہ سے چلنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ اور وہ ایسی بری حالت میں ہے کہ اگر میں اسے بیچنا بھی چاہوں تو کوئی پائی تک نہ دیگا۔ ہاں اب میں آئندہ ہمشیہ خیال رکھوں گا۔ کہ کبھی کسی کو اپنی چیز نہ دوں۔ انسان ہمیشہ فیاض بن کر ہی نقصان اٹھاتا ہے۔''۲۰

ایک صبح بوڑھا کچھوا پانی سے اپنا سر باہر نکال کر کھڑا تھا۔ اور پاس بطخ اپنے بچوں کو اعلیٰ سوسائٹی میں شمار ہونے کے لیے سر کے بل کھڑا ہونا سیکھا رہی تھی۔ بوڑھے کچھوے نے کہا ایسے نافرمان بچوں کو پانی میں ڈبو دینا چاہیئے۔ بطخ نے کہا شروع میں بھی ایسا کرتے ہیں۔ لیکن ماں باپ کے صبر کا کیا پوچھنا؟ کچھوے نے آہ بھر کر کہا میں والدین کے احساس کو نہیں سمجھتا کیوں کر میں شادی والا نہیں ہوں۔ لیکن محبت اچھی بات ہے مگر دوستی محبت سے بھی کہیں زیادہ بلند ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو ایک جاں نثار دوست سے بڑھ کر ہو۔ بلبل ان کی باتیں سن کر کچھوے سے بولی میں تم کو ایک کہانی سناؤں جو تم پر صادق آتی ہے۔ اور پھر بلبل جان نثار دوست کی کہانی سنانے لگی کہ

کسی گاؤں میں ایک ایماندار نوجوان ننھا فیروز رہتا تھا۔ وہ بہت نیک دل تھا۔ گاؤں بھر میں اس کے باغیچے کا سا خوبصورت باغیچہ اور کھیت جیسا سرسبز کھیت اور کہیں نہ تھا۔ باغیچے میں ہر طرح کے پودے تھے اور باغ میں ہمیشہ میٹھی میٹھی خوشبوؤں اور قسم قسم کے پیارے پیارے پھولوں کا گلزار کھلا رہتا اور چھوٹے سے کھیت میں سبز ترکاریاں اپنی بہار دکھاتیں۔ ننھے فیروز کا ایک جاں نثار دوست چودھری رحمت تھا۔ کہنے کو تو وہ امیر تھا۔ اس کا ایسا خیر خواہ اور سچا دوست تھا کہ جب کبھی اس کے باغ کے پاس سے گزرتا تو کبھی خالی ہاتھ نہ جاتا۔ پھولوں کا بڑا سا گلدستہ یا پھر پھلوں کا موسم ہوتا تو جھولی بھر لیتا۔ چودھری کا مقولہ تھا۔ کہ "سچا دوست ہر چیز میں ساجھی ہوتا ہے۔" امیر چودھری نے فیروز کو بدل میں کبھی کوئی چیز نہیں دی۔ حالانکہ اس کا گودام آٹے کی بوریوں سے بھرا رہتا اور چھ دودھ دینے والی گائیں ہیں۔ اور اونی بھیڑوں کا ایک بڑا گلہ ہے۔ بہار گرمی اور برسات میں فیروز خوش خوش رہا مگر سردی کے دن آئے تو اس کے باغ میں پھل اور پھول نہ رہے۔ جن کو بیچ کر وہ اپنی بھوک مٹا سکتا۔ چودھری اپنی بیوی کو کہتا کہ جب تک جاڑا پڑتا ہے فیروز کے پاس جانا ٹھیک نہیں کیونکہ جب لوگ مصیبت میں ہوں تو ان کو مل کر ان کے غموں میں اضافہ نہیں کرنا چاہیئے۔ چودھری کے چھوٹے لڑکے نے کہا کے اگر ہم اس کے ہاں نہیں جا سکتے تو اس کو یہاں بلا لیتے ہیں۔ اس پر چودھری نے غصے سے کہا۔ بے وقوف کہیں کا۔ سمجھ نہیں آتا کہ سکول سے کیا سیکھتا ہے۔ جیسے ہی جاڑا ختم ہوا۔ چودھری فیروز کے پاس بڑی سی ٹوکری لے کر ملنے آیا۔ تو فیروز نے کہا میں تو سمجھا تھا کہ شاید آپ بھول گئے ہیں۔ چودھری نے کہا کہ دوستی بھی کوئی بھولنے والی چیز ہے۔ پھر فیروز اسے بتاتا ہے کہ اس بار پھول اچھے ہوئے ہیں۔ ان کو بیگم مالن کے پاس بیچ کر ان پیسوں سے ٹھیلا گاڑی، چاندی کے بٹن اور پھر حقہ خریدوں گا۔ چودھری بولا ٹھیلا گاڑی میں تمھیں دے دوں گا۔ فیروز نے کہا میرے پاس لکڑی کا تختہ ہے۔ اسے لگا کر ٹھیک کرلوں گا۔ تو چودھری اس سے یہ کہہ کر تختہ لے لیتا ہے کہ گودام کی چھت میں شگاف ہے۔ چودھری فیروز سے وہ تختہ اور پھولوں کی ٹوکری بھروا لیتا ہے۔ اور فیروز دوستی کی وجہ سے خاموش ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن فیروز بیلوں کو باندھ رہا ہوتا ہے۔ تو چودھری اسے ایک بڑی سی بوری شہر میں بیچنے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ اگلے دن چودھری بوری کے پیسے لینے آتا ہے اور فیروز کو گودام کی مرمت کرنے کے لیے ساتھ لے جاتا ہے۔ اس سے اگلے دن چودھری فیروز کو بھیڑیں چرانے کے لیے پہاڑی پر یہ کہہ کر بھیج دیتا

ہے کہ میں تمھیں ٹھیلا گاڑی دینے والا ہوں۔ فیروز خاموشی سے کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بے مروت نہیں کہلوانا چاہتا۔ اس طرح فیروز ایک دن بھی اطمینان کے ساتھ اپنے پھولوں کی خبر گیری نہ کر سکا کیوں کہ اس کا دوست چودھری اس کے ہاتھ دور دور تک پیغام بھجواتا۔ لیکن فیروز اس خیال سے دل کو تسلی دیتا کہ چودھری اس کا دوست ہے اور پھر وہ اسے ٹھیلا گاڑی دینے والا ہے اس کی کتنی فیاضی ہے۔ ایک رات ننھا فیروز آگ تاپ رہا تھا۔ کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی اس نے سوچا کوئی مسافر ہوگا مگر چودھری رحمت تھا۔ اس کا چھوٹا لڑکا سیڑھیوں سے پھسل پڑا اور سخت چوٹ آئی۔ چودھری نے فیروز کو ڈاکٹر کو بلانے کے لیے بھیجا۔ ڈاکٹر اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر یہ جا وہ جا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ننھا فیروز راستہ بھول کر ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ یہ مقام نہایت خطرناک تھا کیونکہ یہ گڑھوں اور دلدلوں سے بھرا پڑا تھا۔ آخر غریب فیروز ایک دلدل میں پھنس گیا۔ دوسرے دن گڈریوں نے اس کی لاش ایک جوہڑ میں بہتی ہوئی پائی اور اسے اس کی جھونپڑی میں لے آئے۔ گاؤں کے سب لوگ جنازے میں شریک ہوئے۔ جب اس کو دفنا چکے تو ایک چھوٹی سی مسجد میں افسوس کے لیے لوگ جمع ہوئے تو چودھری کہتا ہے مجھے اس کی موت سے سخت نقصان ہوا ہے کیونکہ میں اپنی ٹھیلا گاڑی اس کو دے چکا تھا۔ اس کی حالت اتنی بری ہے کہ اب میں اسے بیچنا بھی چاہوں تو کوئی پائی تک نہ دے گا۔

بطخ نے بلبل سے کہا کچھوے کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے میں تو ماں ہوں اپنے سینے میں ماؤں کے سے جذبات ہیں اس لیے کسی دائمی کنوارے کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آئے بغیر نہیں رہے۔ بلبل نے جواب دیا مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے اسے ناراض کر دیا یعنی اسے نصیحت آموز کہانی سنادی۔ بطخ نے کہا اور نصیحت ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے۔

اس افسانے میں انسانی رویوں کی عکاسی کی گئی ہے کہ کس طرح ایک انسان دوسرے کو دوستی کے نام پر دھوکہ دیتا ہے اور اپنے مطلب کے لیے دوسرے کو کس قدر استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ چودھری رحمت نے ننھے فیروز کو استعمال کیا اور اس کے ساتھ ساتھ لالچ بھی دکھایا گیا ہے کہ اپنے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے انسان دوسروں کی چیزوں پر نظریں لگائے بیٹھا ہوتا ہے جیسے اس افسانے میں چودھری رحمت کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کی نظریں ننھے فیروز پر ہوتی تھیں۔ اس کے باغ کے سارے پھول لے لیتا ہے اس سے لکڑی کا تختہ لے لیا اور اس کو اپنی پرانی ٹھیلا گاڑی دینے کے بہانے اس سے ہر طرح کے کام کرواتا۔ حتیٰ کہ اس کی جان بھی لے لی۔ دوست وہ جو مصیبت کے وقت کام آئے گی مگر اس افسانے میں ایسی دوستی دکھائی گئی ہے کہ جب دوست ننھا فیروز مصیبت میں تھا جاڑے کے دنوں میں جب اس کے پاس روٹی بھی کھانے کو نہ تھی۔ تب وہ اس کے پاس نہیں گیا اور جب اس کے بیٹے نے کہا کہ اگر ہم نہیں جا سکتے تو وہ یہاں آ سکتا ہے وہ بے چارہ مصیبت میں ہے تو میں اسے اپنے حصے میں سے آدھی مٹھائی دے دوں گا اور اپنے سفید خرگوش بھی اسے دکھاؤں گا۔ تو اس کو چودھری نے غصے سے کہا "بے وقوف کہیں کا سمجھ میں نہیں آتا کہ تجھے اسکول بھیجنے سے کیا فائدہ ہے کچھ سیکھتے تو ہو نہیں" اور ننھے فیروز کے مرنے کے بعد بھی اسے اپنی ٹھیلا گاڑی کی فکر ہے کہ وہ بری حالت میں ہے اور اس کو کوئی خریدے گا بھی

نہیں اور ٹھیلا گاڑی ابھی فیروز کو دی بھی نہیں تھی کہ اس کے بدلے اس سے اتنے کام بھی کروائے اور خود ان سب کاموں کے بدلے میں دوستی کے متعلق پیاری پیاری باتیں کر دیتا۔ جس سے ننھا فیروز خوشی سے پھولا نہ سما تا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس افسانے میں انسان تو انسان رہ گئے چرند پرند کے جذبات بھی دکھائے گئے ہیں کہ ایک بطخ کس طرح سے اپنے بچوں کو اعلیٰ سوسائٹی میں شامل ہونے کے لیے سر کے بل کھڑا ہونا سکھاتی ہے اور بلبل کس طرح ایک کنوارے کچھوے کو نصیحت آموز کہانی سناتی ہے اور جب کچھوا اس سے ناراض ہو کر چلا جاتا ہے تو بلبل کو اس بات کا بھی افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس کو ناراض کر دیا مگر کچھوا اس کہانی کی حکمت کو نہیں سمجھ پاتا بلکہ وہ بلبل کو کہتا ہے کہ تم کبھی ترقی یافتہ نہیں ہو سکتی اس کے خیال میں اگر کسی کا خیال یا احساس کرنے لگیں تو خود کو بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس افسانے میں یہ بات بھی دکھائی گئی ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کے دل کے احساسات و جذبات کو دکھایا گیا ہے اور اسی طرح چرند پرند کے جذبات و احساسات کو بھی دکھایا گیا ہے کہ صرف انسان ہی دل نہیں رکھتا اور اچھے برے کی پہچان نہیں رکھتا بلکہ چرند پرند بھی اچھے برے کی پہچان رکھتے ہیں۔

انیتون چیکف کے افسانہ ''شرط'' میں خزاں کا موسم تھا۔ بوڑھا مہاجن اپنے کتب خانے میں ٹہلتے ہوئے پندرہ سال پہلے اس دعوت کو یاد کر رہا تھا جو اس نے موسم خزاں میں دی تھی۔ اس دعوت میں اہل قلم اور اخبار نویس حضرات بھی شامل ہوئے تھے۔ موت کی سزا کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ یہ موجودہ تہذیب کے لیے ناقابل برداشت ہے ہر کسی نے اپنی رائے دی۔ ایک مہمان نے کہا۔ سزائے موت اور عمر قید دونوں سزائیں ظالمانہ ہیں کیونکہ دونوں کا ایک ہی مقصد ہے خلق خدا کی جان لینا۔ ایک نوجوان قانون پیشہ پچیس سال کا نوجوان بھی تھا۔ اس نے اپنی رائے میں کہا کہ سزائے موت اور قید دوام دونوں ایک سی سفاکانہ ہیں لیکن اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں یقیناً قید دوام پسند کروں گا زندگی خواہ کتنی ہی بری ہو موت سے بہر صورت بہتر ہے۔ مہاجن ان دنوں جوان تھا اور دولت کا نشہ بھی تھا۔ اس نے نوجوان کے ساتھ دو لاکھ کی شرط لگائی کہ تم ایک کوٹھڑی میں پانچ سال بھی نہ کاٹ سکو گے تو قانون دان نے کہا کہ اگر آپ سنجیدہ ہیں تو میں پانچ کیا پندرہ برس کاٹنے کو تیار ہوں۔ مہاجن نے کہا منظور ہے۔ آپ دو لاکھ لگاتے ہیں اور میں اپنی آزادی۔ اس طرح اس وحشیانہ اور بے ہودہ شرط کا آغاز ہوا۔ نوجوان کو باغ کے ایک کمرے میں رکھا گیا۔ اس عرصے میں اس کی لوگوں کے ساتھ میل ملاپ سب ختم ہو گیا۔ ایک پیانو، کتابیں پڑھنے، خطوط لکھنے، شراب اور تمبا کو نوشی کی اجازت ہوگی اور ضرورت کی ہر شے وہ منگوا سکتا ہے۔ ۱۴ نومبر ۱۸۷۰ کے بارہ بجے سے لے کر ۱۴ نومبر ۱۸۸۵ تک اس کی قید کا وقت تھا۔ قید کے پہلے برس اس نے پیانو بجایا، لطیف قسم کی کتابیں، ناول، عشق و صحبت کے افسانے، جرائم کے خیالی قصے اور کامیڈیاں وغیرہ پڑھنے میں گزارا اور اسی دوران شراب اور تمبا کو نوشی ترک کر دی۔ دوسرے برس پیانو کی آواز موقوف ہو گئی اور صرف ادب العالیہ کی کتب کا مطالعہ کرتا رہا۔ باقی برس بھی اس نے کتابیں پڑھنے میں صرف کر دیئے۔ چار سال کے عرصے میں چھ سو کتابیں پڑھ

لیں جن دنوں اس کو غیر زبانوں کے مطالعہ کی دھن تھی۔ مہاجن کو اس نے مندرجہ ذیل عبارت والا رقعہ بھیجا۔

''اے میرے قید کرنے والے''

اس نے یہ چھ مختلف زبانوں میں لکھا اور مہاجن کو کہا کہ یہ ان ماہرین کو دیکھائے اگر کوئی غلطی نہ نکلی تو اپنے باغ میں بندوق چلائے۔ جس سے اس نوجوان کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی محبت رائیگاں نہیں گئی۔ مہاجن نے اس کی خواہش پوری کر دی باقی برس بھی اس نے مختلف موضوعات کی کتابیں پڑھنے اور لکھنے میں اپنا وقت گزارا۔ مہاجن ان باتوں کو یاد کر رہا تھا کہ کل بارہ بجے وہ آزاد ہو جائے گا اور اسے دو لاکھ دینے پڑیں گے۔ اس کا دیوالیہ نکل جائے گا۔ اس نے نوجوان کو مارنے کا سوچا کہ اس طرح پہلا شک چوکیدار پر آئے گا۔ اس نے کمرے کا تالا کھولا تو نوجوان لکھنے میں مصروف تھا۔ مہاجن دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ شخص ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا ہے۔ اس کو مارنا آسان ہے مگر مہاجن پہلے اس کی تحریر بھی پڑھتا ہے۔ جس میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ رات ۱۲ بجے میں یہاں سے آزاد ہو جاؤں گا اور مجھے لوگوں سے ملنے جلنے کا حق حاصل ہو جائے گا لیکن اس پیشتر کہ میں اس زندان کو چھوڑ کر باہر نکلوں اور سورج کا لطف اٹھاؤں میں ضروری خیال کرتا ہوں کہ آخری بار تم سے چند باتیں کہہ جاؤں۔

> ''خدا گواہ ہے میں سچے دل سے کہہ رہا ہوں کہ آزادی کو، زندگی کو، صحت کو اور ان تمام چیزوں کو جنہیں تمہاری کتابیں دنیا کی نعمتیں بتاتی ہیں۔ سخت نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ پندرہ برس تک میں نہایت غور سے دنیاوی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ تمہاری کتابوں میں میں نے خود کو اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیا ہے۔ معجزے دکھا دیتے ہیں۔ تمہاری کتابوں نے مجھے عقل سکھائی ہے۔ بنی نوع انسانی کے صدیوں کے پیدا کیے ہوئے خیالات میرے دماغ کی چھوٹی سی وسعت میں جمع ہو گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں تم سب سے کہیں زیادہ دانا ہوں۔ جس چیز کے سہارے تم زندہ ہو۔ مجھے اس سے نفرت ہے کہ تم اندازہ نہیں لگا سکتے اور اپنی اس نفرت کا عملی ثبوت دینے کے لیے میں ان دو لاکھ سے جنہیں کبھی میں بہشت تصور کرتا تھا۔ دست بردار ہوتا ہوں اس لیے کہ ان پر میرا کوئی حق نہ رہے میں جان بوجھ کر وقت مقررہ سے پانچ منٹ پہلے اس قید سے باہر نکل آؤں گا اور اس طرح شرط کو توڑ دوں گا''۔۲۱

مہاجن جب یہ پڑھ چکا تو اس نے کاغذ پھر وہیں رکھ دیا زندگی پھر کبھی کسی موقع پر خوفناک رقمیں گنوا بیٹھنے پر بھی اس نے اپنے آپ کو ایسا حقیر نہ سمجھا تھا جیسا آج سمجھا گھر واپس آ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا اور دل کی بے چینی نے اس کی نیند کو کوسوں دور کر دیا۔ دوسری صبح چوکیدار نے آ کر بتایا کہ وہ قیدی کھڑکی کی راہ نکل کر بھاگ گیا ہے۔ دروازے تک نظر آیا ہے مگر پھر کہاں گیا کچھ پتہ نہیں ہے۔ مہاجن نے لوگوں کی غیر ضروری باتوں سے بچنے کے لیے اس کے بھاگ جانے کا یقین لوگوں پر جما دیا اور خط گھر آ کر لوہے کے صندوق میں بند کر دیا۔

انیتون چیکف نے افسانہ ''شرط'' کا اسلوب سادہ، سلیس اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر

''تو نے یہ شرط لگائی ہی کیوں تھی؟ آخر تجھے اس سے فایدہ ہی کیا تھا؟ یہی کہ قانون دان اپنی زندگی کے پندرہ سال گنوائے اور تو اپنے دو لاکھ مفت میں کھو بیٹھے! کیا لوگ اس سے قائل ہو جائینگے کہ سزائے موت قید دوام سے بدتر ہے۔ یا بہتر؟ نہیں۔ ہرگز نہیں! یہ سراسر احمقانہ باتیں ہیں۔ حقیقت میں اس کا سبب محض یہ تھا کہ تجھ پر دولت کا نشہ سوار تھا اور اس پر دولت کی حرص۔'' ۲۲

اس افسانے میں زندگی کی اصل حقیقت دکھائی گئی ہے کہ زندگی میں ہر چیز فانی ہے ہر چیز باطل ہے۔ ناپائیدار ہے، سراب کی طرح نظر فریب ہے گو کہ انسان مغرور ہو، دانا ہو، حسین ہو لیکن موت ایک دن زمین کے نیچے بسنے والی چوہیا کی طرح انسان کو روئے زمین سے محو کر دے گی اور انسان کا نسب عالی اس کی شہرت اور اس کے طباعوں کی جادوئی زندگی یہ سب کرہ زمین کے ساتھ جل کر راکھ ہو جائے گی۔ جس طرح افسانے میں مہاجن اپنی دولت کے نشے میں اور نوجوان قانون دان دولت کی حرص میں ایسی شرط لگاتے ہیں کہ نوجوان اپنی زندگی کے قیمتی پندرہ سال قید میں گزارتا ہے اور وہ اپنی اس قید میں وسیع مطالعہ کرتا ہے اور زندگی کی حقیقت کو پہچانتا ہے اس کے پڑھنے کی مثال یوں تھی

''جیسے وہ سمندر میں تباہ شدہ جہاز کے ٹوٹے ہوئے تختوں کے درمیان تیر رہا ہے اور اپنی جان بچانے کی جدوجہد میں ایک تختے کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف اور دوسرے کو چھوڑ کر تیسرے کی طرف نہایت بے تابی سے لپک رہا ہے''۔ ۲۳

اور آخر میں، میں وہ دو لاکھ نہ لینے کے لیے شرط توڑ کر بھاگ جاتا ہے اور مہاجن کو اس شرط کے پندرہ سال بعد جب اس کی قید ختم ہونے کو تھی تب احساس ہوتا ہے کہ میرے دو لاکھ چلے گئے تو میں دیوالیہ ہو جاؤں گا اور کیا ہماری اس شرط سے لوگ قائل ہو جائیں گے کہ سزائے موت قید دوام سے بدتر ہے یا بہتر؟ نہیں، ہرگز نہیں! یہ سراسر احمقانہ باتیں ہیں۔ حقیقت میں اس کا سبب محض یہ تھا کہ ''مجھ پر دولت کا نشہ سوار تھا اور اس پر دولت کی حرص تھی'' لیکن آخر میں اس قیدی کا خط پڑھ کر وہ اپنے آپ کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔

فریڈرک بوتے نے افسانہ 'محتاج کا دل' کے مترجم نے اس افسانے میں غربت کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ انسان غربت سے تنگ آ کر اپنا ایمان بھی بیچ ڈالتا ہے۔ اس کو چوری کرنا بھی معمولی سی بات لگنے لگتی ہے۔ غربت انسان سے سب کچھ کرواتی ہے۔ مصنف نے اس افسانے کا اسلوب سادہ اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر

> ''اس معزز شخص نے اس نظارے کو دہشت زدہ آنکھوں سے دیکھا عمر بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایسا غربت زدہ گھر اس کی نظروں سے گزرا، لرز اٹھا۔شرم کے مارے گڑا جاتا تھا۔اندر ہی اندر۔کوئی کہہ رہا تھا تو کتنا گنہگار ہے۔تانگے میں بیٹھے دل میں سوچ رکھا تھا۔پہنچوں گا۔تو بڑھیا کو اچھی اچھی نصیحتیں کروں گا۔کہوں گا۔بڑی بی! لڑکے کو کسی کام میں لگاؤ۔نہیں تو آوارہ پھر کر بگڑ جائیگا۔پر اب ایک لفظ بھی یاد نہ رہا۔ادھر بڑھیا اس کے چہرے کی طرف نہایت حیرانی سے تک رہی تھی۔'' ۴۴

''محتاج کا دل'' افسانے میں دن کے وقت چاندنی چوک پر خوب چہل پہل تھی ایک خوش پوش معزز آدمی نے اپنے کوٹ کی جیب سے کوئی چیز سرکتی ہوئی محسوس کی۔اس نے سردی سے ٹھٹھرا ہوا ننھا سا ہاتھ اپنی مضبوط انگلیوں میں جکڑ لیا اور چور سامنے آ گیا یہ ایک چھوٹا سا غریب بچہ تھا۔امیر آدمی نے کہا کہ اس چھوٹی عمر میں لوگوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے میں تم کو سپاہی کے حوالے کرتا ہوں۔اس نے تانگے والے کو آواز دی اور دونوں تانگے میں بیٹھ گئے امیر آدمی نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے باپ کیا کرتا ہے تو اس نے رونا شروع کر دیا کہ نو سال کا ہوں۔سال ہو گئے باپ کا انتقال ہو گیا، تین بہنیں ہیں اور ایک بوڑھی ماں ہے۔امیر آدمی اس کے گھر گیا، وہاں غربت کا ایسا نظارہ دیکھا جو اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔وہ یہ سب دیکھ کر لرز اٹھا شرم کے مارے گڑا جاتا تھا اس نے بڑھیا کی جھولی میں پانچ کا نوٹ پھینک کر چلا گیا۔

اسی اثنا میں کوٹھڑی میں حیرت زدہ بڑھیا اس بیٹے کلو سے اصل بات پوچھتی ہے۔وہ اسے کچھ نہیں بتاتا اور جب وہ حقیقت سے آگاہ ہوئی تو رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتی ہے کہ کیا تقدیر میں یہی لکھا تھا کیا ایمانداری کا پھل یہی ہے وہ رو رو کر اپنے بیٹے سے کہہ رہی تھی کہ تیرا باپ بہشتی بھوک سے مر جانا قبول کر لیتا مگر کسی کے پیسے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا اور تو چور ہے۔کلو ہنس رہا تھا اس نے ماں کو بتایا کہ مجھے چھجو نے سکھایا ہے وہ بھی چھ ماہ سے یہی کسب کر رہا ہے اس کو کبھی کوئی دس دے جاتا ہے اور کبھی کوئی پندرہ دے جاتا ہے اور جب چھجو کو غصے ہوتا ہے تو اس طرح امیر آدمی کچھ نہ کچھ دے جاتا ہے اور یہی اس نے مجھے سکھایا ہے اور امیر آدمی نے آ کر دیکھ بھی لیا میں بھی اب یہی کام کروں گا۔مزدوری کے لیے ابھی بہت چھوٹا ہوں۔بڑھیا نے اسے جھڑک دیا اور توبہ کرنے کو کہا مگر کلو نے کچھ جواب نہ دیا۔پانچ روپے آنے سے چولہا بھی سلگا ، ہنڈیا بھی چڑھی اور مالک مکان کو بھی کچھ دے دیا گیا لیکن ہفتے بھر میں سب ختم ہو گیا۔اگلے روز کلو نے نہایت دلیری کے ساتھ اپنی ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کہا میں جا رہا ہوں۔وہ اسے روکتی رہی مگر وہ چلا گیا ایک گھنٹہ کے بعد کلو کی بڑی بہن نے اپنی ماں سے کہا امی جان ساتھ والی ہمسائی نے یہ بجھے ہوئے کوئلے دیئے ہیں۔آپ کہو تو آگ سلگا لوں۔سردی لگ رہی ہے۔غریب بڑھیا کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی آگ نہ جلانا ہی اچھا ہے کیا جانے تمہارا بھائی اس دن کی طرح آج بھی کسی امیر کو لے آئے اور اس امیر کے انتظار میں گھر کی حالت کو اور زیادہ اندوہناک بنا دیا۔

اس افسانے میں غربت سے مجبور افراد کے رویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ایک ماں جس کے شوہر نے بھوکے مرجانا بہتر سمجھا اور پیسے کے لیے کسی کے آگے سر نہیں جھکایا اور جو چوری کرنے کو گناہ سمجھتی ہے۔اس کا بیٹا کلو اپنے دوست کے کہنے میں آکر چوری کرتا ہے اور امیر آدمی اس کے گھر تک آتا ہے۔اور ان کی حالت دیکھنے کے بعد پیسے بھی دے جاتا ہے اور جب وہ ختم ہو جاتے ہیں تو کلو پھر کسی نئے امیر آدمی کی تلاش میں جاتا ہے تو اس کی بوڑھی ماں خاموش ہو جاتی ہے اور اپنے گھر کی حالت کو اور زیادہ اندوہناک بنا دیتی۔اس افسانے میں ایک طرف اس قدر امیری دکھائی گئی اور دوسری طرف اتنی ہی غریبی دکھائی گئی ہے اس معزز شخص نے اس نظارے کو دہشت زدہ آنکھوں سے دیکھا عمر بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایسا غربت زدہ گھر اس کی نظروں سے گزرا کہ وہ لرز اٹھا اور جب وہ تانگے پر بیٹھ کر واپس آیا تو اس کی جان میں جان آئی۔اطمینان کا سانس لیا، تھوڑی دیر بعد تانگا اس کو اس کی اپنی اس امیر دنیا میں لے آیا۔

اور غریبی کا بھی اس افسانے میں ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کلو کی کوٹھڑی کی چھت پر مکڑیوں کے جالے سے اور دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں کچے فرش پر دو بوسیدہ اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں ایک مٹی کے تیل کی خالی اور ٹوٹی ہوئی بوتل اور ایک غلیظ اور میلی کچیلی صراحی اور مٹی کا ٹوٹا ہوا کٹورا رکھا تھا۔چولہا راکھ سے بھرا ہوا تھا۔ایک کریہ المنظر بڑھیا گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی میلی کچیلی دھجیوں کو سی رہی تھی اور تین بچیاں بھی وہاں موجود تھیں۔

مصنف شولم آش نے اس افسانے ''لختِ جگر'' میں باپ کی محبت دکھائی ہے۔اس افسانے کا اسلوب بیان سادہ، سلیس اور حسن ادا نہایت دلکش ہے۔مثال کے طور پر

> ''یک لخت تھم گیا۔ادھر ادھر دیکھا اور پوری تیزی سے الٹے پاؤں واپس پلٹا۔بچے کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ زور زور سے رو رہا ہے۔اس نے گود میں لے لیا اور وہاں سے چلا آیا۔جنگل کے سرے پر کچھ جھونپڑیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ایک ایک گھر سے گزرتا ہوا ٹوٹی ہوئی آواز میں بھیک مانگ رہا تھا۔یتیم بچے کو تھوڑا سا دودھ دو۔بے ماں کے بچے کو تھوڑا سا دودھ دو۔''[۲۵]

''لختِ جگر'' افسانے میں بوریا کی نیند بچے کے بلکنے سے اُچٹ گئی۔آنکھیں بند کیے ہی بیوی کو پکارا گولڈا بچے کو چپ کروائیو، رو رہا ہے۔گولڈا کی طرف سے جواب نہ ملا اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر سوچا نہانے گئی ہوگی۔اس نے ایک دھجی اٹھا کر بچے کے منہ پر دے دی اس کو اچانک زوبلنز کے گھر سے جو چاندی کے شمعدان چرائے تھے۔اس کا خیال آیا کہ ان کو جا کے دیکھوں مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا پھر بیوی نے جہاں اپنا سامان رکھا ہوا تھا وہاں بھی دیکھا مگر نہ چاندی کے شمعدان تھے اور نہ اس کی بیوی تھی وہ سمجھ گیا کہ وہ بھاگ گئی ہے۔اس نے بچے کی طرف دیکھا کہ اس کمبخت کا کیا ہوگا اور پھر وہ اس

بچے کے خط وخال پر شبہ کرنے لگا۔ اس نے ٹوپی پہنی اور دروازے کو تالا لگا کر باہر چلا گیا مگر بچے کی چیخیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس نے نان بائی کی دکان سے ڈبل روٹی لی اور واپس گھر پلٹ آیا۔ بچہ پہلے کی طرح ننگا پڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور تھوڑے سے دودھ میں ڈبل روٹی بھگو کر چمچے کے ساتھ بچے کو کھلانے لگا اور ساتھ ساتھ اس کو پیار بھی کرنے لگے اور دل ہی دل میں اپنی بیوی کو برا بھلا کہنے لگا اور جب بچہ چپ ہو گیا تو اس کو ایک کپڑے میں لپیٹ لیا اور اسے اٹھا کر بازار کی طرف چل پڑا۔ منڈی میں اس کے آنے جانے سے ہل چل سی ہو گئی ''بوریا کولک کا بچہ'' کریڈنگ نے آواز دی ''اے کولک یہ بچہ کہاں سے لیا'' کریڈنگ کی بیوی نے بچے کو اٹھا لیا اور کہنے لگی کولک تیرا بچہ ہیرے جیسا ہے۔ بوڑھے کریڈنگ نے اس کی ماں کے متعلق پوچھا تو بوریا نے اسے بتایا کہ وہ چاندی کے شمعدان لے کر بھاگ گئی ہے اور بچہ چھوڑ گئی ہے کولک نے اپنا بچہ اٹھا لیا اور شہر سے ہوتا ہوا دور جنگل میں جا پہنچا ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔ وہاں آس پاس کوئی آدم زاد نہ تھا اس نے بچے کو پاس ہی زمین پر رکھ دیا اور خود اس کو گھورنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اس کو یہاں جنگل میں ہی چھوڑ جاؤں مگر فوراً ہی اس ننھی سی جاں اپنے ہی گوشت، اپنے ہی خون کی بے بسی پر دل بھر آیا۔ اس نے پھر گود میں اٹھا لیا پھر غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے اپنے ہی خدوخال جھلکتے نظر آئے اس نے بے اختیار کہا ''ننھے کولک'' پھر سوچنے لگا کہ بڑا ہو کر بڑا عجیب وغریب نکلے گا پھر اس کے بچے ہوں گے ان کی ماں بھی ان کو چھوڑ جائے اور پھر یہ بچوں کے لیے دربدر بھیک مانگتا پھرے گا اس نے بچے کو ندی کے کنارے کے پاس ہی بٹھا دیا اور خود ایک درخت کے پیچھے سے دیکھنے لگا کہ وہ کیا کرتا ہے پھر وہ ایک درخت سے دوسرے درخت اور اور اسی طرح چھپتا ہوا دور ہونے لگا یہاں تک کہ اسے کچھ سنائی اور دکھائی نہ دیا مگر بھاگتے ہوئے بھی ننھے کی چیخیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ اچانک رُکا اور الٹے پاؤں واپس پلٹا۔ بچے کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ زور زور سے رو رہا ہے۔ اس نے اسے اٹھا لیا اور جنگل کے سرے پر کچھ جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک ایک گھر کے پاس سے گزرتا ہوا بھیک مانگ رہا تھا۔ یتیم بچے کو تھوڑا سا دودھ دے دو۔ بے ماں کے بچے کو تھوڑا سا دودھ دے دو۔

اس افسانے میں باپ کی محبت کا عکس دکھائی دیتا ہے کہ ایک باپ اپنے لخت جگر سے کس قدر محبت کرتا ہے کہ وہ اسے ندی کے کنارے اکیلا چھوڑ نہیں سکتا اس کے رونے کی آوازیں اس کے کانوں میں گونجتی رہتی ہیں اور وہ اپنے بچے کے لیے بھیک مانگنا شروع کر دیتا ہے وہ بچے سے نفرت کرنے کی کوشش کے باوجود اس کی ننھی سی صورت اپنے ہی گوشت اور اپنے ہی خون کی بے بسی پر اس کا دل بھر آتا ہے۔ باپ کی محبت دنیا کی انمول محبت ہے۔

لارنس ہاؤس مین کے افسانے ''اندھی دنیا'' میں دیوتاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ افسانوی نوعیت کی تصوراتی کہانی ہے۔

> ''یہ دنیا بت بن کے کھڑی نہ ہو رہی تھی۔ حرکت کر رہی تھی۔ پھول پھل رہی تھی۔ ترقی پر تھی۔ اس کی فطرت ہی یہی تھی اور آخر کار ان بیتابیوں میں سے ایک ایسی چیز پیدا ہو گئی۔ جسے دیوتا کے اس التفات کی قدر تھی اس کی ہستی سے آگاہی تھی اور اس نے اپنے ننھے ننھے ملتجی ہاتھوں کی انگلیاں آگے پھیلا دیں تاکہ اس کے قدموں کو چھو سکے اور آواز بلند کر کے پوچھا۔'' ہے پرماتما تم کہاں ہو''۲۶

''اندھی دنیا'' افسانے میں دیوتاؤں میں سے ایک نے اپنی تنہائی سے تنگ آ کر ایک چھوٹی سی دنیا بنانا شروع کی۔ دوسرے دیوتاؤں میں سے ایک نے پوچھا کہ وہ یہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے اس نے جواب دیا کہ میں اپنے آپ کو دیکھنے کے لیے آئینہ بنا رہا ہوں میں سوچ سکتا ہوں محسوس کر سکتا ہوں اور سونگھ بھی سکتا ہوں۔ مگر دیکھنا میرے لیے ناممکن ہے اب وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنی چھوٹی سی دنیا بنانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ اس میں اپنا تخیل اور احساسات کو بھر دیتا ہے اور اپنی دنیا بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو اس کو جی بھر کے دیکھنے لگتا ہے اور بہت خوش ہوتا ہے اس کی یہ دنیا بت بن کے کھڑی نہ تھی بلکہ وہ حرکت کر رہی تھی پھل پھول رہی تھی، ترقی کر رہی تھی۔ دنیا میں ایک ایسی چیز پیدا ہوتی ہے جسے اس کے خیال کی قدر تھی اس کی ہستی سے واقفیت تھی اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ پھیلا کر پوچھا، پرماتما، ایشور تو کہاں ہے؟ دیوتا دل ہی دل میں خوش ہونے لگا۔ دیوتا نے جواب دیا ہم یہاں ہیں۔ تیری نگہداشت کر رہے ہیں۔ ننھے انسان نے پوچھا نگہداشت! نگاہ کیا ہوتی ہے اور میں کیسے دیکھوں؟ جواب آیا ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ ننھی مخلوق نے پھر پوچھا کہ میں کیسے دیکھوں؟ یہ سن کر دیوتا کو خیال آیا کہ اس نے انسان کو اپنی ساری صفات میں تو شریک کر لیا ہے مگر دیکھنے کی قوت نہیں عطا کی۔ دیوتا خود دل بھر کے دیکھتا رہا اور اس دیکھنے کی طاقت کو اس نے اس قدر صرف کیا کہ اس میں سے انساں کے حصے میں کچھ نہ آیا۔ اس طرح یہ دنیا اندھی دنیا بن گئی۔

اس کے بعد دیوتا اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے انسان کو بہلانے لگا کہ دیکھنا تیرے لیے اچھا نہیں ہے تو اسے دیکھنے لگا تو پچھتائے گا۔ ہم نے تجھے اتنی خوبصورت دنیا دی ہے اس میں خوش رہو اور ترقی کرو۔ ہم خود ہر چیز کی نگہداشت کریں گے۔ انسان نے دیوتا سے پوچھا مگر آنکھوں کے بغیر میں یہ سب کیسے دیکھوں کہ دنیا خوبصورت ہے مگر دیوتا نے جواب دیا کہ ہمارا ہر قول سچا ہے۔ مگر انسان اپنی بات پر بضدر رہا کہ مجھے آنکھیں چاہیں اور جب اسے آنکھیں نہ ملیں تو وہ بہت ناخوش رہنے لگا۔ دیوتا اپنی اس ننھی سی مخلوق کو بے چین دیکھ کر ناخوش ہوا اور خیال کیا کہ میں اپنی مخلوق کو نئی آنکھیں، خود بخود دیکھنے والی آنکھیں عطا نہیں کر سکتا۔ لیکن اپنی آنکھیں نکال کر دے سکتا ہوں۔ دیوتا نے انسان سے کہا اگر میں تجھے

آنکھیں دے دوں تو تمہاری نگہداشت کون کرے گا۔ مگر انسان بضد رہا کہ مجھے آنکھیں چاہیں میں اپنی نگہداشت خود کرلوں گا۔ یہ سن کر دیوتا کی آنکھوں آنسو سے بھر گئیں۔ دیوتا نے اپنی اس خوبصورت دنیا کو مخاطب کر کے کہا کہ اب تجھے دوبارہ دیکھنا کہ کب نصیب ہوگا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں نکال کر انسان کو دے دیں اور کہا اب دیکھ لے اور دل کو مطمئن رکھ اور تو اب دیوتاؤں کی مانند ہوگیا ہے۔ سب کچھ دیکھ لے اور جب دل بھر جائے تو واپس آ کر مجھے بتانا کہ میری اس کاریگری کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ اس دن سے دیوتا اب تک نابینا ہے اور اس بات کا انتظار ہے کہ کب انسان واپس آئے گا اور اس کی دنیا کی خبر لا کر دے گا۔ مگر انسان غیر مطمئن ہی رہتا ہے۔ کیونکہ وہ صاف صاف نہیں دے سکتا۔ اس کی آنکھوں میں دیوتا کے آنسو ہیں اور دیوتاؤں کے آنسو کبھی خشک نہیں ہوتے۔

اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ دیوتا ہونا اور خالق نہ ہونا تنہا ہونے کے برابر ہے کیونکہ خالق اپنی مخلوق سے بہت پیار کرتا ہے اور وہ اپنی مخلوق کو ہر نعمت سے نوازتا ہے تاکہ اس کی مخلوق اس کی شکرگزار ہو جبکہ دیوتا اپنی خوشی کو بھی مدنظر رکھتا ہے اور آخر میں تنہا رہ جاتا ہے۔

اس افسانے میں ایک دیوتا اپنی قوت سے ایک خوشنما دنیا بناتا ہے اور انسان کو ہر طرح کی چیزیں مہیا کرتا ہے۔ مگر ان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں نہیں دیتا کیونکہ دیوتا کے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ انسان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں عطا کر سکے۔ مگر انسان بضد رہتا ہے کہ مجھے آنکھیں چاہیں تو وہ اس کو بہلانے کے لیے کہتا ہے۔ اگر تم کو میں اپنی آنکھیں دے دوں تو تمہاری نگہداشت کون کرے گا انسان کہتا ہے کہ اپنی نگہداشت خود کرلوں گا۔ اپنی مخلوق کو یہ کہتے ہوئے سن کر دیوتا کی آنکھیں آنسو سے بھر آئیں اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اس وقت رحم سے بھرا ہوا تھا یا قہر سے۔

مگر دیوتا اپنی آنکھیں انسان کو دے دیتا ہے مگر اس امید کے ساتھ کہ انسان اس کے پاس واپس آئے گا۔ انسان اب تک غیر مطمئن ہے کیونکہ اس کو صاف صاف دکھائی نہیں دیتا ہے کیونکہ ان آنکھوں سے آنسو جھلک رہے ہیں۔ اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس انسان نے اپنے دیوتا کو تکلیف پہنچائی ہے اس لیے وہ خود بھی ابھی تک مطمئن نہیں ہے۔

مصنف لارنس ہاؤس مین نے افسانہ ''پتھر کا دل'' میں عورت کے دل کو پتھر کا کہا گیا ہے اور ایک عورت ہی دوسری عورت کو پہچان سکتی ہے۔ یہ افسانہ خیالی اور تصوراتی نوعیت کا ہے۔

> '' مجسمے نے کہا۔ ''میری خوشی! اس نے کیوں میری ناک اتنی لمبی بنائی اور میری ٹانگیں کیوں اس قدر چھوٹی رکھیں؟ اسے کیا حق تھا کہ میری ایک آنکھ دوسری سے بڑی بنائی ہے اور اے دیوتا: تم بھی جب بنانے بیٹھو تو بہترین سنگ تراش بنایا کرو اب تمہاری باری ہے اور تم بھی اس بات کے مستحق ہو کہ ایک ایک آہنی قلم تمہارے سروں میں بھی گاڑ دیا جائے۔'' ۲۷

''پتھر کا دل'' افسانہ میں ایک چابک دست سنگ تراش نے ایک ایسا مجسمہ بنایا جو خود اسے بھی دنیا کی تمام حسین اور پیاری چیزوں سے زیادہ پیارا لگنے لگا۔ یہ ایک عورت کا مجسمہ تھا۔ سنگ تراش اپنی اس تخلیق کو دل و جان سے چاہنے لگا اور ہر وقت اس کے قدموں میں پڑا رہتا اور دیوتاؤں سے رو رو کے دعائیں مانگتا کہ اس بت میں زندگی کا سانس پھونک دو تا کہ میں سارے انسانوں سے زیادہ خوش نصیب ہو جاؤں۔ اس نے اس کے اردگرد بہت سے آئینے لگا دیئے تا کہ جدھر بھی دیکھے وہی نظر آئے۔ اس نے اس کے سر پر پھولوں کا تاج پہنایا اور خوبصورت زیورات پہنائے پھر بھی اس کی روح کو سکون نہ ملا، وہ دعائیں مانگتا رہا۔ دیوتا اس کی ضد سے تنگ آ چکے تھے لیکن ان کے پیشِ نظر اس طبقہ کے لوگوں کے لیے زیادہ خوشی اچھی ثابت نہیں ہوتی۔ اس لیے دیوتاؤں کے باپ نے کہا کہ اس کی خواہش پوری کرنے سے پہلے اس مجسمے کی رائے جاننی ضروری ہے۔ ایک دیوتا بولا ہم کو احتیاط سے کام لینا چاہیے کیونکہ اگر ایک بار غلطی مرتکب ہو جائے پھر اس پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔

دیوتاؤں نے سنگ تراش پر نیند کا عالم طاری کر دیا اور وہ اپنی محبوبہ کے قدموں میں سو گیا۔ دیویاں اور دیوتے چھت کے راستے اندر داخل ہوئے۔ دیوتاؤں کے باپ نے اپنی انگلیوں سے مجسمے کی آنکھوں کو چھوا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ دیوی بولی احتیاط سے! اگر میں غلطی نہیں کرتی تو اس سنگین حسینہ کی عقل ضرور خراب ہے، اور وہ نہایت بدمذاق معلوم ہوتی ہے۔ دیوتاؤں کے باپ نے مجسمہ کے ہونٹوں اور کانوں کو چھوا اور کہا۔ اے عورت! تجھے جاننا چاہیے کہ ہم دیوتا ہیں ہم نے تمام وہ چیزیں بنائی ہیں جن میں زندگی ہے۔ وہی دیوی پھر بولی ''لیکن تجھے ہم نے نہیں بنایا''

دیوتاؤں کے باپ نے اسے بتایا کہ اس شخص نے جو اس کے قدموں میں پڑا ہے اس نے اس کو بنایا ہے تو بے جان تھی یہ شخص تجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور رات دن دعائیں مانگتا ہے کہ تجھ میں زندگی کی لہر دوڑ جائے اور پھر دیوتاؤں کے باپ نے پوچھا کہ کیا تو بھی زندگی کی خواہش مند ہے یا نہیں؟ مجسمے نے آئینوں میں خود کو دیکھا اور دیویوں کے حسن کو بھی دیکھا اور سنگ تراش اور اس کے بکھرے ہوئے اوزاروں کو بھی دیکھا اور کہا مجھے زندگی کی خواہش ہے۔ دیوی چلی جاتی ہے مگر دیوتا وہیں کھڑے رہتے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ دیوتاؤں کے باپ نے اس سنگ تراش کو اپنا ہاتھ لگا کر جگانا چاہا۔ تا کہ وہ اپنی دلی خواہش کو پورا ہوتا دیکھے مگر مجسمے نے کہا اسے مت جگاؤ۔ مجسمے نے ایک آہنی قلم اور ہتھوڑا پکڑ لیا اور آہنی قلم اس سنگ تراش کے سر میں گاڑ دیا۔ دیوتاؤں کا باپ حیران ہوا اور بولا ''دغاباز عورت! تو نے یہ کیا کر دیا'' اس نے اتنی محنت سے تم کو تخلیق کیا اور تم سے اتنی محبت کرتا ہے۔ مجسمے نے کہا اس نے میری ناک اتنی لمبی کیوں بنائی میری ٹانگیں اتنی چھوٹی کیوں بنائی؟ مجسمے نے دیوتا کو کہا کہ جب تم بھی بنانے بیٹھو تو بہترین سنگ تراش بنایا کرو اور تم سب کے سروں میں بھی آہنی قلم گاڑ دینا چاہیے۔ دیوتا اس کی حقیقت کو جان گئے اور اس کو فوراً پتھر بنا کر اس کی فتح کو حیات جاودانی کا لباس پہنا دیا۔ سنگین حسینہ ایک ہاتھ میں آہنی قلم اور دوسرے میں ہتھوڑا اٹھائے گستاخانہ انداز میں کھڑی تھی۔

اس افسانے میں عورت کا دل پتھر کا دکھایا گیا ہے کہ عورت کے اندر ذرا برابر بھی احساس نہیں ہے۔اس افسانے میں عورت کو دغاباز دکھایا گیا ہے کہ جس شخص نے اسے اتنی محنت اور محبت کے ساتھ بنایا اس مجسمی عورت نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟ وہ اس کے لیے زندگی کا سانس دیوتاؤں سے مانگتا رہا اور اس بے وفا عورت نے اس کی زندگی ہی لے لی۔

اس افسانے میں ایک اور پہلو یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ عورت ہی عورت کی حقیقت کو پہچان سکتی ہے۔جیسے اس افسانے میں جب دیوتاؤں کا باپ اس مجسمے کی آنکھوں کو چھوتا ہے اور اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے اور پتھر میں سے چھپکلی کی مانند ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہے۔تو وہ دیوی اس کی حقیقت کو جان جاتی ہے اور کہتی ہے''احتیاط سے! احتیاط سے اگر میں غلطی نہیں کرتی تو اس سنگین حسینہ کی عقل ضرور خراب ہے اور وہ نہایت بد مذاق معلوم ہوتی ہے'' اور وہ خوب صورت حسینہ واقعی ہی سنگین ہوتی ہے۔

اس افسانے میں دیوتاؤں کی اپنے بندوں سے محبت بھی دکھائی گئی ہے کہ وہ اپنے بندے کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس مجسمے میں جان ڈالتے ہیں اور جب یہ دیکھتے ہیں کہ اس مجسمے نے ہی اس سنگ تراش کو مار ڈالا تو وہ اس مجسمے کو دوبارہ پتھر کا بنا کر حیات جاودانی کا لباس پہنا دیتے ہیں۔

رومانوی مصنف نے ''شکستہ پر'' افسانے میں ماں کی محبت اور اس کے دل کے جذبات کو بیان کیا ہے۔افسانے کا اسلوب سادہ، سلیس اور نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔مثال کے طور

> ''بیچاری بٹیر نے زور زور سے پکارا۔ایک کمزور آواز جھاڑی میں سے آئی "پیسو! پیسو!" جب اس نے اسے تلاش کر کے اس کا شکستہ پر دیکھا تو اس کے دل پر ایک کاری ضرب لگی اور اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے لیکن اس نے اپنا غم ظاہر نہ کیا تا کہ وہ بددل نہ ہو جائے۔'' ۲۸

''شکستہ پر'' افسانہ میں موسم بہار میں ایک بٹیر جو افریقہ سے آئی تھی۔تکان سے نیم مردہ ہو کر اور پرواز چھوڑ کر جھاڑی کے پاس سرسبز کھیت میں اتری اور کچھ دن آرام کرنے کے بعد اس نے شاخیں پتے اور تنکے اکٹھے کر کے ایک مٹی کے تودے پر گھونسلا بنایا اور سات روز تک روزانہ ایک انڈہ دیتی رہی۔یہ انڈے چھوٹے چھوٹے اور نازک تھے اور اس نے ان پر بیٹھ کر انہیں سینا شروع کر دیا۔آندھی چلی، بارش ہوئی مگر ان پر ایک قطرہ نہ گرا۔تین ہفتوں کے بعد ان میں سے سات خوبصورت ننھے بچے نکلے جو چڑیا کے بچوں کی مانند بالکل ننگ دھڑنگ نہیں بلکہ ایک زرد سے روئیں میں لپٹے ہوئے چھوٹی چھوٹی سات ریشمی گیندوں سے مشابہ تھے۔انہوں نے انڈوں سے نکلتے ہی دانے دنکے کی تلاش شروع کر دی۔وہ بہت

خوبصورت، چالاک اور فرمانبردار تھے۔ ایک دن بیساکھ کے مہینے میں جب کسان کھیت کاٹ رہے تھے تو بڑا بچہ اپنی ماں کے بلانے پر جلدی واپس نہ آسکا تو ایک لڑکے نے اسے دوڑ کر پکڑ لیا۔ تو اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ خوش قسمتی سے ایک بوڑھے کی منت کرنے پر لڑکے نے اسے چھوڑ دیا اور اس نے اپنی ماں کو سارا قصہ سنا دیا تو والدہ نے اسے کہا کہ جب بڑے ہو جاؤ گے تو جو جی میں آئے کرنا۔ مگر ابھی میرا کہنا مانا کرو۔ نہیں تو کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے وہ خوشی اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے کھیت کی کٹائی اور گٹھوں کے انبار سے بے شمار دانے زمین پر پھیل گئے جس سے انہیں کافی خوراک مل گئی۔ کھیت کے قریب پانی نہ تھا، وہ شبنم کے قطرے پی کر گزارا کر لیتے۔ ان کی ماں ان کو اڑنا سکھا رہی تھی۔ اڑنے کا سبق سورج کے طلوع ہونے سے پہلے شروع ہوتا کیونکہ دن کو چیلوں کا سخت خطرہ تھا۔ ایک دن بٹیر نے ان سے کہا تم یہ سب کچھ ایک لمبے سفر کے لیے سیکھ رہے ہو۔ گرمیوں کے اختتام پر ہم نے کئی دن تک زمین سے بہت اونچا اڑنا ہوگا۔

بیساکھ کے خاتمے پر سہ پہر کے وقت جب وہ اپنی ماں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ شکاری کی آواز سنائی دی ماں نے اپنے بچوں کو جھاڑی میں زمین کے ساتھ لگ کر بیٹھ جانے کو کہا کہ تم بالکل نہ ہلنا نہیں تو مارے جاؤ گے۔ بچے چپ چاپ بیٹھ گئے۔ شکاری اتنا قریب آ گیا تھا کہ بچوں نے اس کے بوٹ پر چیونٹی کو رینگتے ہوئے بھی دیکھا تو بٹیر خود کتے کے ساتھ ساتھ اور آگے آگے اڑنے لگی شکاری نے کتے کو گولی لگ جانے کے ڈر سے بندوق نہ چلائی۔ اس اثناء میں بڑا بچہ دوسرے بھائیوں کی طرح بے حس و حرکت رہنے کی بجائے اڑا۔ شکاری نے آواز سن لی اور مڑ کر بندوق چلا دی وہ ذرا دور تھا صرف ایک چھرہ اس کے پروں میں لگا وہ گرا نہیں بلکہ کوشش کر کے جھاڑی تک پہنچ گیا۔ لیکن اس کے پروں کی حرکت سے اس کا بازو ٹوٹ گیا اور وہ شکستہ پر ہو کر گر پڑا۔ شکاری نے یہ دیکھ کر جھاڑی بہت گھنی ہے اور وہ بچہ ہے اسے تلاش کرنا مناسب نہیں سمجھا جب رات ہوئی اور چاند نکلا تو انہوں نے اپنی ماں کی آواز سنی جو کھیت کے دوسرے سرے سے ان کو بلا رہی تھی اس نے جب یہ دیکھا کہ ایک غائب ہے تو اس نے پوچھا کہ بڑا کہاں ہے۔ تو بچوں نے بتایا وہ اڑ گیا تھا۔ بیچاری بٹیر نے اسے تلاش کیا اور اس کا شکستہ پر دیکھ کر دل پر ایک کاری ضرب لگی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے اور اس کا مستقبل کیسا ہے؟ جب رات ہوئی تو وہ اپنی ماں سے پوچھتا کہ میں اچھا ہو جاؤں گا یا نہیں تو اس کی ماں کہتی کہ ہاں ضرور اچھا ہو جاؤ گے۔ بٹیر اور اس کے بچے مکئی کے کھیت میں چلے گئے اور پھر لمبی لمبی گھاس میں گئے۔ لمبے اور خوشگوار دن چھوٹے اور اداس دنوں میں تبدیل ہو گئے۔ سرد راتوں کے سکوت میں سارسوں کے چیخنے کی آواز آئی یہ سب کے سب ایک ہی سمت جنوب کی طرف دیس چھوڑ کر پردیس جا رہے تھے۔ غریب بٹیر کی عجیب حالت تھی اپنے بچے کے شکستہ پر کو دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ آخر نے فیصلہ کیا کہ سب کی موت سے بہتر ایک کی موت ہے اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر تا کہ اس کا استقلال جواب نہ دے جائے وہ تندرست بچوں کو ساتھ لے کر اڑ گئی۔ زخمی بچہ روتا رہا اس نے ان کا پیچھا بھی کیا اور وہ اس کی نظروں کے سامنے غائب ہو گئے۔ تین دن بعد تمام خطے میں سخت سردی پڑ گئی وہ شکستہ پر بچہ جھاڑی کے قریب اکڑا ہوا پڑا تھا اور غم

سے نڈھال اس کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ ایام کی یاد بجلی کی مانند کوندرہی تھی۔کھیت شکاری کا بوٹ اور اس پر رینگتی ہوئی چیونٹی اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیلنا اور اپنی والدہ کے گرم پر یکے بعد دیگرے اس کے سامنے آگئے اور وہ اپنے پنجوں کو جوڑ کر لیٹ گیا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہاتھ جوڑ کر دعا میں مشغول ہے۔

اس افسانے میں ماں کی محبت دکھائی گئی ہے کہ خواہ وہ انسان ہے یا چرند پرند ماں کا دل تو سب کا ایک جیسا ہوتا ہے۔زیرِنظر افسانے میں ایک بٹیر ماں اپنے بچوں کے ساتھ کس قدر محبت کرتی ہے کہ جب وہ اپنے شکستہ پر بچے کو دیکھتی ہے تو اس کا دل خون کے آنسو روتا ہے اور وہ سوچتی ہے کہ ''وہ بڑی خوش قسمت ہوتی اگر وہ اپنے تئیں دو ٹکڑے کر سکتی تا کہ اس کا آدھا جسم ان مضبوط اور توانا بچوں کے ساتھ جاتا جو سردی میں مبتلا تھے اور آدھا جسم اس زخمی بچے ساتھ رہتا جو اسے اتنا پیارا تھا''۔

اس کے علاوہ افسانے میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ماں باپ کی نافرمانی کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔بٹیر کے بچے نے ماں کا حکم نہ مانا اور اس نے اڑنے کی کوشش کی تو شکاری نے اس کو گولی ماری جس کی وجہ سے اس کا پَر ٹوٹ گیا اور اس کو اپنی ماں اور اپنے بھائیوں کے بغیر رہنا پڑا۔اس لیے ماں باپ کی اطاعت وفرمانبرداری کرنی چاہیے۔

مصنفہ مارجوری بوون نے اس افسانے''جواہرات''میں خیالی طرز کی کہانی بیان کی ہے لیکن اس افسانے میں انسانی رویوں میں تضاد کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔

> ''اس دردناک منظر نے دلھن کے نازک دل پر اس قدر اثر کیا کہ اس کا تمام جسم کانپ اٹھا اور اس کے ہاتھوں سے ہیروں کا ہار چھوٹ کر کشتی میں بیٹھی ہوئی غمگین عورت کی گود میں جا پڑا۔کشتی تھوڑی دیر میں سورج کی شعاعوں میں غائب ہوگئی۔دلھن کو ہار کے گر جانے کی کوئی خبر نہ تھی۔غمزدہ ماں اور جنازے نے اس کی مضطر خوابوں کو پریشان کر دیا تھا۔''۲۹

''جواہرات''اس افسانے کے مرکزی خیال کے مطابق ایک محل میں نئی نویلی دلہن ہے۔صبح کے وقت عروسی لباس اس کے پاس موجود تھا اور بہت سے ہیرے کے جواہرات بھی موجود تھے اور وہ یہ جواہرات پہن کر دیکھتی ہے کہ وہ کس قدر خوبصورت لگتی ہے مگر پھر ان جواہرات کو اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیتی ہے اور ہیرے کا یہ خوبصورت ہار ہاتھوں میں لیے وہ ندی میں پانی کا خوبصورت نظارہ دیکھنے لگتی ہے۔اچانک اس دلہن کی نگاہ ندی میں ایک کشتی پر پڑتی ہے۔جس میں کافوری کفن میں لپٹے ہوئے ایک وجود پر نظر پڑی ہے۔دلہن کے حساس دل کو چوٹ لگتی ہے اور اس کا سارا جسم کانپ اٹھتا ہے اور اس کے ہاتھوں سے ہیروں کا ہار چھوٹ کر کشتی میں بیٹھی ہوئی غمگین عورت کی گود میں جا گرتا ہے۔ماں جو کہ اپنے بیٹے کی لاش

سے لپٹ کر رو رہی ہوتی ہے اچانک اس ہار کو اپنی گود میں دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ کیونکہ اس نے ایسا بیش قیمت ہار پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس ہار کو چھپا لیتی ہے اور جب وہ اس ہار کو پالیتی ہے تو وہ خوشی سے معمور ہو جاتی ہے اور ہر غم سے آزاد ہو جاتی ہے۔

اس افسانے میں انسانی رویوں کی عکاسی شاندار طریقے سے کی گئی ہے۔ دلہن کے نزدیک ہیرے جواہرات کی کوئی قیمت نہیں اور وہ ایک عام انسان کی موت پر اس قدر غم زدہ ہو جاتی ہے کہ اسے اپنے ہار کے گر جانے کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ دوسری طرف ایک غم زدہ ماں ہے جو اپنے بیٹے کی لاش کے پاس بیٹھی ہے مگر اسے جب ہار مل جاتا ہے تو وہ بیٹے کی موت کو بھی بھول جاتی ہے اور دنیا کے ہر غم سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔

میکسیم گورکی کے افسانہ ''چنگیز خان اور اس کے پوتے کی کہانی'' میں اندھا تاتاری قصہ خواں کہانی کو اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ سننے والے اپنے اردگرد وہی ماحول محسوس کرتے ہیں۔ اندھا تاتاری اپنی کہانی کا آغاز ان لفظوں کے ساتھ کرتا ہے۔ ''صدیاں گزر گئیں ترکستان میں ایک بادشاہ چنگیز خان نامی حکومت کرتا تھا۔ اس کا ایک پوتا بھی تھا جس کا نام ہلاکو خان تھا''۔

چنگیز خان اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے زنان خانے میں مختلف ملکوں کی تین سو کنیزیں تھیں۔ سب اس کی فیاضی اور بہادری کی وجہ سے اس سے بہت پیار کرتی تھیں لیکن چنگیز خان کا دل تمام کنیزوں کی بجائے ایک کاسک کامزہ کی طرف مائل تھا۔ تمام کنیزیں شہزادیوں کی سی زندگی بسر کرتی تھیں۔ چنگیز خان کے دل کو تسلی تھی کہ اس کے بعد اس کا پوتا ہلاکو خان اس وسیع سلطنت کے اقتدار کو قائم رکھ سکے گا۔ جس نے روس پر حملہ کیا تھا اور بے پناہ مال غنیمت، کنیزیں اور مال سمیٹ لایا تھا۔ اس لیے وہ ایک قابل حکمران ثابت ہوگا۔

ایک مرتبہ ہلاکو خان کی روس کی ایک ایسی ہی مہم سے واپسی پر اس کے اعزاز میں ایک شاندار جشن منایا گیا۔ جس میں سلطنت کے دور دراز گوشوں کے خان اور بیگ اس جشن میں شامل ہوئے اور اس میں مختلف قسم کے کھیل کھیلے گئے۔ بوڑھا خان اپنے پوتے کی کامیابیوں پر بہت خوش تھا۔ اس نے اپنے پوتے کی شان میں تعریفی کلمات پڑھے اور کہا ہلاکو بیٹے تم اپنے باپ سے کیا مانگتے ہو۔ تمھاری آرزو پوری کر دی جائے گی۔ ہلاکو خان نے کہا میں وہ کاسک کنیز مانگتا ہوں۔ خان لمحے بھر کے لیے خاموش ہو گیا اور کہا کہ جشن کے خاتمے پر لے سکتا ہے۔ دعوت جلد ہی ختم ہو گئی۔ دونوں محل سے نکل کر زنان خانے کی طرف گئے۔ چنگیز خان نے کہا کہ اس کاسک کنیز کے بدلے ساری کنیزیں لے لے مگر اسے مجھے دے دے۔ ہم عورت کے معاملے میں ہرگز باپ بیٹا نہیں رہ سکتے ہیں۔ عورت کے لیے ہم سب مرد ہیں۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ اس کنیز

کو چٹانوں پر سے دریا میں پھینک دیتے ہیں۔اس کے بعد تینوں خاموشی کے ساتھ جیجوں کی طرف چل دیئے۔تھوڑی دیر بعد جیجوں ان کے سامنے آ گیا اس نے خوفناک شور مچا رکھا تھا۔خان نے اسے پیار سے چوما اور اٹھا کر چٹانوں سے نیچے پھینک دیا مگر کوئی شور کی آواز نہ آئی۔خان نے چٹان سے اپنے آپ کو بھی نیچے گرا دیا جیجوں سے پھر بھی کوئی آواز نہ ابھری۔ ہلاکو خان دیر تک چٹان سے نیچے دیکھتا رہا اور آخر کار بلند آواز میں کہا "غیر فانی دیوتاؤ مجھے بھی ایسا ہی قوی دل دیجیو" وہ رات کی تاریکی میں واپس آ جاتا ہے اور یوں چنگیز خان کا دور ختم ہو جاتا ہے اور ہلاکو خان دیر تک وسط ایشیا اور اس کے مغلوب ملکوں پر خونی حکومت کرتا رہا اور اس کے ساتھ بوڑھے تاتاری قصہ خواں کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچی۔

میکسیم گورکی کے افسانہ ''چنگیز خان اور اس کے پوتے کی کہانی'' کا اسلوب سادہ سلیس اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔مثال کے طور پر

''زندگی کی کتنی راتیں میرے لیے باقی ہوں گی۔میں کتنے دن اور جی لوں گا۔اس دنیا میں میرا بسیرا اب چند روز سے زیادہ نہیں رہ سکتا اور یہ روسی لڑکی میری زندگی کی آخری خوشی ہے۔صرف وہی سمجھتی ہے۔اس کے بعد مجھ سے کون محبت کرے گا؟ ہاں مجھے۔ایک بوڑھے کو۔کون محبت کرے گا؟ ہلاکو! ان سب میں سے کوئی بھی نہیں۔ایک بھی نہیں۔''۳۰

اس افسانے میں ایک المناک پہلو دکھایا گیا ہے کہ عورت ہی اصل فساد کی جڑ ہوتی ہے اور عورت ہی مرد کے لیے تکلیف کا باعث بنتی ہے۔عورت کے معاملے میں باپ باپ نہیں رہتا اور بیٹا بیٹا نہیں رہتا بلکہ عورت کے معاملے میں سب مرد بن جاتے ہیں۔اپنے پرائے کی پہچان بھول جاتے ہیں۔کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ایک سلطنت کو تباہ کرنے کے لیے ایک عورت ہی کافی ہے۔جیسے اس افسانے میں ایک عورت کی وجہ سے دادا پوتا کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑے دکھایا گیا ہے۔ عورت مرد کے لیے ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔عورت اگر حسین ہے تو دوسرے اس پر دست طمع دراز کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور اس کا مالک رقابتوں کی جان میں مبتلا ہو جاتا ہے اور وہ اگر بدصورت ہے تو اس کا شوہر دوسروں کی خوش نصیبی پر رشک کرنے لگتا ہے۔سچ ہے مرد کو عورت سے رنج کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس افسانے میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ بوڑھا دادا اپنے پوتے سے کس قدر محبت کرتا ہے کہ اس کی خاطر اپنی ایسی محبت جو کہ اس کی زندگی ہے اس کی خوشیاں ہے ان کو بھی قربان کر دیتا ہے۔حتیٰ کہ اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے اور دوسری طرف پوتے کی محبت دکھائی گئی ہے کہ وہ اپنے دادا سے بھی بہت محبت کرتا ہے مگر ایک عورت کے لیے وہ اپنے دادا کے جذبات کا خیال نہیں کرتا حتیٰ کہ وہ ایک عورت کی وجہ سے اپنے دادا کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔

مترجم نے ''زندگی کا سانس'' افسانے میں ہندوستانی طبیعتوں میں تصوف اور فلسفے کی ایک جھلک دکھائی ہے اور اس کے ساتھ ایک دوست کی اپنے دوست سے محبت اور پیار دکھایا ہے۔

''شوکمار چپ چاپ آنکھیں بند کیے ہر چیز سے بے خبر لیٹا ہوا تھا۔ پرتاب آیا اور اس کے پاس بیٹھ گیا اور جب وہ اپنے جگری دوست پر جسے وہ بچپن ہی سے محبت کرتا تھا۔ الوداعی نگاہیں ڈال رہا تھا۔ یکا یک اس کے سامنے موہنی کا پیارا پیارا غمزدہ چہرہ آگیا۔ وہ چیخ اٹھا۔ "ہائے! موت بھی کیسے پیارے لوگوں کو آتی ہے جن پر کئی زندگیوں کا دارومدار ہے۔ یہ مجھ ایسے کو کیوں نہیں آتی۔ جس کا کوئی ماتم کرنے والا بھی نہیں۔'' ۳۱

''زندگی کا سانس'' افسانہ میں گنگا کنارے مخملی گھاس پر آم کے درخت کی چھاؤں میں سنیاسی دونو جوانوں کو ساتھ لیے بیٹھا تھا۔ کچھ دور ایک گاؤں آباد تھا، چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیاں نہایت خوب صورت معلوم ہوتی تھیں اور گنگا ان کے سامنے عجیب و غریب سرمست موسیقی سے لبریز بہتری چلی جارہی تھی۔ یہ نظارہ صبح کی دلفریب ہلکی روشنی میں پاکیزگی، امن اور خاموشی کی مکمل تصویر معلوم ہوتا تھا۔ صبح کی اس خاموشی کو سنیاسی نے توڑا۔

''آدمی اور درندے اور پودے اور پھول اور وہ ہر چیز جو اس دھرتی پر موجود ہے سب میں پرماتما نے زندگی کا سانس پھونک رکھا ہے مگر آتما جیسی نعمت صرف انسان ہی کو عطا ہوئی ہے۔ انسان کی فانی زندگی پر آتما کو پورا پورا اختیار ہے بعض پرشوں کی آتما روشن اور پاکیزہ ہوتی ہے اور بعض کے نزدیک مدھم ناتواں اور دھندلی جیسے چراغ کی روشنی تیل کی نسبت سے روشن یا دھندلی ہوتی ہے۔ اسی طرح آتما بھی انسان کی فطرت اور کرم کے مطابق چمکتی ہے۔ جس کی فطرت بے عیب ہے جس کے کرم اچھے ہیں جس کی روشنی پاکیزہ اور منور ہے۔ وہ منش چاہے تو اپنی زندگی کے سانس پر قابو پاسکتا ہے''۔ ۳۲

اتنے میں ایک عورت کی رونے کی آواز نے سنیاسی کو خاموش کردیا وہ عورت ماں تھی جس کا بچہ دو دن پہلے دریا میں ڈوب گیا تھا۔ سنیاسی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پھر اسی انداز میں بولا۔

''مگر یہ غیر فانی آتما، موت کے دروازے میں سے گزرے بغیر بھی تو قید نفس سے آزاد ہوسکتی ہے۔ وہ منش جس کی آتما روشن اور توانا ہے وہ چاہے تو سانس کو کسی اور خاکی جسم میں منتقل کر کے آتما کو اپنے مسکن جاودانی کی طرف جانے کے لیے آزاد کرسکتا ہے۔ میرے بچو! تم تعجب سے میرا منہ تک رہے ہو میں جو کچھ کہہ رہا

ہوں بالکل سچ ہے، عمل میں آ سکتا ہے۔ اگر تم دل جمعی اور مضبوط قوت ارادی کے ساتھ چاہو تو سانس تمہاری اطاعت کرے گا اور ایک ایسے جسم میں منتقل ہو جائے گا جو آخری دموں پر ہو۔ زندگی کا سانس تمہاری مغلوب نہ ہونے والی قوت ارادی کے بل پر کسی دوسرے جسم میں داخل ہو جائے گا اور اس عظیم الشان تیاگ سے تمہاری آتما مکتی کے لیے آزاد ہو جائے گی۔ زندگی کی سیر کا یہ خود اختیاری انتقال جو آتما کے ارادے کے ماتحت ہوتا ہے۔ مردے کو زندہ کر سکتا ہے'' ۳۳

یہ کہہ کر سنیاسی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پہاڑیوں کی طرف چل پڑتا ہے اور دونوں نوجوان اس کو دور تک جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور پھر دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر چل دیئے ان میں سے ایک راجا کا بیٹا شوکمار تھا۔ جو کچھ عرصے سے بیمار تھا اور اس کے چہرے پر جوانی کی شگفتگی کی جگہ وہ پھیکی شگفتگی نظر آتی تھی۔ جو دق کے دائمی مریضوں میں دیکھی جاتی ہے اور دوسرا اس کا ساتھی پرتاب راجا کی فوج کا ایک معزز رکن تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے بالکل بھائی بھائی معلوم ہوتے تھے۔ ہندوستانی طبیعتوں کو تصوف اور فلسفے سے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے۔ نوجوان سنیاسی کی باتوں کو سوچتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ گاؤں کے پاس جنگل کے قریب ایک بنگلے کے پاس رکے جس کے ساتھ ایک خوبصورت باغیچہ بھی تھا۔ برآمدے میں ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی کھڑی تھی جو کہ کسی راج کماری سے کم خوبصورت نہ تھی اس نے صاف چٹائی پر ان دونوں کو بٹھایا اس کا نام موہنی تھا۔ موہنی کی ماں بیوہ عورت تھی ان کے پاس آ کر بیٹھتی ہے اور ان کے لیے گرم دودھ کے دو پیالے لے کر آتی ہے۔ راجکمار نے کہا خالہ آپ کو اماں نے شام کو بلایا ہے اور موہنی کو بھی ساتھ آنے کا کہتا ہے یہ کہہ کر دونوں نوجوان وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے دن صبح کے وقت پرتاب ایک کتاب لینے آتا ہے تو موہنی کی ماں موہنی کی شادی کے متعلق بات کرتی ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے کیونکہ وہ موہنی کو صرف اپنے دل کا چراغ اور جان سمجھتا ہے وہ وہاں سے چلا جاتا ہے قریب ہی ایک کنواں کے پاس سے موہنی کی آواز سنائی دیتی ہے جو کہ اپنی سہیلی یوشا کے ساتھ باتیں کر رہی ہوتی ہے کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔ اس پر یوشا اس سے پوچھتی ہے کہ وہ ایسا کیوں کرے گی تو وہ اسے بتاتی ہے کہ موت کی دلہن اسے بیاہ لے جانے پر تلی بیٹھی ہے جو زیادہ طاقتور ہے اور دنیا کی کوئی دلہن اس پر غالب نہیں آ سکتی۔ یوشا سمجھ گئی کہ یہ راج کمار سے پیار کرتی ہے وہ اسے کہتی ہے کہ وہ تو بیمار ہے اور تم کسی راجکماری سے کم سندر نہیں ہو اور پھر وہ تمہاری ذات کا بھی ہے۔ موہنی کہتی ہے ایسا ممکن نہیں ہے میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں اس سے پریم کرتی ہوں اور اپنی زندگی کو اس کی یادوں کے سہارے گزار دوں گی تم یہ تو جانتی ہو کہ ایک لڑکی کے لیے ایک کو چاہنا اور کسی دوسرے سے بیاہ کر لینا کتنا بڑا پاپ ہے؟ دونوں لڑکیاں خاموش ہو جاتی ہیں، پرتاب یہ سب کچھ سن کر سوچتا ہے کہ موہنی اور شوکمار کی خوشی بھی تو میری ہی خوشی ہے وہ واپس موہنی کی ماں کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ شوکمار کے بارے میں کیا رائے ہے اس کی ماں کہتی ہے کہ وہ تو کچھ

عرصے کا مہمان ہے اور پھر وہ راج کمار ہے اور ہم غریب ہیں۔ پرتاب کہتا ہے اس کا صحت یاب ہونا بہت ممکن ہے آخر جوان ہے۔ اتنے میں موہنی اندر داخل ہوتی تو پرتاب اسے وہ کتاب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ہندی شکنتلا ہے پھر پرتاب واپس گھر آ جاتا ہے۔ برکھارت کے خاتمے پر شوکمار کی صحت زیادہ بگڑ جاتی ہے بوڑھے راجا کا بیٹا بستر مرگ پر پڑا تھا اور اس کو بچانے کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کو تیار تھا۔ ایک روز شام کے وقت راجکمار پرتاب کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے لیٹا ہوا تھا اور اس سے کہتا ہے کہ تو میرا بھائی ہے اور اسی طرح میرے جانے کے بعد میرے بوڑھے ماں باپ کا بیٹا بن کر رہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ میری خواہش ہے کہ تم موہنی سے شادی کر لو مدت ہوئی میں نے وہ سپنا دل سے نکال رہا ہے مگر مرنے سے پہلے مجھے یہ دیکھ کر تسلی ہوگی کہ وہ میری نہ سہی مگر وہ تمہاری تو ہے۔

تین دن بعد سب کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ پرتاب اپنے دوست کا آخری دیدار کرنے کے بعد اسے وہی سنیاسی اپنے قریب محسوس ہوا اور پھر اس کے وہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجے۔ اگر تو دل جمعی اور مضبوط قوت ارادی کے ساتھ چاہے تو تیرا سانس تیری اطاعت کرے گا اور ایک ایسے جسم میں منتقل ہو جائے گا۔ جس کا سانس ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہا ہو۔ پرتاب چپ چاپ اٹھا اور محل سے باہر آ گیا اور اسی جگہ آم کے پیڑ کے نیچے جا ٹھہرا اور درخت کے تنے کی طرف جھکتا ہوا سر سبز نرم گھاس پر بیٹھ کر پرارتھنا کرنے لگا کہ "اے گرو! میری مدد کو آؤ" پھر آنکھیں موند کر آسن جما لیا اور پرانے زمانے کے رشیوں کی طرح سادھی لگا کر ساکت بیٹھ گیا۔

شوکمار اپنے بستر پر مردہ حالت میں پڑا ہوا تھا اور جب اس کی ماں کو اس سے پیچھے ہٹایا گیا تو اچانک شوکمار کے ہونٹوں سے آہ سے لبریز ایک گہرا سانس نکلا۔ اس کا جسم لرزنے لگا اور آنکھیں کھول دیں اور جب اسے سب مردہ سمجھ چکے تھے اس کا زندہ ہونا سب کے لیے بہت بڑی خوشی تھا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا مگر پرتاب نظر نہ آیا اور پھر پرتاب کو ڈھونڈنے کے لیے آدمی بھیجے گئے مگر وہ مراقبہ کی حالت میں تھا اور جب اس کو چھوا گیا تو اس کا جسم مردہ حالت میں چپ چاپ زمین پر گر پڑا۔

اس افسانے میں دو پہلو نظر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہندوستانی طبیعتوں کو تصوف اور فلسفے سے ہمیشہ ایک لگاؤ رہا ہے اور یہ کہ پرتاب کو اس سنیاسی کی باتوں پر اتنا یقین دکھایا گیا ہے کہ دوست کی موت کے وقت اس نے سنیاسی کی کہی ہوئی باتوں پر عمل کر کے زندگی کو موت اور موت کو زندگی کے ساتھ بدل دیا تھا۔

دوسرا اس افسانے میں ایک دوست کے ساتھ دوستی اور پیار کو دکھایا گیا ہے کہ وہ جس لڑکی کے ساتھ پیار کرتا ہے اس کے منہ سے اپنے دوست کا نام اور اس سے پیار کے بارے سن کر اس کو دکھ ہونے کی بجائے یہ سوچ کر کہ ان دونوں کی خوشی میری خوشی ہے۔ خاموش ہو جاتا ہے اور یہ کہ دوست کو مرتے ہوئے دیکھ کر اس نے اپنی زندگی کا سانس اپنے پیارے دوست کو تحفے کے طور پر نذر کر کے دائمی مکتی حاصل کر لی تھی۔ اس نے موت کو زندگی اور زندگی کو موت کے ساتھ بدل دیا تھا۔

سچ ہے دوست وہ جو مصیبت میں دوست کے کام آئے۔

مصنف سنہالتا سین نے ''بربطی مغنی'' افسانے میں تصوارتی نوعیت کی کہانی بیان کی ہے۔

''میری نظریں اس ساز پر پڑتے ہی نا معلوم کیوں الجھ کر رہ گئیں میں اسے کھڑا گھورر ہا تھا۔اور اپنے بدن میں ایک عجیب جھر جھری سی محسوس کر رہا تھا۔ مجھے سارنگی لرزتی نظر آرہی تھی۔اور پھر ایک دھیمی سی آہ سنائی دی۔جیسے کوئی کسی کے کان میں کہہ رہا ہو۔ مجھے لے چلو۔ مجھے لے چلو'' ۳۴

''بربطی مغنی'' اس افسانے میں جو شخص کہانی بیان کرر ہا ہے۔وہ کہتا ہے اس کی بیوی اور بچے فوت ہو گئے ہیں۔ اور وہ ۳۵ سال کی عمر میں خانہ بدوش ہو کر پھرنے لگا۔اس کا واحد سہارا سارنگی تھی۔ایک شام جمنا کے کنارے اس نے ایک بلند بالا بزرگ کو اپنے قریب پایا۔وہ بزرگ سارنگی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔اور بولا کہ تم سارنگی خوب بجاتے ہوئے ایسے نغمے برسوں سے نہیں سنے۔تمھاری میٹھی تانوں نے آج اس کے یاد کے بند دروازے کھول دیئے۔اس نے اپنا نام بربطی بتایا۔اس راگ نے ماضی کے واقعات کو میرے آنکھوں کے سامنے لا کر رکھ دیا ہے۔بربطی نے اپنی کہانی سنانی شروع کی۔ کہ وہ جوانی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے محل کے درباری لوگوں میں سے تھا۔ضعیف العمر مہاراجہ کے انتقال کے بعد رانی چاند کور تخت نشین ہوئی۔اس کے طائفے کا سردار جانکی تھا۔سارے پنجاب میں بے اطمینانی اور بغاوت پھیلی ہوئی تھی۔ہولی کا تہوار چار راتوں تک منایا گیا۔پانچویں رات ایک سوار نے خبر دی کہ سر گباشی مہاراجہ کے پرانے سپاہی شہر میں داخل ہو گئے ہیں۔بچاؤ کا انتظام کرنے سے پہلے ہی سپاہیوں نے محل کو گھیرے میں لے لیا۔محل کے ایک احاطے میں ایسے کمرے تھے جن کو لوگ بھاری کمرے کہتے تھے۔رات کے وقت عجیب عجیب آوازیں آتی اور راگ سنائی دیتے تھے۔سکھ سپاہی محل کے ہر گوشے میں گھس گئے۔وہ ان کمروں کی طرف لپکا اس کا ارادہ تھا کہ کسی کمرے کے دروازے کو توڑ کر کھڑکی کی راہ سے باغ میں کود پڑوں گا۔ایک دروازے پر اس کو لفظ رضیہ کنندہ دکھائی دیا۔وہ کمرے میں داخل ہوا۔لکڑی کی کھونٹیوں پر کچھ زنانہ کپڑے آسمانی قرمزی موتیا اور بادامی رنگ کے دوپٹے جیسے کہ عموماً ناچنے والی اوڑھا کرتی ہیں۔آویزاں تھے۔ایک سارنگی اور گز پر نظر پڑتے ہی اس کے جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی اس نے سارنگی اتار لی اور بھاگ گیا۔اس پر رضیہ اسیر لکھا ہوا تھا۔اس نے گز کو سارنگی پر چلایا تو سارنگی کی تاروں سے ایک پراسرار نغمہ نکلنے لگا۔وہ رات کے وقت گھر پہنچا۔جب وہ سونے کے لیے چلا تو اسے وہی پہلے والی جھرجھری محسوس ہوئی۔اس نے گز کو سارنگی کی تاروں پر چلانا شروع کر دیا۔وہ کئی راتوں تک اسے بجاتا رہا۔اس کے والد نے اس سے آدھی آدھی رات تک سارنگی بجانے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ درباری

عادت میں سے ایک ہے۔اس نے اپنے باپ سے رضیہ کے متعلق پوچھا۔اس کے باپ نے بتایا کہ اس وقت تم دو سال کے بھی نہ تھے جب مہاراجہ رنجیت سنگھ جوان تھے۔ان کے دربار میں مشہور جادوگر پشاورا آیا۔وہ اپنے ساتھ ایک باندی دوشیزہ رقاصہ لایا۔مہاراجہ کے درباری چھوٹے بڑے سب اس پر فریفتہ تھے۔ایک بڑا نامی راجپوت سردار اس کا بے حد آرزومند تھا۔اس کی ہر چند کوشش تھی کہ جادوگر اسے بیچ دینے پر آمادہ ہو جائے مگر وہ ناکام رہا۔ایک روز رضیہ اچانک گم ہو گئی۔اور وہ راجپوت محل کے صحن میں مردہ پایا گیا۔پشاورا جادوگر لاہور سے چلا گیا۔اس وقت سے موسیقی کی پراسرار آوازیں اور گریہ داری کی صدائیں رضیہ کے کمرے سے آنے لگیں۔یہ حکایت رضیہ کے متعلق مشہور ہے۔بربطی کہنے لگا وہ آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔وہاں جا کر یہی گویوں کا پیشہ اختیار کیا۔اس کا دل بے چین تھا۔ایک رات اس ساز میں سے زخمی پرندے کی چھبتی ہوئی چیخ نکلی۔آگرے کے لوگ سرگوشیاں کرنے لگے کہ بربطی مغنی جادوگر ہے۔اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔اور اسے آگرہ چھوڑے تین سال ہو گئے۔وہ سارنگی ہاتھ میں لیے خواب کی سی کیفیت میں دریا کے کنارے چلتا رہا۔کئی راتیں جاگتے رہنے کی وجہ سے وہ منہ کے بل گر پڑا اور سارنگی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ایک مدھم سے گہری آہ سنائی دی۔اس نے سر اٹھا کر دیکھا ایک حسین دوشیزہ کا نہایت ہی خوبصورت اور براق کا سا بلوری "انگارہ" چاند کی روپہلی کرنوں پر تیر رہا تھا۔یہ صرف ایک جھلک تھی۔دیکھتے ہی دیکھتے یہ روحانی شکل چاند کی ملائم روشنی میں تحلیل ہو گئی۔شکستہ سارنگی کے ٹکڑوں میں ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا۔جس پر یہ الفاظ درج تھے۔''رضیہ تجھے اپنے گناہ کی اس طرح سزا ملی'' یہ تھی میری کہانی۔

اس کے بعد بربطی خاموش ہو گیا اور آخر کار میں نے کہا اے نامدار مغنی یہ رضیہ کی آزادہ اور جادو کے متعلق جو کچھ تم نے سنایا ہے میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔بربطی مغنی کہیں غائب ہو گیا میں چونک پڑا جیسے خواب دیکھ کر اٹھا ہوں میرے کپڑے اوپر سے تر تھے اور چاند کی کرنیں جمنا کے نغمہ ریز سکوت میں سو رہی تھیں۔

اس افسانے میں خیالوں اور خوابوں کی دنیا دکھائی گئی ہے۔حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا یہ محض خیال ہیں۔انسان بیٹھے بیٹھے کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتا ہے افسانے میں جب کہانی بیان کرنے والے شخص نے بربطی کو یہ کہا کہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا تو اس نے جواب دیا۔یہ وہ جادو ہے جو کبھی کبھی دنیا میں نظر آتا ہے۔ناشاد روح جو دنیاوی خواہشات میں جکڑی ہوئی کے موسیقی کے زور سے اپنا دامن جھٹک کر عالم بالا چمک جا پہنچتی ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے افسانہ ''شکست کی فتح'' میں دو شاعروں کا مقابلہ دکھایا ہے اور اصل میں شکست کی فتح کا سامنا شاعر شیکھار کو کرنا پڑتا ہے۔

> ''یہ گھٹتے ہوئے چاند کی ایک تاریک رات تھی۔ شاعر شیکھار نے طاق پر سے مسودات اٹھائے اور فرش پر پھیلا دیئے۔ ان میں سے کچھ اس کا ابتدائی کلام تھا۔ جس کو وہ فراموش کر چکا تھا۔ وہ ادھر ادھر اوراق پلٹتا رہا اور ادھر ادھر نظمیں پڑھتا رہا لیکن سب اسے حقیر نظر آئیں لفاظی اور طفلانہ بحریں۔ یکے بعد دیگرے اس نے تمام مسودے چاک کر ڈالے۔''۳۵

''شکست کی فتح'' افسانے میں راج کماری اجیتا کہلاتی تھی۔ راجہ نارائن کے درباری شاعر نے اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جس دن وہ کوئی نیا گیت راجہ کو سناتا تو اپنی آواز اتنی بلند کر دیتا کہ پردے کرنے والیاں جو بالائی پردہ دار جھروکوں میں ہوتیں اس کے نغموں سے لذت اندوز ہو جاتیں۔ وہ اس نغمے کو ستاروں کی اس دنیا تک پہنچا دیتا جو اس کی پہنچ سے پرے تھے۔ وہ پردے کے پیچھے کسی لرزتے ہوئے سائے کا سراغ لگاتا۔ دور سے صدائے دور اس کے کانوں تک پہنچتی اور وہ اس پاؤں کا تصور باندھتا جس کے سنہری پازیب ہر ہر قدم پر یہ موسیقی بھری آواز پیدا کرتے۔ اس کے دل میں کبھی شک بھی پیدا نہ ہوا کہ پردے کے پیچھے لرزتا ہوا سایہ کسی اور کا ہو سکتا ہے اور پازیب کے نغمے جو اس کے دل کی دھڑکن کے ہمنوا تھے کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔ راج کماری کی ایک سہیلی منجری ندی کو جاتے ہوئے شاعر کے مکان کے سامنے گزرتی۔ شام کو بے حجابانہ اس کے کمرے میں داخل ہوتی اور قالین کے ایک کونے پر بیٹھ گئی وہ اپنے نقاب کے رنگنے اور بالوں میں پھول لگانے میں زیادہ توجہ اور حسین مذاق سے کام لے رہی تھی۔ لوگ مسکرا مسکرا کر چہ میگوئیاں کرتے لیکن وہ الزام سے بری تھے کیوں کہ شیکھار کبھی اس امر کو چھپانے کی زحمت گوارا نہ کرتا۔ لفظ منجری کے معنی ''پھولوں کا ہار'' ہے۔ لیکن شاعر نے اپنی طرف سے اور الفاظ ملا کر اس کے نام کی قیمت بڑھا دی ہے۔ یعنی وہ اس کو ''بہاریں پھولوں کا ہار'' کہا کرتا تھا۔ شاعر نے فردوسی گیتوں میں نئے گلہائے بہار کے ہاروں کا گیت دُہرا دُہرا کر اور لہرا لہرا کر پڑھا کرتا تھا۔ راجہ پر معنی انداز سے مسکراتا اور شاعر بھی مسکرا دیتا۔ راجہ پوچھتا ''کیا مکھی کا یہی کام ہے کہ وہ بہار کے دربار میں بھنبھایا کرے؟

شاعر جواب دیتا نہیں بلکہ بہار کے پھولوں سے شہد بھی چوسے اور پھر راجہ کے دربار کے تمام حاضرین قہقہہ لگاتے اور شہزادی شاعر کے انتخاب نظر پر اپنی سہیلی منجری کی طرف دیکھ کر مسکراتی اور وہ خوش ہو جاتی۔ شاعر کے گیت ہر زبان پر تھے چاند کی خالص روشنی میں موسم گرما کی آہستہ خرام ہوا میں اس کے گیت کھڑکیوں میں، کشتیوں میں، آنگنوں میں، درختوں کے سائے میں ان گنت زبانوں سے گاتے جاتے دن خوشی سے گزرتے گئے۔ شاعر گاتا رہا اور راجہ سنتا رہا اور درباری داد دیتے رہے اور پردے کے پیچھے سے پنہاں سایہ لرزتا رہا۔

اسی زمانے میں ایک اور شاعر جنوب سے ادبی فتوحات کے لیے نکلا وہ امر پور میں راجہ نارائن کے دربار میں بھی آیا اس کے راجا کی تعریف میں قصیدہ سنایا۔ راستے میں تمام راجاؤں کے درباری شعرا کو وہ مات دے چکا تھا۔ راجا نے اس کو خوش آمدید کہا۔ پندارک (جنوب کے شاعر) نے راجا سے کہا کہ میں آپ کے درباری شاعر سے ادبی جنگ کا خواہاں ہوں۔ شیکھار (درباری شاعر) نہیں جانتا تھا کہ تخلیات کی لڑائی کیا چیز ہے۔ رات بھر اس کو نیند نہ آئی۔ دھڑکتے ہوئے دل سے شیکھار صبح کو دربار میں پہنچا۔ تماشا گاہ ناظرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ راجا سفید لباس پہنے دربار میں آیا۔ پندراک کھڑا ہو گیا اور راجا کی شان میں ایک قصیدہ سنانا شروع کیا اور سامعین کے دماغوں کو متحیر کر رہے تھے۔ انتہائی لطافت سے اس نے لفظ نارائن کے مختلف معنی بیان کیے ان کو شعروں کی لڑیوں میں پرَو دیا۔ حاضرین پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ راجہ نے شیکھار کی طرف نظر ڈالی اور شیکھار نے ذرا سی چھیڑ سے موسیقی کے دریا بہا دیئے اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ چند پہلے شعر تو سنائی بھی نہ دے سکے۔ اس نے ماضی کے دھندلکے سے راجہ کے خاندان کی داستان شروع کی اور پھر سخاوت و بہادری کے قصے سناتے ہوئے اپنی داستان شروع کی اور پھر سخاوت و بہادری کے قصے سناتے ہوئے اپنی داستان زمانہ حال پر لا کر ختم کر دی بیٹھنے سے قبل اس نے آخری الفاظ گائے ''میرے آقا! الفاظ کی جنگ میں میرا ہار جانا ممکن ہے مگر تیری محبت میں ہارنا ناممکن''۔

سامعین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ پندارک اٹھا اور مجمع سے سوال کیا۔ ''لفظ سے بہتر بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے''؟ ایک لمحہ کے اندر ہال میں خاموشی طاری ہو گئی اور اس نے عالمانہ اور ناقدانہ نقطہ نظر سے ثابت کر دیا کہ لفظ ہی ازل ہے اور لفظ ہی خدا ہے۔ اس نے الہیات کی مختلف کتابوں کے حوالے دے کر لفظ کو دینا اور آسمان کی بہترین چیز قرار دیا اور پھر اپنا سوال دہرایا ''کیا لفظ سے بہتر بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے؟ کوئی بھی اس کے مقابلے کی جرأت نہ کر سکا۔ پنڈت بولے ''شاباش'' اس دن مجلس برخاست ہو گئی۔ دوسرے دن شیکھار نے اپنا گیت شروع کیا جس میں وہ سماں تھا۔ جب بندرابن کی خاموش فضا میں سپریم کی بانسری پہلا گیت الاپ رہی تھی۔ شیکھار پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو گیا اس کو اس کا بھی خیال نہ رہا کہ وہ اپنے حریف کے مقابل کھڑا ہوا وہ اپنا ''نغمہ نے'' گا رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک صورت کا تصور تھا۔ وہ صورت جس کا تصور اس نے صرف ایک سائے، پازیب کی جھنکار اور ایک دور دراز قدم کی چاپ سے باندھا تھا اور وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ سامعین غم و خوشی میں بے خود ہو گئے یہاں تک کہ داد دینا بھی بھول گئے۔ پندراک تخت کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنے مخالف سے سوال کیا یہ ''عشق و معشوق'' کون ہیں۔ اس نے فاتحانہ انداز سے چاروں طرف دیکھا اور پھر سوال کیا کرشن کون تھے؟ اور رادھا کون تھے؟ پھر اس نے الفاظ کی تشریح شروع کی اور ان کے مختلف معانی کی تصریح کی۔ پھر تصویر کا دوسرا رخ اس خوبی سے دکھایا کہ وہ انتہائی اچھوت معنوں میں نظر آنے لگے۔ پنڈت بے انتہا خوش ہوا اور دل کھول کر داد دی۔ اب سامعین کی نظروں میں ان کا شاعر اس عظیم الشان عالم کے سامنے جو ہر قدم پر تخیلات اور الفاظ کی گتھیوں کو اس خوبی سے سلجھا رہا تھا۔ طفل مکتب سے بڑھ کر نہ تھا۔ پہلی بار ان کو احساس ہوا کہ شیکھار کی نظمیں نہایت سادہ تھیں۔ راجہ نے تیز نظروں سے

اپنے شاعر کو ترغیب دلائی کہ آخری کوشش کرے مگر شیکھار نے کوئی توجہ نہ دی اور اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا رہا۔ راجا غصے سے اٹھا اور گلے سے موتیوں سے کی مالا اتار کر پندراک کے گلے میں ڈال دی۔ تالیاں بجیں، سنہری پازیب کی جھنکار سنائی دی۔ شیکھار اٹھا اور دربار سے نکل گیا۔ شاعر شیکھار نے طاق پر سے مسودات اٹھائی اور فرش پر پھیلا دیئے۔ ادھر ادھر نظمیں پڑھتا رہا لیکن سب اسے حقیر نظر آئیں۔ لفاظی اور طفلانہ بحریں یکے بعد دیگرے اس نے تمام مسودات چاک کر ڈالے رات گزر گئی۔ شیکھار نے کھڑکیاں کھول دیں اس نے بچھونے پر اپنے محبوب سفید پھول پھیلا دیئے۔ چنبیلی، موتیا اور بیلے کے پھول اور پھر گھر میں جتنے چراغ تھے سب جلا دیئے۔ پھر کسی زہریلی جڑ کا عرق شہد کے ساتھ ملا کر پی گیا اور سو گیا۔ سنہری پازیبوں کی جھنکار سنائی دی اور ہوا کے جھونکے کے ساتھ بھینی بھینی خوشبو کمرے میں داخل ہوئی۔ شاعر نے آنکھیں نہ کھولیں مگر سوال کیا؟ میری شہزادی آخر اپنے غلام پر ترس کھا کر آخر وقت اس کو دیکھنے آ ہی گئی۔ شہزادی نے کہا میرے شاعر میں آ گئی۔ شاعر کی نظر مدھم اور چندھیائی ہوئی تھی۔ عورت نے کہا میں راجکماری اجیتا ہوں۔ وہ بڑی مشکل سے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شہزادی نے اس کے کان میں کہا راجہ نے تمہارے ساتھ ناانصافی کی۔ میرے شاعر تم کو جنگ میں فتح ہوئی ہے اور میں تم کو فتح کا تاج پہنانے آئی ہوں۔ شہزادی نے اپنے گلے سے پھولوں کا ہار اتار کر شاعر کے گلے میں ڈال دیا اور شاعر بستر پر بے جان ہو کر گر پڑا۔

اس افسانے میں ایک شاعر کی ان دیکھی محبت دکھائی گئی ہے کہ وہ ایک سائے سے محبت کرتا ہے جب وہ راجا کے دربار میں اپنے گیت گاتا ہے تو پردے کے پیچھے سے سایہ دیکھتا ہے جس کے پاؤں کا تصور باندھتا ہے اور جس کے سنہری پازیب ہر ہر قدم پر یہ موسیقی بھری آواز پیدا کرتے۔ آہ! وہ گلابی پاؤں جو زمین پر اس طرح پڑتے جس طرح رحمت ایزدی گنہگاروں پر نازل ہوتی ہے۔ شاعر نے اپنے دل کے ہر دوار میں انہی مورتیوں کو جگہ دی تھی۔ جہاں اس کے نغمے زریں پازیبوں کے ہم نوا ہوئے۔ شاعر کے دل میں ایک صورت کا تصور تھا وہ صورت جس کا تصور اس نے صرف ایک سائے، پازیب کی جھنکار اور ایک دور دراز قدم کی چاپ سے باندھا تھا اور آخری وقت میں اسے وہی پازیبوں کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ راج کماری اجیتا اس کے پاس آتی ہے اور کہتی ہے میرے شاعر میں آ گئی تم کو جنگ میں فتح ہوئی ہے اور میں تم کو فتح کا تاج پہنانے آئی ہوں۔ شہزادی نے اپنے گلے سے پھولوں کا ہار اتار کر شاعر کے گلے میں ڈال دیا۔ جبکہ پندراک شاعر اس شاعر شیکھار سے ادبی مقابلہ لگاتا ہے۔ وہ لفظوں میں اس کو مات دے جاتا ہے جبکہ شیکھار دل و جان سے راجا سے محبت کا اظہار کرتا ہے اور راجا نارائن پندراک کو موتیوں کی مالا پہنا دیتا ہے جبکہ اصل شکست کی فتح شاعر شیکھار کو ہوتی ہے۔

مصنف مورس لیول نے ''وہ بدمعاش مرن'' افسانے میں ایک مصور کی کہانی بیان کی ہے۔ جس کو احساس ندامت ہے۔ اس افسانے کا اسلوب سادہ، سلیس، رواں اور خوبصورت انداز بیان ہے۔ مثال کے طور پر

''یعنی تم یہ تو قطعی سمجھتے ہو گے لہ میں پہلی ہی تصویر کا زیادہ معاوضہ ادا نہیں کر سکتا۔ لوریٹ اور مرن کے کام کا فرق سمجھتے سمجھتے بھی لوگوں کو کچھ عرصہ لگ جائیگا۔ پھر کئی خریدار رہنمائی بھی چاہتے ہیں۔ وہ علیحدہ بات ہے کہ انجام کار مرن کی تصویریں طاق نسیان کے حوالے ہو جائینگی۔''۳۶

اس افسانے ''وہ بدمعاش مرن'' میں مرن نامی شخص ایک بدصورت عورت سے پیار کرنے لگا۔ اس کی وجہ سے مرن نے اپنے دوستوں سے تعلق ختم کر دیا پہلے وہ محض فن کا کمال ظاہر کرنے کے لیے مصوری کرتا تھا۔ مگر اب ارزل ترین تصاویر بنانے لگا۔ ایک شخص جو کسی زمانے میں اس کا اچھا دوست تھا اس کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا مگر مرن کو غصہ آ گیا اور بولا اب پیٹ بھر کھانا تو مل جاتا ہے۔ اور مالی پریشانیوں سے محفوظ ہوں اتنے میں ہی خوش ہوں۔ مرن نے جھوٹ بولا وہ خوش نہ تھا۔ پہلے پہل محبت نے اس کو ہر چیز سے بے نیاز کر دیا۔ اسے زائد پیسے کی ضرورت پڑی۔ اس نے با تصویر اخباروں میں قلم برداشتہ چھوٹی موٹی تصاویر بنانی شروع کر دی تھیں۔ قرض بڑھتا گیا اور آخر کار قرض خواہوں کی دھمکیوں اور محبوبہ کے جھگڑوں سے عاجز آ کر اس نے ایک ایسا چیک لکھ ڈالا۔ جس کا روپیہ ادا کرنے کی توفیق نہ رکھتا تھا۔ اسے امید تھی کہ چیک بینک میں پیش ہونے سے پہلے روپیہ جمع کر لے گا۔ مگر نہ کر سکا اور ڈر کے مارے وہ پیرس اور فرانس سے بھاگ نکلا۔ اس کی محبوبہ نے اس کے ساتھ بے وفائی کی۔ اس نے عزم کیا کہ واپس پیرس جا کر گرفتاری دے دے اور یوں مناسب اپنے کیے کی سزا مل جائے گی۔ پھر اس نے سوچا کہ انسان اپنے بچاؤ کی کوشش تو اس وقت کرتا ہے۔ جب اس کے پاس بیوی، بچے یا والدین اور دوست ہوں مگر میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے ایک اخبار میں جلی قلم میں ایک عنوان لکھا دیکھا "ایک مصور غائب ہو گیا" وہ بار بار یہ طویل مضمون پڑھتا رہا۔ اس نے خود کو کمرے میں بند کر دیا۔ کچھ عرصے بعد یہ خبر دم توڑ گئی۔ اور خاموشی ہو گئی۔ اب اس نے خود کو تنہا محسوس کیا۔ اس کی ظاہری حالت خراب ہو چکی تھی۔ اس نے روپیہ کمانے کے لیے ہر طرح کے کام کیے۔ اس نے سوچا کہ وہی شخصیت اپنائے یا پھر نئی شخصیت اختیار کرے۔ اس کے پاس تھوڑی سی پونجی جمع ہو گئی اور اس نے تصاویر کے خاکے بنانے شروع کر دیئے۔ جہاں جگہ ملی بنا دیا۔ اس نے جب سو فرینک جمع کر لیے تو ریل کے ذریعے فرانس واپس آ گیا۔ اس نے نئے مصوروں کی تصویریں دیکھی۔ جن کو وہ نہیں جانتا تھا۔ اور دل ہی دل میں بولا میں ان سے بہتر کام کر سکتا ہوں۔ اس نے تصویر کے نیچے لوریٹ نام لکھا۔ اس نے تصویر کو بیچنے کے لیے دکان پر گیا۔ دکاندار نے تصویر دیکھ کر کہا، وہ بدمعاش مرن یاد آ گیا وہ اس قسم کا کام کرتا تھا۔ ویسے یہ اس سے دس گنا بہتر ہے۔

دکاندار نے اس سے کہا میں تمھاری تصوریں بیچ دوں گا۔ دو سال میں تم بہت مشہور ہو جاؤ گے۔ مرن نے اپنی حقیقی شخصیت کو چھپانے کے لیے لوریٹ نام کا سہارا لیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ایک خریدار دکان پر آ کر مرن کی تصویر مانگتا ہے تو دکاندار اسے مرن کی تصویر کی بجائے لوریٹ کی تصویر دکھاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی تصویروں سے بہت بہتر تصویریں کیوں نہ لیں؟ اس خیال کی تاب نہ لا سکا اس نے اپنی تصویر واپس لے لی اور تصویر کو گاڑی کے آگے پھینک دیا۔ تصویر سے گاڑی گزرتے ہی کپڑا پھٹ گیا۔ مرن واپس دکان کی نمائشی الماریوں پر پہنچا اور اس کی تصویر ایک اعزازی مقام پر آویزاں تھی۔ جس پر اس کا نام مرن لکھا تھا وہ دیر تک کھڑا ایسی نظروں سے تکتا رہا کہ ماضی کے دنوں کی باتیں یاد آتی رہیں۔ وہ جانے کے لیے مڑا تو ایک آنسو اس کے رخسار سے بہہ رہا تھا۔

اس افسانے میں ایک شخص کی احساس ندامت دکھائی گئی ہے کہ وہ پہلے محض فن کا کمال ظاہر کرنے کے لیے مصوری کیا کرتا تھا مگر ایک عورت کی محبت میں وہ اس قدر بڑھ گیا کہ ہر چیز سے بے نیاز ہو گیا اور اس نے باتصویر اخباروں میں قلم برداشتہ چھوٹی موٹی تصاویر بنانی شروع کر دیں۔ قرض بڑھ گیا اس کو پیرس اور فرانس چھوڑنا پڑا۔ حتیٰ کہ اس کی محبوبہ نے بھی اس کو چھوڑ دیا۔ وہ بالکل اکیلا ہو گیا تب اس کو احساس ہوا کہ وہ تنہا ہے اور ماضی کے دنوں کی یاد اس کو بہت ستاتی تھی۔ تب اس کو ندامت کا احساس ہوا اور اس نے گرفتاری دینی بھی چاہیے مگر شرم اور خودداری نے روک دیا۔ پندرہ برس وہ اسی احساس میں رہا۔ آخر وہ واپس چلا گیا اور اس نے تصویر بنائی مگر اپنی اصلی پہچان کو چھپانے کے لیے اس نے ایک اجنبی نام لوریٹ کا سہارا لیا۔ اسے اپنے نام سے اپنے کام سے پیار تھا مگر وہ کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کی اصلی پہچان کیا ہے اور ایک دھوکے کے ساتھ وہ جینا بھی نہیں چاہتا تھا اس نے دکان پر مرن کے کام کی تعریف سنی تو بجائے خوش ہونے کے وہ غمگین ہو گیا اور پچھتانے لگا اس نے اپنی نئی بنائی ہوئی تصویر سڑک پر پھینک دی اور اس کے اوپر سے گاڑی گزر گئی۔ وہ واپس دکان پر جا کر اپنی تصویر کو دیکھتا رہا۔ جس پر مرن نام لکھا ہوا تھا۔ وہ ایسی نظروں سے تکتا رہا۔ جن میں لوچ جھلک رہا تھا ۔گزرے دنوں کی باتیں ایسے یاد آتی رہیں اور آنکھوں میں پچھتاوے کے آنسوؤں کے سوا کچھ نہ تھا۔ زندگی میں انسان بعض اوقات ایسی غلطیاں کر جاتا ہے جس کے لیے بعد میں اسے بہت پچھتانا پڑتا ہے۔ بعض اوقات اپنی اصلی پہچان کو چھپانا پڑتا ہے تب پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں رہتا ہے۔ سچ ہے اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

مصنف نے ''انوکھا انتقام'' افسانے میں باپ کی انوکھی محبت دکھائی ہے۔ یہ افسانہ تصوراتی نوعیت کا ہے۔ اس افسانے کا اسلوب سادہ اور دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر

''عدالت کے حکم کے مطابق مدرسے کی تلاشی لی گئی اور ایک الماری طرح طرح کی مٹھائیوں سے بھری ہوئی مل گئی۔ یہ مٹھائیاں بچوں کے لیے مخصوص تھیں۔ معائنے سے ظاہر ہوا کہ ان مٹھائیوں میں یا تو شیشے کا باریک چورا تھا۔ یا سوئیوں کے کوٹے ہوئے بہت ہی ننھے ننھے ٹکڑے۔'' ۴۷

''انوکھا انتقام'' افسانے میں لوگ انگیٹھی کے پاس بیٹھے پر انجینی والے مقدمے کا تذکرہ کر رہے تھے کہ مور سیلو میلور جو کسی زمانے میں سرکاری وکیل تھا ایک اور مقدمہ جو اپنی نوعیت میں بہت ہی عجیب تھا سنانے لگا کہ میں ان دنوں مضافات میں سرکاری مجسٹریٹ تھا، دیہات کا کام پیرس سے کچھ کم دلچسپ نہ تھا۔ میرے والدان دنوں پیرس کے بہت مشہور جج تھے ان کی وجہ سے موائرن کا مقدمہ میرے سپرد ہوا تھا۔

موسیلو میلورا بولا کہ موائرن شمالی فرانس میں مدرس تھے بے حد تعلیم یافتہ اور اعلیٰ درجے کے مہذب تھے لوگ ان کا بے انتہا احترام کرتے تھے۔ موائرن کے تین بچے تھے اور تینوں بچے دق کا شکار ہو گئے۔ وہ اپنے بچوں کی موت کا بدلہ اپنے شاگردوں سے لینے لگا۔ ان کو بے حد پیار کرتا۔ ان کو کھانا کھلاتا اور انہیں مٹھائیاں اور کیک دیتا اور ہر شخص موائرن کی بہت عزت کرتا تھا۔ ہر شخص نے اس وقت صدمہ محسوس کیا جب اس کے پانچ شاگردوں کو یہی مرض لاحق ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ پانی کی کمی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ اس کے بعد سال تک ایسا کچھ نہ ہوا۔ ایک سال بعد موائرن کے دو شاگرد کچھ روز بخار میں مبتلا ہو کر چل بسے۔ پوسٹ مارٹم سے پتہ چلا کہ معدے اور انتڑیوں کے اندر سے کچلا ہوا شیشہ نکلا۔ اگر موائرن کی خادمہ بیمار نہ ہوتی تو معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔ اس نے بتایا کہ اس نے موائرن کی الماری سے مٹھائی چوری کر کے کھائی تھی۔ عدالت کے حکم سے مدرسے کی تلاشی لی گئی۔ الماری میں طرح طرح مٹھائیاں موجود تھیں۔ ان کا معائنہ کرنے سے پتہ چلا کہ ان کے اندر شیشے کا باریک چورا تھا یا سوئیوں کے کوٹے ہوئے بہت ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔ موائرن کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور اس کے خلاف ثبوت جمع کرنے لگے۔ پسے ہوئے شیشے سے بھری ہوئی ڈبیہ اس کے میز کے اس خانے سے نکلی جہاں وہ روپیہ رکھتا تھا۔ موائرن نے اپنے بیان میں کہا کہ یہ اس کے کسی دشمن کی مکاری ہے۔ ایک دن سان فاریو سوداگر آیا اس نے بیان دیا کہ موائرن نے باریک سوئیاں خریدی تھیں۔ موائرن کو پھانسی کا حکم ہو گیا۔ جیل خانے کا پادری موسیلو میلورا کسے پاس آیا اور اس نے کہا کہ اگر موائرن کو پھانسی دی گئی تو یہ ایک بے گناہ کا خون ہوگا۔ موسیلو میلورا نے شہنشاہ سے ملاقات کی نپولین ثالث اور ملکہ دونوں نے موائرن کا واقعہ اول سے آخر تک سنا۔ شہنشاہ نے موائرن کی سزا معاف کر دی۔ کچھ عرصے بعد پتا چلا کہ جیل خانے کے گورنر نے اسے اپنے گھریلو کاموں پر لگا لیا۔ اور اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہ ملی۔

گرمی کے موسم میں موسیلو میلورا اپنے عزیز کے ہاں مقیم تھا۔ ایک پادری نے اسکو دریافت کرتے ہوئے کہا کہ ایک شخص نزع کی حالت میں ہے اور اس کو ملنا چاہتا ہے۔ وہ موائرن مدرس تھا۔ مرتے وقت اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر

لیا کہ اس نے اپنے بچوں کا بدلہ لیا تھا۔ اور جھوٹ بول کر اس کی جان بچ گئی۔

اس افسانے میں ایک باپ کی اپنے بچوں کے ساتھ ایسی انوکھی محبت دکھائی گئی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی موت کا بدلہ معصوم بچوں کو مار کر لینے لگا۔ وہ نعوذ باللہ خدا کو قاتل سمجھنے لگا اسے اپنے بچوں کی محبت نے دیوانہ بنا دیا تھا کہ وہ معصوم بچوں کو شیشے کی کرچیاں اور سوئی کے باریک ٹکڑے مٹھائی میں ملا کر کھلانے لگا اور وہ اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ جان کے بدلے جان لینی چاہیے اور اس نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے مقتول بچون کا انتقام لے گا وہ نیچر سے نفرت کرنے لگا وہ مرنا نہیں چاہتا تھا کہ خدا اس پر ہنسے لگا اس لیے اس نے جھوٹا حلف اٹھا لیا۔ اسے بچوں کی موت نے اتنا دیوانہ بنا دیا کہ وہ (نعوذ باللہ) خدا کو اپنا دشمن سمجھنے لگا لیکن خدا اپنی مخلوق سے ان کے ماں باپ سے کہیں زیادہ پیار کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اس افسانے میں ایک بادشاہ اور ملکہ کا اپنی رعایا کے ساتھ ہمدردی بھی دکھائی گئی ہے کہ جب موائرن کو سزائے موت سنائی جاتی ہے اور وہ جھوٹا حلف اٹھا لیتا ہے تو بادشاہ کے دربار میں اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اس کو ضرور معاف کر دینا چاہیے۔ بقول ملکہ "کیا ایک مشکوک مجرم کو چھوڑ دینا بہتر ہے یا ایک معصوم کی جان لینا" یہ فیصلہ تو ایک ملک کے بادشاہ اور ملک کے بادشاہ اور ملکہ نے کیا تھا مگر وہ بادشاہ جو اس دنیا کا مالک اور خالق ہے وہ اپنی مخلوق سے کس قدر پیار کرتا ہوگا۔ اس سے نفرت کا سوچا بھی کیسے جا سکتا ہے۔

مصنف نے افسانے "مسافر کی کہانی" میں زندگی کے سفر یعنی پیدائش سے لے کر موت تک کے سفر میں انسان کن کن مراحل سے گزرتا ہے کو بیان کیا ہے۔ اس افسانے کا اسلوب سادہ، سلیس اور نہایت دلکش انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر

> "کچھ عرصے تک تو مسافر اندھیرے میں چلتا رہا۔ نہ تو اسے کوئی چیز دکھائی دی اور نہ کوئی آدمی ملا۔ مگر آخر کار چلتے چلتے اسے ایک بچہ نظر آیا۔ اس نے بچے سے پوچھا۔ "ننھے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" بچے نے جواب دیا۔ میں ہمیشہ کھیلا کرتا ہوں۔ آؤ تم بھی میرے ساتھ کھیلا کرو؟" ۳۸

"مسافر کی کہانی" افسانے میں پرانے زمانے کی بات ہے کہ ایک مسافر سفر پر روانہ ہوا مگر اس کا سفر بہت ہی عجیب سفر تھا اس کو سفر شروع کرتے وقت بہت لمبا دکھائی دیا۔ مگر جب آدھا گزر گیا تو بہت چھوٹا معلوم ہونے لگا۔ کچھ عرصہ تو مسافر چلتا رہا اسے کوئی بھی راستے میں نہ ملا آخر کار چلتے چلتے ایک بچہ نظر آیا اس نے بچے سے پوچھا ننھے میاں تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اس نے جواب دیا میں ہمیشہ کھیلا کرتا ہوں۔ آؤ تم بھی میرے ساتھ کھیلا کرو؟ مسافر اس کے ساتھ کھیلنے لگا اور سارا دن کھیلتا رہا۔ دونوں بہت خوش تھے دن بہت سہانا تھا۔ ہوائیں گا رہی تھیں، جب بارشیں ہوئیں تو پھر بھی وہ خوش ہوئے۔

بوندوں کی بھرماران کے دل کو لبھاتی تھی۔ ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی بھاگتی تو یہ کہتے کہ گھر سے بھاگ نکلی ہے ان کے پاس بہت سے اچھے اچھے کھلونے تھے اور ان کے پاس مورتیوں والی کتابیں تھیں۔ ان کتابوں میں پریوں، جنوں اور صاحبوں اور میموں کی تصویریں تھیں وہ انہیں دیکھتے اور خوش ہوتے ایک دن بچہ گم ہو گیا۔ مسافر نے اسے بہت سی آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہ آیا۔ بے چارہ مسافر آگے بڑھا۔ آخر اسے ایک لڑکا ملا اس نے لڑکے سے پوچھا وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ اس نے جواب دیا میں ہر وقت پڑھتا ہوں آؤ تم بھی میرے ساتھ پڑھا کرو۔ مسافر نے اس کے ساتھ پڑھنا شروع کیا اس نے اتنا پڑھا کہ وہ خود بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ پڑھنے کے بعد یہ کھیلتے کودتے، شرارتیں کرتے ان کے اور بھی بہت سے دوست تھے اس لڑکے کی طرح سب بھولے اور خوبصورت اور معصوم تھے ایک دن لڑکا غائب ہو گیا جیسے بچہ غائب ہوا تھا۔ مسافر نے اپنا راستہ لیا اسے ایک نوجوان دکھائی دیا۔ اس نے نوجوان سے پوچھا کیوں میاں تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ نوجوان نے جواب دیا میں عاشق ہوں۔ میرا کام عشق ہے آؤ تم بھی کسی پر عاشق ہو جاؤ۔ مسافر اس کے ساتھ چل پڑا انہیں ایک خوبصورت لڑکی دکھائی دی۔ وہ سندری تھی نوجوان اس پر عاشق ہو گیا یہ عاشق و معشوق کا جوڑا کبھی کبھی لڑ بھی پڑتا تھا ایک دن آگ تاپ رہے تھے کہ باتیں کرنے لگے باتوں باتوں میں شادی کا اقرار ہو گیا۔ مسافر کی قسمت کہ ایک دن یہ بھی اس سے کھو گئی۔ مسافر نے اسے بھی پکارا مگر یہ بھی نہ آئی۔ مسافر اور کیا کرتا اپنا راستہ لیا۔ رستہ سنسان تھا مگر چلتا گیا آخر اسے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ملا۔ مسافر نے اس سے پوچھا کیوں میاں تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کام دھندے میں لگا رہتا ہوں آؤ تم بھی کام کیا کرو۔ مسافر اس کے ساتھ جنگل کو چل پڑا اس کے ساتھ کی بیوی اور بچے بھی تھے یہ سب کے سب اور مسافر ساتھ ساتھ جنگل میں گھس گئے۔ درخت کاٹتے تھے، رستہ بناتے تھے اور آگے بڑھتے چلے جاتے تھے تو ایسی جگہ پہنچے جہاں بہت سے راستے مختلف اطراف کو نکلتے تھے۔ یہاں ایک بچے نے کہا میں سمندر کو جا رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا میں ولایت جا رہا ہوں اور تیسرے نے کہا میں مزدوری کرنے جاتا ہوں اور چوتھے نے کہا میں اللہ میاں کے پاس جاتا ہوں۔ سب رونے لگے جدائی بری چیز ہوتی ہے سب جدا ہو گئے ہر ایک نے اپنا اپنا رستہ اختیار کر لیا اور چلے گئے۔

اس افسانے میں ایسا مسافر دکھایا گیا ہے جو کہ زندگی کا سفر یعنی جب بچہ پیدا ہوتا ہے اور جب وہ کھیلنے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اسے اپنے جتنے بچے کھیلنے کودنے والے ملتے ہیں وہ ان کے ساتھ کھیلتا کودتا ہے اور تصویروں والی کتابیں دیکھتا ہے اور جب تھوڑا بڑا ہوتا ہے تو وہ لڑکوں کے ساتھ مل کر پڑھتا ہے اور پڑھائی کے بعد کھیلتا کودتا ہے اور پھر وہ جوانی کے دور میں داخل ہوتا ہے اور اسے اپنے جیسے جوان ملتے ہیں اور وہ ایک لڑکی سے عشق کرتا ہے اور پھر شادی کرتا ہے اور پھر زندگی کے اسی سفر میں آگے چل کر ادھیڑ عمر آدمی بن جاتا ہے۔ جس کے بیوی بچے ہوتے ہیں اور جب وہ جوان ہوتے ہیں تو ہر کوئی اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے سب جدا ہو جاتے ہیں ہر ایک اپنا اپنا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور آخر یہ سفر موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔

زیرنظر مجموعے ''معیاری افسانے'' میں حفیظ جالندھری نے ۱۸ افسانے مرتب کیے ہیں۔ یہ تمام افسانے مختلف ادیبوں کے لکھے ہوئے ہیں اور ان کو مختلف اصحاب علم نے ترجمہ کیا ہے۔ لیکن ان تمام افسانوں کو مرتب اور منتخب بھی حفیظ صاحب نے کیا ہے۔ ان افسانوں میں اکثر افسانے تصوراتی یا خیالی نوعیت کے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ افسانوں میں معاشرتی پہلو اور کچھ افسانوں میں والدین کی انوکھی محبت دکھائی گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حفیظ جالندھری، " ہفت پیکر " مجلس اردو، لاہور، ۱۹۴۰ء، ص ۲۱

۲۔ ایضاً ص ۲۴

۳۔ ایضاً ص ۳۰

۴۔ ایضاً ص ۴۳

۵۔ ایضاً ص ۵۰

۶۔ ایضاً ص ۶۱

۷۔ ایضاً ص ۶۷

۸۔ ایضاً ص ۸۷

۹۔ ایضاً ص ۹۴

۱۰۔ ایضاً ص ۱۰۱

۱۱۔ ایضاً ص ۱۰۴

۱۲۔ ایضاً ص ۱۳۱

۱۳۔ ایضاً ص ۱۳۹

۱۴۔ ایضاً ص ۱۶۱

۱۵۔ ایضاً ص ۱۸۸

۱۶۔ حفیظ جالندھری، "(منتخبہ و مرتبہ) معیاری افسانے"، دفتر مجلس اردو، ماڈل ٹاؤن، لاہور، ۱۹۴۱ء ، ص ۹

۱۷۔ ایضاً ص ۲۰

۱۸۔ ایضاً ص ۶۷

۱۹۔ ایضاً ص ۳۳

۲۰۔ ایضاً ص ۱۲۸

۲۱۔ ایضاً ص ۱۶۴

۲۲۔ ایضاً ص ۱۵۶

۲۳۔ ایضاً ص ۱۶۰

۲۴۔ ایضاً ص ۱۹۱

۲۵۔ ایضاً ص ۲۰۵

۲۶۔ ایضاً ص ۴۰

۲۷۔ ایضاً ص ۹۰

۲۸۔ ایضاً ص ۱۳۶

۲۹۔ ایضاً ص ۳۷

۳۰۔ ایضاً ص ۵۲

۳۱۔ ایضاً ص ۱۰۳

۳۲۔ ایضاً ص ۹۱

۳۳۔ ایضاً ص ۹۳

۳۴۔ ایضاً ص ۲۲۳

۳۵۔ ایضاً ص ۱۵۰

۳۶۔ ایضاً ص ۱۸۲

۳۷۔ ایضاً ص ۲۱۰

۳۸۔ ایضاً ص ۲۳۳

۳۹۔ حفیظ جالندھری، "ہفت پیکر" مجلس اردو، لاہور، س ن

باب سوم

حفیظ جالندھری کی متفرق نثری تحریریں

(۱) چیونٹی نامہ

(۲) نثرانے

(۳) دیباچے

(۴) تعارف نامے

(۵) خطوط

(۶) مجموعی جائزہ

چیونٹی نامہ

حفیظ جالندھری کی بنیادی حیثیت شاعر کی ہے لیکن ادبی صحافت سے وابستہ رہنے کی وجہ سے انہیں نثر میں بھی طبع آزمائی کرنی پڑی۔ چیونٹی نامہ حفیظ کی ایک مستقل نثری تحریر تھی۔ جدید ماہرین حیاتیات کے تجربات پر مبنی مشاہدات کی مدد سے حفیظ نے اس کتاب چیونٹی نامہ کو مرتب کیا۔ حفیظ کا شاعرانہ مزاج ہونے کے علاوہ ان کو بچپن ہی سے چیونٹیوں سے دلچسپی تھی۔ اس کے بارے میں حفیظ خود کہتے ہیں۔

> ''میں تو سات برس کا بچہ ہی تھا جب اس کالی پری نے مجھ کو سائے سے نواز دیا۔ اس دن سے اب تک اس کا دیوانہ ہوں۔ اس جادو کو دُور کرنے کے لیے کنکوے ہی نہیں کبوتر بھی اڑائے، بٹیرا اڑائے: غلیل سے گلہریوں کی دُمیں مُوقلم بنانے کے لیے حاصل کیں، شکرے ہاتھ پر بٹھائے، فاختائیں تاکیں اور بھی اُمنگیں تھیں لیکن ان ترنگوں سے جلد ''بور'' ہو گیا کیوں کہ میرے کندھوں پر دو ایسے بھوت سوار ہو چکے تھے جن کو میں اتار ہی نہ سکتا تھا۔ ان میں ایک ہے شعر و ادب کا مرض اور دوسرا اس کالی پری سے دوستی کا عشق جو بچپن ہی سے گلے پڑ گئی تھی''۔[1]

حفیظ عمر کے ساتویں برس میں ایک روز اپنی حویلی سے ملحقہ ایک خالی زمین پر جہاں شیشم کے پیڑ کے علاوہ دو تین چھوٹے درخت تھے۔ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ جنڈ پلنگا کھیل رہے تھے۔ ان کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی۔ ان کے ساتھی ہنستے، کھلکھلاتے، دوڑتے بھاگتے، درخت پر چڑھ اتر رہے تھے اور وہ اندھوں کی طرح اپنے ساتھیوں کی کھلکھلاہٹ کے رخ پر ادھر ادھر گھوم رہے تھے کہ کوئی ہاتھ آ جائے۔ اسی اثناء میں انہوں نے شیشم کے درخت کو پکڑ لیا اور بے شمار چیونٹیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ ان کے سارے جسم پر بے شمار چلتی پھرتی نوکیں چبھنے لگیں۔ انہوں نے آنکھوں کی پٹی اتار دی اور زمین پر ننگ دھڑنگ لوٹنے لگے۔ ان کا شور سن کر ان کے ساتھی پہلے تو ہنسے مگر چیخیں اتنی مہیب تھیں کہ وہ سب ڈر گئے۔ اتنے میں ان کی والدہ، دادی اور دادا دوڑے آئے۔ سب نے سمجھا کہ لڑکے کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ ان کے جسم سے چیونٹیوں کو نوچ نوچ کر اتارا۔ ان کا بدن سوجھ گیا۔ اور سکول سے چھٹی لی گئی۔ ان کے ماسٹر فتح دین جنھوں نے چند ماہ پیشتر ان کو اپنی شاعری کا اولین نمونہ اپنی جماعت کے لڑکوں کو سناتے ہوئے پکڑا اور تھپڑوں سے نوازا تھا۔ وہ بھی ان کو ملنے آئے۔ شیشم کی جڑوں میں ایک پرستان تھا۔ جس میں کالی پریاں شاد و آباد تھیں۔ ان کالی پریوں نے حفیظ کو بچپن ہی میں اپنی محبت کا اسیر بنا لیا۔

اس کے کچھ دنوں بعد حفیظ کے دادا نے شیشم کے درخت کی جڑوں کے نیچے مٹی کھدوائی اور مٹی کا تیل ڈال کر آگ

لگا دی مگر بارش کے بعد سفید سفید کیڑے نظر آنے لگے ان کے گھر والوں نے زبانی لعنت بھیج کر خود تو بے نیاز ہو گئے مگر حفیظ نے ان سے نپٹ لینے کی ٹھان لی۔

سید ضمیر جعفری اپنی کتاب ''کتابی چہرے'' کے ایک مضمون ''چیونٹی اور پہاڑ'' میں حفیظ صاحب کی چیونٹیوں سے گہری وابستگی کے بارے میں اپنے دلچسپ انداز میں لکھا ہے:

''مجھے چیونٹی نامہ کی اشاعت پر حیرت اس لیے نہیں ہوئی ہے کہ اس کا مسودہ اتنی مدت سے پڑا تھا کہ اگر اب چھاپہ خانے میں نہ جاتا تو اس کو چیونٹیاں خود کھا جاتیں۔ حفیظ صاحب کے جتنے گہرے مراسم چیونٹیوں سے ہیں اتنے انسانوں سے بھی نہ ہوں گے۔ وجہ یہ کہ چیونٹی ان کے بقول انسانوں سے کہیں زیادہ محنتی، مخلص اور منظم و منتظم مخلوق ہے۔ حفیظ صاحب، ابوالاثر اپنے ''پتھر اور دھات'' ہی کے زمانے میں بن گئے تھے بعد میں ''خان بہادر'' ''حسان الملک بہادر'' ہوئے پھر انگریزی میں ترجمہ ہو کر ڈائریکٹر جنرل تک پہنچے۔ مگر طبعًا وہ ہاتھی، گھوڑ، یکے آدمی کبھی نہیں رہے۔ ہمیشہ چیونٹی کے آدمی رہے۔ پیدل چلتے ہوئے ان کی سب سے زیادہ توجہ چیونٹیوں کی طرف رہتی تھی۔ ماڈل ٹاؤن میں ان کی کوٹھی کے بیرونی باغ میں چیونٹیوں نے اپنا بہت وسیع ہیڈ کوارٹر قائم کر رکھا ہے۔ آپ صبح و شام دو وقت اسپڑاؤ کو دیکھنے جاتے ہیں کہ ان کے ٹریفک کے نظام میں کوئی خلل تو نہیں آ گیا؟ چیونٹیوں کے بارے میں معلومات کا دانہ مل جاتا ہے اسے اٹھا کر اپنے کاغذات میں محفوظ کر لیتے ہیں یہ کتاب انہوں نے چیونٹی چیونٹی کر کے جمع کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی اتنی بڑی ایک اور کتاب کی چیونٹیاں ان کے پاس فالتو پڑی ہیں۔ راہ چلتے ہوئے چیونٹیوں کا کوئی جلوس آتا جاتا ملے تو ٹھٹھک کر ماجرے کیتہہ تک پہنچ کر رہیں گے کہ کیڑیوں کا جنازہ جا رہا ہے، برات ہے یا فرقہ ورانہ فساد؟ ویسے ان کے انداز معاشرت اور اسلوب خانہ داری میں حفیظ صاحب کے ورک کا یہ عالم ہے کہ کیڑیوں کی قطار دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ آیا راشن کی قطار ہے یا ملکہ کی سواری...... کسی موٹے تازے ''پھٹے ہوئے'' مکوڑے کو غصب ناک نظروں سے غنڈوں کا سرغنہ، غریب چیونٹیوں کا استحصال کر رہا ہے ''اور غریب چیونٹیوں کو حفیظ صاحب مہر و شفقت سے چھلکتی ہوئی کچھ ایسی احسان مند نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ ایسی نگاہوں کے لیے ان کے دوست ترستے ہیں ''چیونٹی نامہ'' کو نثر میں لکھا دیکھ کر یک گونہ اطمینان ہوا۔ ورنہ مجھے تو ڈر تھا کہ وہ چیونٹیوں سے اپنے گہرے لگاؤ۔ ان کے عادات و خصال کے بارے میں وسیع معلومات اور سب سے زیادہ اپنی قادرالکلامی کے بہاؤ میں چیونٹیوں کو بھی منظوم کر دیں گے۔ جو ان کے لیے نسبتًا آسان بھی ہوتا مگر انہوں نے یہ کتاب نثر میں لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ نثر کے میدان میں بھی اپنا جھنڈا اگاڑ دیا ہے۔ یہ کتاب لکھ کر حفیظ صاحب نے زبان اور انسان دونوں کی خدمت کی ہے۔ چیونٹیوں کے معاشرے کی تصویر ایسے دلکش اور موثر انداز میں کھینچی ہے کہ اس میں انسانوں کے لیے ایسی بہت سی عبرتیں سمٹ آئی ہیں کہ بے اختیار چیونٹی کے نقشِ قدم پر چلنے کو جی چاہتا ہے۔''[۲]

ابوالاثر حفیظ جالندھری کو شاہنامہ اسلام اور قومی ترانہ کی وجہ سے کافی شہرت حاصل ہے۔ لیکن تہتر برس کی عمر میں حفیظ نے نثر نگاری کا تحفہ چیونٹی نامہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ دنیا میں ہزاروں لاکھوں اور جاندار بھی ہیں مگر انہوں نے چیونٹی کو اس لیے منتخب کیا کہ اس کی کچھ نفسیاتی وجوہ ہیں اور کچھ وہ اخلاقی اور تہذیبی اقدار ہیں جو ادب کی تاریخ میں دنیا کے ہر بڑے ادیب اور شاعر کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رہی ہیں۔ اس کتاب کا بنیادی نکتہ حضرت انسان کو بظاہر اس حقیر کیڑے چیونٹی کی زندگی سے درس لینے کی طرف راغب کرنا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ حفیظ صاحب نے چیونٹی کی زندگی کی بھرپور اور تفصیلی عکاسی کر کے ادب کی ایک نہایت مشکل صنف طنز یعنی (Satire) کا حق ادا کر رہا ہے یہ طنز براہِ راست نہیں ہے بلکہ حفیظ صاحب نے سیدھے سادے طریقے سے ''چیونٹی'' کی مختلف انواع کے کردار پیش کیے ہیں اور تحقیق سے انہوں نے یہ بات ثابت کی ہے کہ ''چیونٹی'' جیسی شے (جس کے نام کو ہم عموماً حقارت اور چھوٹے پن کی علامت کے طور پر اکثر استعمال کرتے ہیں)۔ اپنی اقدار کی بدولت حضرت انسان سے کس قدر افضل ہے۔

> ''چیونٹی نامہ'' کے تمہیدی باب میں حفیظ صاحب نے مزاح لطیف (Humar) اور طنز (Satire) کا نہایت ہی خوبصورت اور دلکش امتزاج پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا انداز بیان اور اسلوب (جو سائنس کے حقائق اور نظریات پیش کرتا ہے) نہایت دل چسپ اور پُر کشش ہے۔''۳

چیونٹی کو جس طرح سب چیونٹی ہی سمجھتے ہیں اسی طرح انسان کو سب انسان سمجھیں تو کوئی ازم کوئی قاعدہ، کوئی عقیدہ کھنڈت نہیں ڈالے گا۔ افسوس کہ حشرات الارض کے بارے میں ہم انسانوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ خود اپنے بارے میں اختلاف ہی اختلاف ہے اور اس اختلاف کو دور کرنے کی طرف یہ کتاب قابل قبول اشارے کرتی ہے چیونٹی نامہ میں بھی اس مقصد کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

بقول حفیظ جالندھری:۔

> ''دنیا میں جتنی بھی مخلوق ہے چیونٹی اپنے بے باک اور آزاد نظام معاشرہ کے بل پر سب پر فائق ہے۔ ہم انسان جو باہمی تفرقے کے سبب فنا ہو رہے ہیں اگر چیونٹی سے کچھ سبق حاصل کرلیں تو انسانی عظمت کے منافی نہیں ہوگا''۔۴

لہذا آدمیوں پر بھی لازم ہے کہ وہ الٹے سیدھے جھگڑوں میں پڑ کے دکھ درد کے ماروں کو نظر انداز نہ کریں بلکہ فوری طور پر ایک اجتماعی تصور حیات کی صحتمند فضا قائم کریں اور بلک بلک کر مرنے والوں کی دستگیری پر، امداد پر آمادہ ہوں۔

تقسیم کار، نظم وضبط اوراس کے ساتھ کچھ قناعتِ اجتماعی زندگی کے وہ ستون ہیں۔ جن کی طرف اس کتاب ''چیونٹی نامہ'' میں رہنمائی کی گئی ہے۔

چیونٹی نامہ توانائی بخش کتاب نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں کوئی ناصحانہ یا قائدانہ نصیحت بازی نہیں ہے لیکن جس زیرزمین تہذیب کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ سب مخلوق دوستی ہی کے مناظر ہیں۔ یہ کتاب حیرت انگیز شگفتہ طرز بیان کے ساتھ ہمیں دکھائی ہے کہ ہزارہا انواع کی چیونٹی اپنی اپنی جداگانہ سوسائٹی، تمدن، تہذیب اور مہمات حیات رکھتی ہے۔ ہر نوع کے اندر بھی جسمانی اعضاء اور کارکردگی کا اتنا جبلی تضاد ہے کہ سوسائٹی بنا کر شہر بسا کر رہنے سہنے اور زندگی کی منزلیں طے کرنے میں ان سب کو مکمل اتحاد، اشتراک، ربط وضبط، قابل رشک اور حیرت انگیز ہے۔

پروفیسر حمید کوثر: چیونٹی نامہ کو اصل داستان ہوشربا کہتے ہیں۔

ہم انسان فقط ایک نوع ہیں سوسائٹی بنا کر رہتے ہیں اور فتنہ اندازی میں لگے رہتے ہیں۔ اپنے لیے ہم شر پیدا کرتے ہیں اوراس شر کو شیر ستاتے ہیں فساد کے بغیر جینا محال سمجھتے ہیں۔

چیونٹی نامہ چیونٹیوں کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی پر ایک ایسی عمدہ کتاب ہے جس کی ان سے پہلے اردو میں کوئی مثال نہیں ملتی اس کا مواد انہوں نے بچپن سے جمع کرنا شروع کیا۔ اس میں ذاتی مشاہدات اور تجربات شامل کیے، پھر لکھنے بیٹھ گئے اور اس بیٹھک میں چیونٹی کی خلقی طبع کے حوالے سے انسانی معاشرے پر بھی تنقید کر گئے۔ یہ کتاب سب سے پہلے حفیظ کے اپنے کتب خانے ''کتاب خانہ حفیظ'' سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے قانونی اور اخلاقی حقوق محفوظ ہیں۔ مگر کتاب پر قیمت درج نہیں تھی۔ بعد میں یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی اور اس کے اوپر ۱۲۵ روپے قیمت درج تھی۔ بچوں کی ذہنی اور معاشرتی نشوونما کے لیے اس کا پڑھنا مفید ہوگا۔ چیونٹیوں کے بارے میں اب تک دنیا میں جو تحقیق ہوئی ہے۔ حفیظ صاحب نے ایک چھوٹی سی کتاب میں اس کا خلاصہ اپنے دل نشیں پیرائے میں کر رہا ہے۔

چیونٹی نامہ کا مصنف نہ سائنسدان ہے نہ حیوانات کا ماہر، مگر وہ شاعر ہے اور ہر مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کا طویل تجربہ رکھتا ہے چیونٹیوں کے موضوع پر حفیظ صاحب کی حیثیت ایک ذہین مبصر کی ہے مگر ڈاکٹر نذیر احمد کے سے سائنسدان جوان کے دوست بھی ہیں ان کے ہمراہی بھی ہیں۔ چنانچہ یہ کتاب شاعرانہ بصیرت اور ماہرانہ صداقت کا متوازن امتزاج پیش کرتی ہے چیونٹی سے متعلق اس کتاب میں انکشاف حیرت انگیز ہیں۔ چیونٹی کا منضبط معاشرہ، اس کی بستیاں، ان بستیوں کے انتظامات چور اور ڈاکو چیونٹیاں، مفت خور اور غنڈہ چیونٹیاں۔ کسان اور کاشتکار چیونٹیاں، محنت کش چیونٹیاں ان کے خوراک کے ذخائر، ان ذخائر کی حفاظت، غرض چیونٹیوں کی زندگی کا بظاہر تو کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو حفیظ صاحب کے مشاہدے کی زد میں نہیں آیا۔

چیونٹی نامہ میں حفیظ صاحب نے کسی کسی جگہ پر چیونٹیوں کے معاشرے کا انسانی معاشرے سے تقابل کیا ہے اور انسانوں کو چیونٹیوں کی پیروی کا مشورہ بھی دیا ہے۔انسانوں کو یقیناً ہر مخلوق سے اچھے سبق سیکھنے چاہئیں اور چیونٹی کی استقامت سے تو انسانی تاریخ کی بعض بڑی شخصیتوں نے درس لیے بھی ہیں مگر چیونٹی کے معیار کا انسانوں پر مکمل انطباق اس لحاظ سے دوراز کار ہے کہ کچھ بھی ہو۔انسان آخر انسان ہے۔اشرف المخلوق ہے اور جس طرح اس نے اپنی جہالت کو ختم کیا ہے۔اسی طرح اپنے طبقوں کو بھی ختم کر دینے پر قادر ہے۔چیونٹی اگر طبقاتی زندگی گزارتی ہے تو وہ حشر تک ایسا ہی کرتی جائے گی مگر قدرت نے انسان کو تغیر اور تجسس کی قوت ودیعت کی ہے اور وہ خوب سے خوب تر اور خوب تر سے خوب ترین کی طرف مسلسل رواں دواں ہے۔

کیڑوں کی نوعیتیں تیس لاکھ سے اوپر ہیں لیکن ان سبھی تیس لاکھ انواع کو خدا نے سماجی زندگی کی صلاحیت عطا نہیں کی۔تیس چالیس لاکھ قسم کے کیڑوں میں معاشرت کی پابند صرف چیونٹیاں ہیں۔شہد کی مکھیاں ہیں، بھڑیں ہیں، دیمکیں ہیں، ان چار میں سے چیونٹیوں کی معاشرت اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کے اعتبار سے بھڑوں، دیمکوں اور شہد کی مکھیوں سے بہت بلند ہے بلکہ اس معاشرت کو انسانوں سے بھی بلند کہہ سکتے ہیں۔

معاشرہ کی جڑ بنیاد آپس کا لین دین ہوتا ہے۔لین دین کے بغیر کوئی معاشرہ یا سماج وجود میں آ ہی نہیں سکتا اور لین دین کے بغیر کسی اندوختے یا سرمائے کا امکان ہی نہیں۔انسانوں میں معاشرت اس وقت قائم ہوئی جب غلہ اور دوسری کھانے پینے، پہننے، برتنے اور رہنے سہنے کی چیزیں جمع ہونے لگیں یہی چھوٹا یا بڑا اندوختہ بعد میں سرمایہ کہلائے گا۔اگرچہ سرمایہ کی موجودہ صورت روپے اشرفی کے خزانے شمار ہونے لگے ہیں۔لیکن پہلے پہل سرمایہ ان کار آمد چیزوں کا ذخیرہ ہوا کرتا تھا۔یعنی وہ چیزیں جو ضرورت سے فاضل ہوتیں اور بچ جاتی تھیں وہی سرمایہ کہلاتی تھیں۔سرمایہ محنت چاہتا ہے اور چیونٹی کا سرمایہ اس کی محنت ہے یعنی وہ سب کچھ جسے وہ اپنی محنت سے حاصل کرتی ہے۔سرمایہ ہے، چیونٹی کی محنت کا سرمایہ مشترکہ ہے اور اس لین دین سے سوسائٹی بنتی ہے۔ہماری انسانی سوسائٹی میں کام کرنے والا مختلف گروہوں، جتھوں، طبقوں اور جماعتوں میں بٹے ہوتے ہیں۔کوئی کسان ہے، کوئی سپاہی، کوئی کلرک ہے تو کوئی سوداگر۔ملک کا بادشاہ یعنی راج پاٹ کا مالک راجا رانی، کوئی درباری، کوئی اہلکار ہے۔کہیں جمہوریت کا نام ہے جس میں چند آدمیوں کا اقتدار باقیوں پر جتھا بن کر سوار ہے۔چیونٹیوں میں بھی کچھ اس طرح کی تقسیم ہے۔یہاں بھی بادشاہ ملکہ اور رعایا، راجہ رانی، پرجا، فوجی، مزدور کارندے اور کاریگر ہوتے ہیں ہر ایک کا اپنا اپنا کام، اپنا اپنا مقام ہوتا ہے۔البتہ چیونٹی کی سماج میں تقسیم کار کی کاٹ انسانوں کی معاشرتی سطح سے بہت ہی زیادہ گہری ہے۔چیونٹیوں کا راجہ کاریگر نہیں بن سکتا اور کاریگر کسی صورت میں فوجی کا کام نہیں کر سکتا ہے۔

ہم انسانوں کے یہاں برا وقت پڑ جانے پر قلم چلانے والے کلرک اور گیان دھیان میں مصروف رہنے والے تپسوی زاہد ملاں، مولوی، ناچنے گانے والے بلکہ قانون دان وکیل، اخباروں کے صحافی یہاں تک کہ شاعر بھی تلوار اٹھا سکتے ہیں مگر چیونٹیوں کے سماج میں ایسا تلون کہیں ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔

حفیظ نے انسانوں اور چیونٹیوں کا ہر طرح سے موازنہ کیا ہے۔

انسان اپنے کاروبار اور لڑائی فساد کے لیے دھات پتھر اور لکڑی کے مختلف آلے اور ہتھیار بناتا ہے لیکن چیونٹیوں میں آلے اور ہتھیار اس کے اپنے جسم سے علیحدہ نہیں ہوتے جسم کے اعضاء ہی ڈھل کر ہتھیاروں اور اوزاروں کی صورت پکڑ لیتے ہیں۔ فوجی چیونٹیوں کے جبڑے ہی لمبے، نوکیلے اور دھاردار ہو کر مختلف ہتھیاروں کا روپ دھار لیتے ہیں۔

چیونٹیوں کی بستی میں دربان اور دروازوں کے کواڑ ایک ہی چیز ہوتے ہیں۔ چیونٹیوں کے سماج میں ایک ہی نوع کے مختلف افراد کی غذا، جسامت، عمر اور طرز پیدائش میں ایسا ایسا فرق نظر آتا ہے جو انسانوں کے ہاں نظر آئے تو پکار اٹھیں کہ اللہ دین اور اللہ دین کا چراغ ایک ہی جنس ہیں۔

ایک ہی قوم، ایک ہی قبیلے اور نسل کی چیونٹیوں کے فوجیوں کا قد کاریگروں کی بہ نسبت ایک ہزار گنا بڑا ہوتا ہے۔ چیونٹیاں اپنے بچوں میں جان بوجھ کر، سوچ سمجھ کر پکے ارادے سے بعض ایسے وجود پیدا کرتی ہیں جن کو آگے چل کر ساری قوم کے بادشاہ اور ملکہ بننا مقدر ہے اور باقی سب نوکر چاکر خدمت گار فوجی اور وفا شعار رعایا بن کر جینا مرنا ہوتا ہے۔

چیونٹی کے ایک ہی شہر میں فقط ایک ہی نسل کے چند ہزار سے لے کر کئی کئی لاکھ تک افراد رہتے سہتے ہیں۔ اتنے افراد کے اکٹھے ایک ہی آبادی میں بسنے رہنے کے باوجود یہاں آپس میں بے راہ روی باہمی دنگا فساد لڑائی بھڑائی ہونے نہیں پاتی۔ ہر کام نہایت ہموار اپنے دھڑے پر چلتا رہتا ہے جبکہ انسانوں کے سماج میں ہمیں ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھانے اور منانے کے لیے زبان سے کام لینا پڑتا ہے، قانون کی تشریحیں کی جاتی ہیں۔ تعزیزوں سے ڈرایا جاتا ہے لیکن ان کوششوں اور ترکیبوں کے باوجود حالت یہ ہے کہ آپس میں ربط وضبط بمشکل عارضی طور پر ہی پیدا ہوتا ہے۔

حفیظ اپنی کتاب ''چیونٹی نامہ'' میں چیونٹی نری مادائیں اور انسانی سوسائٹی کی بیگمات کے درمیان بھی موازنہ کرتے دکھائی دیتے ہیں کہتے ہیں کہ:۔

بعض ماہروں کا خیال ہے کہ چیونٹی کے گھرانے کے سبھی افراد نری مادائیں ہی ہوتی ہیں، چند بادشاہوں کے سوا کوئی نر ہوتا ہی نہیں اور بادشاہ بھی تعداد میں بہت تھوڑے پیدا کیے جاتے ہیں۔ جو فقط دو ہفتے زندہ رہتے ہیں۔ بچوں کی پرورش ہی اصل خاص کام ہوتا ہے اور واقعی عورتیں یعنی مادائیں ہی ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں سوسائٹی میں ان کے کام میں خلل پیدا نہیں ہوتا۔ انسانی سوسائٹی کی بیگمات یعنی عورتوں کی طرح گالی گلوچ اور چغلی چیونٹی کے ہاں نہیں پائی جاتی ہے ان میں ایک دوسرے سے شدید ہمدردی اور ہم خیالی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

چیونٹی کے نئے گھرانے خاندان یا قبیلے کی بنیاد کوئی رانی ہی رکھتی ہے۔ جن حالات میں ایک نیا قبیلہ وجود میں آتا ہے وہ بڑا دردناک بھی ہے اور حیرت انگیز بھی اس کو دیکھنے میں بھی

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے

ایک راجا اور ایک رانی باہم ایک ایسی رومان بھری اڑان کا لطف لیتے ہیں جس اڑان کے انجام پر راجا زمین پر اترتے ہی اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دیتا ہے، مادہ رانی زمین پر اپنے شوہر ہی کی نہیں بلکہ ایک قوم کی وارثہ کی حیثیت سے اترتی ہے وہ اپنے پَر خود ہی کاٹ ڈالتی ہے کیونکہ وفادار ہے اب اسے کسی اور نر کے ساتھ نکاح ثانی نہیں کرنا ہے اب حاملہ بیوہ عظیم منصوبہ لیے ہوئے زمین کھودنا شروع کر دیتی ہے ایک چھوٹا سا حجرہ بناتی ہے اس میں اپنے آپ کو بند کر لیتی ہے اس سیہ خانے میں بے یار و مددگار اکیلی پڑی رہتی ہے کسی انسانی عابد و زاہد کی طاقت کیا ہے جو ایسا ہولناک چلہ کاٹے، جیسا چلہ، چیونٹی کاٹتی ہے۔ بہت دن گزر جانے کے بعد چیونٹی رانی پہلا انڈہ دیتی ہے پھر دوسرا تیسرا، ان چند انڈوں میں سے نشو و نما پاتا ہوا ایک بچہ بن جاتا ہے لیکن ایسا بچہ جو ابھی تک ہل جل نہیں سکتا اور جس کی پرورش کے مکمل ہونے میں ابھی بڑی مدت درکار ہے۔

نئے قبیلے کی یہ بانی، ماں رانی کہیں جا کر کچھ کھا پی آنے کو ہرگز ہرگز تیار نہیں اس کی زندگی زیادہ سے زیادہ مٹی کی نم سطح زمین کے اس حجرہ کے اندر گھومنا ہے جو بہت ضروری بھی ہے کیونکہ نمی کے بغیر کوئی چیونٹی کچھ بہت وقت جی نہیں سکتی۔ خوراک چیونٹی کے اپنے پوٹے سے آتی ہے اور جب یہ پوٹا خالی ہو جاتا ہے۔ تو پھر رانی کی چربی پگھلنی لگتی ہے پھر اس کے پروں والے بڑے بڑے اور طاقت ور پٹھے گھلنے لگتے ہیں یہ ہے غذا جس سے وہ اپنی اور اپنے بچوں کی پرورش کا کام لیتی ہے۔ یہ ماں ہے ایک آنے والے بڑے خاندان کی۔ اس نے ایک شہر ایک ملک ایک دنیا بسانی ہے یہ راج رانی ہے سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ لیکن ابھی تک اس کا ایک بچہ بھی پوری طرح پرورش نہیں ہو سکا۔ خوراک ملنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی تو رانی اپنے لخت جگر اپنے انڈے کھا کر چار انڈے اور دیتی ہے ہفتے اور مہینے گزر جاتے ہیں اور رانی کی حالت سخت نازک ہو جاتی ہے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ وہ اپنے نیم پرورش شدہ بچوں میں سے بھی ایک کو کھالے۔

یہاں پر حفیظ صاحب کا کہنا ہے کہ چیونٹی رانی پر خود غرضی کا الزام عائد نہیں ہوتا اپنے جنے ہوئے بچے کو ہلاک کر دینا کوئی خود غرضی نہیں کیونکہ اگر رانی ہی مر گئی تو ایسا بڑا خاندان وجود میں آنے سے رہ جائے گا۔ ایسا شہر بننے اور تعمیر ہونے نہ پائے گا جس میں لاکھوں فرد پیدا ہو کر اس دنیا میں رسیں بسیں گے۔

حفیظ صاحب نے اس کتاب میں موقع و محل کے مطابق کچھ اپنے اور کچھ دوسرے شعراء کے مصرعے اور اشعار استعمال کیے ہیں جیسے یہاں پر ''میر تقی میر'' کا یہ مصرع چیونٹی رانی ہی کے لیے کہا گیا ہے۔

جان ہے تو جہان ہے پیارے

غرض چیونٹی ماں مرتی پھرتی زندہ ہے جو بچے باقی رہ گئے ہیں ان کی پرورش جاری ہے اور آخر ان میں سے دو تین اب چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے ہیں یہ کمزور کمزور قد میں بہت چھوٹے ہیں کیونکہ بہت تھوڑی خوراک پر ان کی اُٹھان ہوئی ہے۔ ان کا سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ماں کے قید خانے کی دیواریں توڑ ڈالتے ہیں اور باہر سے کچھ دانا دُنکا ڈھونڈ کر لاتے ہیں جس کو ماں بھی کھاتی ہے، خود بھی کھاتے ہیں اس تازہ خوراک سے نئے بچے جلد جلد پرورش پانے لگتے ہیں اب یہ قبر آباد گھر کی صورت اختیار کرنے لگتی ہے۔ بے شک پہلے یہ قبر تھی اور ایسی بہت سی قبریں زمین کے نیچے بنتی رہتی ہیں کیونکہ سو میں سے دو تین چیونٹی رانیاں ہی نئے گھر کی بنیاد رکھ پاتی ہیں۔ باقی بے چاریاں اپنے حجرے کی تاریکی ہی میں فنا ہو جاتی ہیں۔ جب بچے باہر جانے اور اندر آنے لگتے ہیں تو یہ قبر پہلے تو ایک گھر پھر ایک آباد محلہ اور آخر ایک آباد شہر بن جاتی ہے۔ اس شہر میں زندگی کی چہل پہل اس طرح لہریں لیتی ہے جیسے دہلی، کلکتہ، بمبئی، لاہور، پشاور، کراچی یا لندن، نیویارک، ٹوکیو، ماسکو وغیرہ میں ہماری انسانی زندگی ہے۔

حفیظ یہاں پر اپنی نظم کے دو اشعار پیش کرتے ہیں انہوں نے یہ نظم لاہور پر لکھی تھی۔

وہی لاہور ہے وہی در و بام — وہی ہنگامہ خواص و عوام
زلزلے آگ آندھیاں سیلاب — لائے تشریف چل دیئے ناکام

حفیظ صاحب نے اپنی کتاب ''چیونٹی نامہ'' میں چیونٹیوں کی ڈیڑھ درجن سے زائد قسمیں بیان کی ہیں۔

حفیظ صاحب کہتے ہیں کہ بقول ڈاکٹر سید نذیر احمد کے کہ ہماری انسانی دنیا کی طرح چیونٹی کی دنیا میں بھی سب کاروبار بطریق راسخ نہیں ہوتے۔ حفیظ نے چیونٹیوں اور انسانوں کے درمیان تقابل بھی کیا ہے۔

چیونٹیوں کی ایک قسم لال چیونٹی گلیباری قبیلہ کی چیونٹیوں پر حملہ کرتی ہے اور انکے انڈے اور بچے اٹھا کر لے جاتی ہیں اور انکی تربیت کر کے اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔ اسی طرح خود انسان دوسرے انسانوں کی بیٹیوں بچوں کو کس طرح اپنی غلامی کے لیے اٹھا کر لے جاتے ہیں اور پھر ان کی خصلت بدل دیتے ہیں تو غلام ہو جاتے ہیں۔

''ٹیٹرا موریم'' کا ''فورمیکا'' سے لپٹ پڑنا ایسا ہے جیسے کوئی بلی چیتے کے سامنے ہو کر اس پر حملہ کر دے اور اس کو مار ڈالے اور ''پرے ٹیٹا'' کا اپنے پاس تیزابی فوارہ رکھنا اور غنیم پر اس کا استعمال نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہمارے سربرآوروں حکومتوں میں سے کوئی اٹیم یا ہائیڈروجن بم کا ذخیرہ اپنے اسلحہ خانے میں تو رکھے لیکن دشمن کی گستاخی کے باوجود اسے کام میں نہ لائے۔

لال چیونٹی کے حملہ کرنے سے گلیباری کے لاکھوں افراد اپنی بستیاں چھوڑ کر ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں اور پھر واپس پلٹ کر اپنے گھروں میں آباد نہیں ہوتے ان کے شہر اور گھر اپنی زبردستی اور دوسری چیونٹی کی زبردستی کے سبب شکست و ریخت ہو کر برباد ہو جاتے ہیں۔ آخر ان کی بستیوں کا نشان تک مٹ جاتا ہے ہم انسانوں کی پرانی تہذیبیں موہنجوداڑو اور ہڑپہ وغیرہ اور قومیں مثلاً دراوڑوں کی نسلیں مٹ چکی ہیں اور اب ہم انسان زمین کھود کھود کر ان کے تمدن کی نشانیوں کے انداز کا اندازہ لگاتے پھرتے ہیں لیکن چیونٹی اپنے برباد شدہ محلات کو دوسروں کی عبرت کے لیے کھودتی ہی نہیں ہے۔

ایک بڑے بڑے جباڑوں والی خونخوار بردہ گیر چیونٹی میدان جنگ میں خود کود پڑنے کی بجائے ٹیٹرا موریم اپنے غلام اور لونڈیوں کو آگے کر دیتی ہے اور خود پیچھے کھڑی رہ کر جنگ کا نقشہ دیکھتی رہتی ہے اگر کسی جگہ غنیم آگے بڑھنے لگے تو ٹیٹرا موریم کا وہاں پہنچ کر پینترا بدل کر دکھانا ہی غنیم کے سپاہیوں کے پیچھے ہٹا دینے کے لیے کافی ہوتا ہے جیسے یورپی اور امریکی روسی بڑی طاقتیں اپنے مفاد کے لیے اپنے زیر اثر قوموں کو دوسری قوموں کے خلاف لڑواتی ہیں اور خود پشت پناہی کرتی ہیں۔

حفیظ جالندھری ایک عجیب وغریب مماثلت جو چیونٹیوں کے معاشرے اور انسانی سماج میں پائی جاتی ہے دکھاتے ہیں کہ دونوں نے اپنی ترقی کا سفر ایک ہی روش کے مرحلوں سے طے کیا ہے۔ انسان کی ابتدائی سوسائٹی شکار پر گزاران کیا کرتی تھی بعد ازاں انسان نے جانوروں کو سوھایا۔ بھیڑ بکریاں پالیں ان کے دودھ سے ان کے گوشت سے غذا حاصل کی سب سے آخری مرحلے پر کھیتی باڑی سے اپنے لیے غذاؤں کے ذخیرے بھر لیے اور موجودہ تمدن اور ثقافت کی بنیاد ان ہی پر رکھی گئی۔

حکماء اور علماء کے نزدیک ان ہی تین مرحلوں سے چیونٹیوں کی سماج بھی گزری ہے۔

اپنے ابتدائی دور میں چیونٹیاں شکاری تھیں ۔ دوسرے دور میں انہوں نے یا ان میں سے بعض انواع نے ''تیلیا قسم'' کے کیڑوں کو سوہا کر ان سے ''میٹھا دودھ'' حاصل کرنا شروع کیا۔ تیسرے اور آخری دور میں ان میں سے بعض نے اور ترقی کر لی اور کھمبیوں اور پھپھوندیوں کی نرالی قسموں کی کاشت کاری سے خوراک کے ذخیرے جمع کیے۔ چیونٹی کی کسی نوع نے نشہ آور دارُو دریافت کیا اور عیش میں مبتلا ہونے لگیں۔

شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

حفیظ جالندھری نے چیونٹی کے جسمانی حصوں کے بارے میں اپنی کتاب چیونٹی نامہ میں تفصیلاً ذکر کیا ہے یہاں پر مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔ چیونٹی کو انڈے کی حالت سے بلوغت کی منزل پر پہنچنے تک اپنی راہ میں گویا دو پڑاؤ ضرور آتے ہیں یہ پڑاؤ اصطلاح کے طور پر بال پن (سُنڈی کی حالت) اور منجھ روپ (کوئے کی حالت) کہلاتے ہیں۔ جب تک ان سے نہ گزرے چیونٹی چیونٹی ہی نہیں بنتی۔ خدا کی اس مخلوق کی چار زندگیاں ہیں، انڈہ، سنڈی، کویا، چیونٹی۔

ہر کیڑے کی طرح چیونٹی کے جسم کے بھی تین حصے ہوتے ہیں پہلا حصہ سر، دوسرا حصہ سینہ اور تیسرا حصہ پیٹ۔ منہ، آنکھیں، مونچھیں، زبان اور دماغ سر میں ہوتے ہیں لہذا اسے چیونٹی کے کھانے پینے اور حواس کا مرکز کہنا بجا ہوگا۔

سینے میں بلا استثنا تین جوڑیاں ٹانگیں اور بعض صورتوں میں دو جوڑے پَر بھی پیوستہ ہوتے ہیں لہذا اس کو نقل و حرکت کی قوتوں کا مرکز سمجھنا چاہیے۔

پیٹ جو زندگی کی عام نشو ونما اور تناسلی قوا کا مجموعہ ہے یعنی چیونٹی کا مرکز "استمالہ" اور استمالہ کے معنی اس چیز کے لیے کوشش کرنا جس کا حصول بہت ہی مشکل ہو۔

چیونٹیوں کی عادات و خصائل کے بیان میں حفیظ مختلف شعراء کے اشعار بھی لاتے ہیں جیسے اصغر گونڈی کا شعر:

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

چیونٹی کے جسم کے اندر کوئی ہڈی نہیں ہوتی لیکن جسم کے ساتھ ساتھ باہر کی طرف "کائی مین" کا بنا ہوا ایک سخت ڈھانچہ ہوتا ہے ایسا جیسے کسی مکان کے گرداگرد ڈھالیں جڑ دی گئی ہوں "کائی مین" کے اس زرہ بکتر سے چیونٹی کے جسم کی حفاظت ہوتی ہے۔

حفیظ نے انسانوں کے بدمعاش دوستوں کی طرح چیونٹی کے بھی بدمعاش دوستوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ کس طرح وہ ان کے گھرانوں میں گھس کر ان کو خراب کرتی ہیں۔ چیونٹی کے کئی گھرانوں میں بعض طفیلیہ یعنی مفت خور قسم کی ننھی ننھی بھونڈیاں بھی رہتی ہیں۔ ان بھونڈیوں کے جسم سے ایک قسم کی نشہ آور رطوبت نکلی رہتی ہے جسے چاٹ چاٹ کر چیونٹیاں اپنے سب کام حتی کہ بچوں کی پرورش تک بھول جاتی ہیں اور ان کے پیچھے بھاگ دوڑ میں لگی رہتی ہیں۔ چیونٹیوں کی زبان اور ان کا اظہار کا مطلب نہایت سادہ ہے جس کی وجہ سے یہ بھونڈیاں اسے اچھی طرح سمجھ پاتی ہیں۔

اسی طرح جیسے انسانوں میں غنڈے اور بدمعاش لوگ شریف آدمیوں کے بہت سی عادتوں اور کمزوریوں سے واقفیت حاصل کیے رکھتے ہیں یہ بھونڈیاں بھی چیونٹیوں کو شرابن بنا کر مزے اڑاتی ہیں۔ حفیظ کا ایک شعر انسانی بدمعاشوں کے بارے میں ہے۔ جو چیونٹی کے ان دوستوں پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔

بلا سے آدمی کی بستیاں برباد ہو جائیں
مگر یہ بدمعاش اس زندگی میں شاد ہو جائیں

بعض علماء چیونٹیوں کو سراپا ہمدرد اور ایثار پیشہ سمجھتے ہیں لیکن بعض جگہ پر چیونٹیوں کی بے حسی بھی دکھائی گئی ہے کہ چیونٹی اپنی زخمی بہنوں کی تکلیف کی چارہ جوئی کرتی ہے اگر ان کا زخم معمولی ہوا اور وہ تندرست ہونے کے بعد اپنے خاندان کے کام آ سکیں اور اگر کسی زخمی کی حالت زیادہ خراب اور توقع نہیں ہے کہ وہ صحت یاب ہونے پر خاندان کے کام آ سکیں تو ان کو گھرانے سے باہر نکال پھینک دیا جاتا ہے۔

بلکہ پنجابی مثل ہے کہ ''آیوں پھسی اے تینوں کون چھڑائے'' تو خود آپ جا کر پھنسی ہے اب کے غرض پڑی ہے کہ ملت کا یا اپنی مصروفیتوں کا کام چھوڑ کر خود بھی اس دلدل میں ڈوب جائے مثلاً اگر کوئی چیونٹی شہد میں یا کسی اور جگہ پھنس گئی جہاں سے خود نہیں نکل سکتی تو اس کے ساتھ والیاں آتی ہیں اور شہد لے جاتی لیکن کوئی اس پھنسی ہوئی کی گلوخلاصی کی طرف دھیان تک نہیں دیتی اس شہد کی دلدل سے اس بے چاری کو نہیں نکالتی اور وہ اسی طرح پھنسی کی پھنسی مر جاتی ہے۔ شہد کی مکھیوں اور دیمک کی سوسائٹی میں زخمیوں اور بیماروں کی تیمارداری، اپاہجوں سے ہمدردی کا کہیں نشان تک نہ ملے گا۔

شہد کی مکھی اپنی ہر زخمی بہن کو چھتے سے باہر پھینک دینے میں ہرگز دریغ نہیں کرتی اور ایک دیمک کے لیے تو اپنی بہنوں کی مردہ لاشیں ایک بہت ہی من بھاتا کھاجا ئیں جنہیں مرنے کے بعد فوراً مزے لے لے کر کھا لیا جاتا ہے۔

انسانوں میں بھی ان گنت وحشی قبیلے افریقہ، ایشیا، امریکہ بلکہ یورپ میں بھی انسانوں کا گوشت لذت سے کھاتے پائے جاتے ہیں ذہنی طور پر انسان کا خون انسان بہت شوق سے پیتا دکھائی دیتا ہے۔ انسان انسان کو زندہ بھی رہنے دیتا ہے اور اس کا خون بھی پیتا چلا جاتا ہے۔

چیونٹی کے علاوہ حشرات کا ذکر بھی حفیظ نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ان حشرات میں زیادہ تر سخت جلد رکھنے والی وہ بھونڈیاں یا بھنورے ہیں۔

حفیظ چیونٹی کی دلیری اور بہادری دکھاتے ہیں کہ دیمک بھی اس کے آگے بے بس ہے حالانکہ انسان دیمک کے مقابلے میں بے بس ہیں۔ دیمک کے قلعے اور سرنگوں والے گھر بہت پختہ اور محفوظ ہوتے ہیں لیکن چیونٹی جب کبھی موقع پاتی ہے ان کے اندر گھس جاتی ہے اور دیمک کے نرم جسم کو مزے لے لے کر کھاتی ہے۔ دیمک خواہ کیسی ہی دلیر اور جری کیوں نہ ہو چیونٹی کے مقابلے پر لحہ بھر نہیں ٹھہر سکتی۔ معمولی چیونٹی کے سامنے فوراً ہتھیار ڈال دیتی اور اپنے آپ کو قسمت پر چھوڑ دیتی ہے۔

چیونٹی کا دوسری انواع کے ساتھ جنگ کا نہایت ہی دلچسپ واقعہ حفیظ اپنی زبان سے سناتے ہیں جو انہوں نے ۱۹۲۵ء میں اچھرہ لاہور کے قریب دیکھا۔ وہاں پر بنیے لالہ جی کی ایک بہت بڑی دکان تھی جہاں آٹا، دال، گڑ، شکر، مرچ مصالحے سب کچھ ذخیرہ رہتے تھے۔ ایک دن چینی (کھانڈ) کی بہت سی بوریاں دکان کے باہر دھری ہوئی تھیں جن کے بعض

سوراخوں سے کھانڈ (چینی) کہیں کہیں بکھری ہوئی تھی جس کو چیونٹیاں جنہیں پنجابی میں کیڑے اور مکوڑے کہا جاتا ہے۔ ایک ایک دانہ کر کے اٹھائے جا رہی تھیں اتنے میں فضا میں اڑتے ہوئے ڈیمو (کابلی بھڑیں یا تتیا) نے بھی اس مال غنیمت سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ چیونٹیوں سے یہ برداشت نہ ہوا اور دونوں کے درمیان جنگ شروع ہوگئی اور یہ جنگ شام تک جاری رہی اور پھر دونوں لشکر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ دوسرے روز پھر لڑائی شروع ہوگئی۔ ڈیمو دیکھنے میں چیونٹی سے بہت بڑے ہوتے ہیں اور زیادہ طاقتور بھی ہوتے ہیں۔ چیونٹی اس کے پاؤں کے ساتھ چمٹ جاتی اور جب یہ پرواز کرتا تو وہ ان کی کمر کاٹ ڈالتی ہے اور اس طرح ڈیمو کے دو ٹکڑے ہو کر زمین پر گر جاتے اور چیونٹی بھی گرتی ہے مگر تھوڑی دیر بے ہوش رہنے کے بعد دوبارہ رینگنا شروع کر دیتی ہے اس دن بھی یہ لڑائی شام تک جاری رہی لوگوں کا ہجوم بھی اس لڑائی کو دیکھ کر داد دے رہا تھا۔ اگلے دن پھر لڑائی شروع ہوئی مگر ڈیمو کی تعداد بہت کم رہ گئی اور آخر کار چیونٹی نے میدان مار لیا۔ چیونٹیاں اپنے جبڑوں کی تیز دھار قینچیوں کے بل پر فاتح اور ہم سب پہلی اور شاید آخری مرتبہ دو مختلف انواع کی ارضی و فضائی جنگ کو اپنی جہلت کے لیے تفریح پا کر ہنستے کھیلتے مزے سے اپنے گھروں کو آ گئے۔

حفیظ صاحب نے اس دلچسپ واقعہ میں پنجابی کے الفاظ کا بھی استعمال کیا جیسے چیونٹیوں کو کیڑا یا کیڑے کہا ہے۔ چینی کو کھانڈ کہا ہے۔ ایسے ہی کابلی بھڑیں یا تتیا کے کہنے کے ساتھ ڈیمو کا لفظ بھی استعمال کیا ہے جو کہ پنجابی زبان کا لفظ ہے۔

حفیظ اپنی کتاب میں چیونٹیوں کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ جس طرح انسانوں نے دودھ اور گوشت حاصل کرنے کے لیے جانوروں کو سدھایا اور پالا ہے اسی طرح چیونٹیوں کی چند انواع کے قبیلوں نے تیلیا کیڑوں کو مال مویشی بنا لیا اور ان سے دودھ یعنی میٹھا رس حاصل کرنے لگیں اور گلے کے گلے، ریوڑ کے ریوڑ کی ملکہ بن گئیں اور ان ہی کو نہیں بلکہ جس زمین پر کیڑے پائے جاتے تھے اس علاقے کو بھی اپنی ملکیت سمجھ لیا اور اپنا سرمایہ اور اپنا ورثہ شمار کرنے لگے۔

انسانوں کے بعض قبیلیوں نے سوچ بچار اور تجربے کے ساتھ کہیں کہیں گندم اور دوسری اجناس کی کاشت سیکھ لی اور اس کو ترقی دیتے ہوئے اپنے گودام برسوں تک خراب نہ ہونے والی خوراک یعنی دانے دُنکے وغیرہ سے بھر لیے انہی چیزوں کے سبب جنسوں کے ادل بدل کے کاروبار کی تقسیم کا رواج ہوگیا اور یہ رواج ہمیشہ کے لیے مستقل ہوگیا اسی پر سوسائٹی کا دارومدار ہے۔

حفیظ کہتے ہیں کہ جس طرح انسانوں کے درمیان فرق پایا جاتا ہے جیسے مرد اور عورت میں، بچے اور بالغ میں فرق یا پھر ہیجڑے لیکن حفیظ چیونٹیوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ان کی نوعیتیں چار ہزار کے لگ بھگ ہیں یا اس سے بھی زیادہ ہیں ان کی ایک نوع کے اندر کئی کئی ذاتیں پاتیں ہیں ان کی شکل وصورت اور جسم سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔

بعض چیونٹیاں انسانوں کے لیے مفید ثابت ہوتی ہیں ہمارے وطن میں چیونٹی کی ایک نوع ہولومرمیکس

(Holomyrmex) بھی جس سے ہم انسانوں کو فائدہ بھی مل جاتا ہے۔

مدراس کے علاقے میں چیونٹی کی دو انواع کو بلا ارادہ انسانی مکانوں اور گوداموں کو دیمک سے پاک رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں دیمک لگ رہی ہو وہاں ان چیونٹیوں کو لا کر چھوڑ دیا جاتا ہے اور یہ چیونٹیاں دیمک کا گوشت مزے لے لے کر کھاتی ہیں اس طرح کچھ مدت میں دیمک کی تعداد یا تو بہت ہی کم رہ جاتی ہے یا ختم کر دی جاتی ہے۔

آخر میں حفیظ چیونٹی کی قوت کا مقابلہ انسان کی قوت سے کرتے ہیں کہ چیونٹی اپنے وزن سے کئی گنا زیادہ بوجھ اٹھا سکتی ہے جیسے گندم کا دانہ اس کے وزن سے زیادہ بھاری ہے جبکہ انسان اپنے وزن سے زیادہ کا بوجھ بھی اٹھانے سے ڈرتے ہیں۔

حفیظ اپنی کہانی دارِ فانی میں یہی کچھ ہے
ادھر گزری شبِ فرصت، ادھر یومِ حساب آیا

نثرانے

حفیظ جالندھری کی نثری تصنیفات میں سے ایک اہم تصنیف ''نثرانے'' بھی ہے جس میں ان کے لکھے گئے متفرق مضامین شامل ہیں اور خود انہوں نے اس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

> ''یہ کتاب نثر کے ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو حالات کے مشاہدات اور تجربات سے پیدا شدہ خیالات مجھ سے لکھواتے رہے''۔۵

نثرانے حفیظ صاحب کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے اور یہ مضامین ادبی، سوانحی، تنقیدی، اسلامی، معاشرتی اور کچھ موضوعاتی متفرق قسم کے مضامین شامل ہیں اس کے علاوہ اس کتاب کے اندر کچھ خطوط بھی شامل ہیں۔ سب سے اہم مضامین جو اس کتاب میں شائع ہوئے وہ ادبی مضامین ہیں جو مختلف شعراء کے بارے میں حفیظ صاحب نے اپنے خاص انداز میں لکھتے ہیں۔

(ا) ادبی مضامین

(ا) ہم۔ اہل قلم

(۲) تخلیق اور شہرت

(۳) کامیاب زندگی

(۲) سوانحی مضامین

(ا) علامہ مشرقی

(۲) دوری بھی حضوری بھی

(۳) ''مرحوم'' شاہد

(۴) عابد علی عابد

(۳) تنقیدی مضامین

(ا) غالب

(۲) ملی کردار پر ہماری شاعری کا اثر

(۳) احمد ندیم قاسمی

(۴) میزانِ اقبال کے خلاف

(۴) اسلامی مضامین

(۱) کیوں اسلامی معاشرہ نہیں؟

(۵) خطوط

(۱) پانچ اشعار کا انتخاب

(۶) متفرق مضامین

(۱) اردو کی مخالفت

(۲) جالندھر کا بہشتی دروازہ

(۳) شعر، شاعر اور مشاعرے

(۴) بھارتی حملے سے چند برس پہلے

(۵) ہمارے کلمہ گو اچھوت

(۶) اب فرشتے آئیں گے تنبیہ کو

(۷) پتنگ اور شاعری

(۸) قدم کس رُخ پر

(۹) نادر ''عجوبہ''

(۱۰) ہمارے بھوت پریت

(۱۱) ''سہیلیاں'' حیرت اور عبرت

(۱۲) پنجابی حفیظ

(۱۳) ہلال عید

(۱۴) کیا غزل کی اہمیت ختم ہوگئی ہے

(۱۵) ہمارے تمدنی دوزخ اور بہشت

1. ادبی مضامین

(i) ہم۔اہل قلم:

ان سطور میں ہم مختصراً ان مضامین پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔حفیظ جالندھری نے اپنے اس ادبی مضمون ''ہم۔اہل قلم'' میں افسانوی اسلوب سے کام لیا ہے۔

> ''بُری تحریر، بُری کتاب، بُرے کاموں اور بُری تقریروں سے بہت ہی زیادہ بُری ہوتی ہے کیونکہ وہ آئندہ نسلوں کے خیالات کو بُرائی کے سانچے میں ڈھالتے رہنے کا زبردست ذریعہ بن جاتی ہے''۔٦

جب تک یہ طلسم ہستی موجود ہے۔انسانی دنیا کی کوئی چیز ضائع نہیں ہوسکتی۔ایک کتاب، ایک فقرہ ایک لفظ کبھی فراموش یا گم نہیں ہوسکتا۔جو اہل قلم شرارت یا غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں وہ لکھنے کے کچھ دیر بعد یہ سمجھتے ہیں کہ بات آئی گئی ہو گئی ہے۔لیکن شرارت یا غلطی کی پاداش ہمیشہ ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔باتیں، اعمال، خیالات کتنے ہی خفیف اور بے حقیقت کیوں نہ ہوں مگر وہ عارضی نہیں ہوتے بلکہ دیرپا اور ابدی ہوتے ہیں۔خراب لفظ کبھی معدوم نہیں ہوتا بلکہ سوگنا قوت کے ساتھ گونج بن کر ہم کو اور ہماری نسل انسانی کو سزا دینے آجاتا ہے اور قیامت کے بعد بھی قائم رہے گا۔آدمی جو کچھ کہتا ہے اس کا جواب دہ ہوتا ہے وہ اپنی ہی باتوں سے بے گناہ ثابت اور مبرا ہوتا ہے اور اپنی ہی باتوں سے مجرم اور سزاوار ٹھہرایا جاتا ہے۔

بُری مثالیں اور بُرے کام اپنے ساتھ ہمیشگی کی زندگی ساتھ لاتے ہیں۔اچھی باتوں کی طرح بری باتیں بھی ورثے کے طور پر ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے تک پہنچتی اور بڑھتی پھیلتی رہتی ہے۔

زمین و آسمان کی درمیانی فضا میں ایک وسیع صفحہ ہے جس پر انسان کی ہر بات نقش ہوجاتی ہے خواہ وہ بلند آواز یا سرگوشی کے انداز میں کہی گئی ہو یا ارادے اور خیال میں مرکوز رہے۔خیالات، الفاظ اور اعمال کا اثر انسان اور اس کے ہم جنسوں پر پڑتا ہے۔

جب خیالات و الفاظ کی برائی کا یہ حال ہے تو بری کتابوں، بری تحریروں اور اس نوع کے لٹریچر کے بداثرات کس قدر ہولناک نتائج پیدا کرتے ہوں گے۔بری کتاب کا مصنف نوع انسانی کی تباہی کا باعث بنتا ہے وہ خود تو خاک میں مل کر خاک ہوجاتا ہے لیکن اس کی کتاب برائی، بداخلاقی اور شرارت پھیلانے کے لیے زندہ رہتی ہے۔ہمارے یہاں یہ آج کل

آرٹ آرٹ کا شور برپا ہے ایسے آرٹ کو کیا کریں جو ہماری نسل کو بداخلاقی کا سبق سکھانے میں پیش پیش ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فن کو فن کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے اگر نفاست کو پیش نظر رکھا جائے تو برائی کا آدھا اثر دور ہو جاتا ہے یہ خیال شر انگیز اور بہت ہی گمراہ کن ہے وہ برائی بہت ہی خطرناک ہے جو رنگین لفظوں اور حسین بندشوں میں مرصع ہو کر ہمارے دل میں کھب جائے۔ جیسے گھناؤنی کہانیوں، افسانوں اور ناولوں کو جو نہایت نفیس عبادت آرائی کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں فروخت کیے جاتے ہیں اور جن کو ہماری نوجوان نسل بڑے شوق سے بڑھ کر اور پھر ہیرو بننے کی کوشش کرتی ہے۔ ان افسانوں اور ناولوں کی رسائی شریف گھرانوں کی معصوم عورتوں تک بھی کی جاتی ہے جس کے باعث وہ خود کو انہی کرداروں میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں اور نتیجتاً ایک خاندان کی بے عزتی اور ایک ناموس کی بربادی پر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ننگے سینمائی گیت جو ہماری نوجوان نسل کو تباہی کے گڑھے میں لے جانے کے لیے پیش پیش ہیں جن کو ٹی وی اور ریڈیو کی نشریات کے ذریعے گھروں، بازاروں اور گلیوں میں سنایا اور گایا جاتا ہے۔ اس سے ہمارے ملک کی فضا تھرا رہی ہے۔

اچھی کتاب اگر زندگی کا خزانہ ہے تو بری کتاب ایک ڈائن ہے جو کلیجہ چاٹ جاتی ہے۔ ہم ان کتابوں کو برا سمجھتے ہیں جو خود غرضی، بے اعتمادی، بداعتقادی اور سفلی جذبات ابھارنے میں مدد دیتی ہیں اور جذبات کو ہیجان میں لا کر انسان کو جانور بننے پر اکساتی ہیں۔

حفیظ جالندھری اپنے اس مضمون میں اہل قلم کو انہی کی ماں، بہن اور بیٹی کا واسطہ دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ:

> ''آئندہ نسل کا نام لے کر منت کرتا ہوں کہ ایسے ادب کو پڑھنے اور ایسی کتابیں لکھنے سے ہمارا دور حیات ختم ہوتا ہے قطعی بربادی کا احتمال ہے اس انداز تحریر کو ختم کیجئے ورنہ آنے والا زمانہ تم پر لعنت بھیجے گا''۔ ۷

بہر حال کچھ لوگ اچھی نثر لکھتے ہیں اور کچھ بری اور ایسا ادب جو برائی کی طرف مائل کرنے والا ہو وہ نسلوں کو تباہ کرتا ہے اور پڑھنے والے اس سے متاثر رہتے ہیں برائی جن کی کتابوں کو لکھ کر منتقل کی جاتی ہے وہ مصنف خود تو ختم ہو جاتے ہیں مگر ان کی پیدا کردہ برائی ان کی کتاب کی شکل میں ہمیشہ باقی رہتی ہے اس سلسلے میں حفیظ صاحب نے ایک بڑی اچھی عمدہ مثال کے ذریعے وضاحت کی ہے اس مثال کو انہوں نے ''مصنف اور ڈاکو'' کے نام سے بیان کیا ہے کہ:

روحوں کی مملکت میں عادل صادق کے سامنے فیصلے کے لیے دو گناہگار ایک ہی وقت میں پیش ہوئے ان میں سے ایک سفاک ڈاکو اور دوسرا مشہور و معروف مصنف تھا۔ جیسے ہی عدالتی کارروائی شروع ہوئی تو فوراً فیصلہ سنا دیا گیا کہ دونوں کو ایک ایک دیگ میں ڈال کر نیچے آگ جلا دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکو کی دیگ کے نیچے آگ

کے شعلے بلند ہوئے اور وہ چیختا رہ گیا اس کی سزا بہت سخت معلوم ہوتی تھی اور اس کے مقابلے میں مصنف کی سزا بہت کم معلوم ہوتی تھی کیونکہ یہ بہت آہستہ آہستہ سلگتی آگ تھی مگر صدیاں گزر گئیں ڈاکو کی سزا بہت جلد ختم ہو گئی لیکن مصنف کی سزا ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے خدا سے شکوہ کیا کہ اس کی سزا ختم کیوں نہیں ہو رہی تو ایک فرشتہ سامنے آیا اور اس نے کہا کہ یہ سزا ختم نہیں ہو رہی کیونکہ تم نے دنیا میں جو بُرا اخلاق پھیلایا اس کی تباہ کاریاں صدیوں سے نسل در نسل منتقل ہو رہی ہیں جس کی وجہ سے اس کی سزا ختم نہیں ہو رہی کیونکہ مصنف نے اپنے دور میں جس آزادی کی بات کی تھی وہ یہ آزادی تھی جس میں مصنف نے لوگوں کو خدا سے برگشتہ کیا۔ انہیں پیار کے نام پر ہوس سکھائی اور ان کے اخلاق کو تباہ کیا جس کا نتیجہ آنے والی نسلوں کی تباہی ہے فرشتے نے مصنف کو برا بھلا کہا اور اس کی دیگ کا ڈھکن بند کر دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی سزا قیامت تک قائم رہے گی کیونکہ اس کی تصنیفات قیامت تک لوگوں کو گمراہ کرتی رہیں گی۔

(ii) تخلق اور شہرت

حفیظ جالندھری اس مضمون ''تخلیق اور شہرت'' میں محقق کی غواصی کا اس انداز سے ذکر کرتے ہیں۔

''محقق کی کوشش اس غواص کی سی ہے جو سمندر کی تہ ٹٹولتا ہے اور مٹھی بھر کر باہر نکل آتا ہے اکثر اوقات اس کی مٹھی سنگریزوں سے بھری ہوتی ہے کبھی کبھار موتی بھی مل جاتا ہے لیکن وہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ سمندر کا بہترین موتی یہی ہے''۔۸

حفیظ جالندھری نے اس مضمون میں مصنف اور اس کی تخلیقات پر بحث کی ہے۔ ہم سب مسلمانوں کا ایمان اس بات پر ہے کہ اللہ اور اللہ کے کلام کے علاوہ باقی سب کچھ فانی ہے۔ مگر اشرف المخلوقات میں سے کچھ انسان ایسے بھی ہیں جو خود تو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے مگر اپنے پیچھے اپنے وجود سے زیادہ پائیدار یادگاریں اپنے ہم جنسوں کے لیے چھوڑ جاتا ہے اس طرح آنے والی نسلوں کو ان گزری ہوئی سیرتوں کا اندازہ ہوتا ہے ان کی کمزوریوں اور ان کے فوائد سے آگاہی ہوتی ہے ۔انسانوں کے یہ نقوش بعض کو ابتدا ہی میں رخصت ہو جاتے ہیں اور بعض اپنے خالق کی رخصت کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہ تخلیقات عام طور پر تعمیرات، مصوری، موسیقی، انشا پردازی اور شاعری پر مشتمل ہیں۔

شاعری کی تخلیق شاعر کی شخصیت، زندگی، ذہن اور حِس کے امتزاج سے ہوتی ہے۔ تب وہ سانس لیتی، پھلتی پھولتی اور ماحول کو متاثر کرتی ہے اور ماحول سے متاثر ہوتی ہے۔ شاعر اپنی تخلیقات پیش کرنے کے بعد خود تو گوشہ قبر میں جا سوتا ہے لیکن اس کی روح سے گونجا ہوا نغمہ اس کی شخصیت، مزاج اور اس کے ذہن کی آئینہ داری کرنے کے لیے ایک عرصہ تک قائم

رہتا ہے۔اس کی شاعری سے اس کے ماحول اوراس کے تمدن اور معاشرت کا انداز ہوتا ہے۔شاعروں کی شاعری بھی عجیب وغریب چیز ہے۔وقت، حالات اوراہل خانہ کب سے اسے آسمان کی بلندیوں پر لے جائیں اور کب ان کوزندہ درگور کردیں اس کی مثال ایک اندھا شاعر ہوکر جب دنیا میں جسمانی طور پر موجود تھا تو لوگ اس کے اشعار سن کر بھیج بھی نہیں دیتے تھے لیکن جب وہ یونان کے سات شہروں کے گلی کوچوں میں بھیک مانگا کرتا تھا تب اہل زمانہ اس کی جائے ولادت پر ایک دوسرے سے جھگڑا کرنے لگے ان میں سے ہر ایک شہر اس امر کا دعویٰ کرنے لگا کہ رزمیہ شاعری کا یہ عظیم الشان دیوتا میری ہی خاک پاک سے نسبت رکھتا ہے۔

شکسپیئر اور غالب کی مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ معاصرین کی رائے حتمی فیصلہ نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی شعر کی اصلی قدر و قیمت کو پرکھنے کے لیے کوئی معیار مقرر ہوتا ہے۔ہمعصروں نے امامی کو سب سے بڑا شاعر مانا اور سعدی کو تیسرا درجہ دیا۔لیکن وقت نے امامی کو بھلا دیا اور سعدی کا نام اور کلام آج بھی بچے بچے کی زبان پر ہے۔اسی طرح کچھ ایسے بھی تھے جن کو ہمعصروں نے انتہائی عزت واحترام کا مستحق گردانا اور انعام واکرام سے بھی نوازا۔

شاعر کی قبولیت کا بھی کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا کہ کب اس کے ہمعصر دوست اسے شہرت کا تاج پہنانے کے لیے کوشش کرتے ہیں اور کب اس کے ہمعصر مخالفت میں زمین وآسمان تہ وبالا کر دیتے ہیں۔حافظ شیرازی کی قبولیت ان کی زندگی سے اس وقت تک قائم ودائم ہے۔ایک محقق اپنی تحقیق کے لیے سمندر کی تہہ تک جاتا ہے اور بعض اوقات اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بعض اوقات وہ قیمتی موتیوں کو بھی حاصل کر لیتا ہے۔موتیوں کو پرکھنے کے لیے جوہری ہوتے ہیں جو موتیوں کی جسامت اور وزن کے لحاظ سے ان کی قیمت لگاتے ہیں۔اسی طرح اشعار کو پرکھنے کے لیے نقاد ہیں جو شعر وسخن کے انبار کو الٹے پلٹتے ہیں اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ان کی قدر و قیمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ہر زمانہ اپنا معیار خود وضع کرتا ہے اور گزرے ہوئے زمانوں میں بھی یہی ہوا ہے اور آئندہ بھی یہی ہوگا یہاں پر حفیظ صاحب قلم برداشتہ کہتے ہیں کہ مجھے اپنا ایک پرانا شعر ہی کافی ہے۔

نغمے سے جب پھول کھلیں گے، چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن لیں گے ، تو اپنی دھن میں گاتا جا

(iii) کامیاب زندگی

حفیظ جالندھری نے اپنے اس مضمون میں کامیاب زندگی گزارنے کے مختلف پہلوؤں اور اس کے بارے میں مختلف النوع خیالات کا اظہار کیا ہے۔

> ''یہ میری آنکھوں کی خطا ہے۔ بہر آئینہ میں نے تو زندگی کے بارے میں کسی کو مطمئن نہیں دیکھا۔ شاید مطمئن نہ ہونا ہی ابن آدم اور بنتِ حوا کی زندگیوں کا مقصود موجود ہے۔ اگر یہ بات ہے مسئلہ حل ہو جاتا ہے یعنی وہ انسان جو اپنی ذات کو نا کام پاتا ہے کامیاب ہے''۔۹

حفیظ سے کسی نے پوچھا کہ کامیاب زندگی کیا ہے؟ کامیاب زندگی کس نے بسر کی ہے؟ تو ان کا کہنا ہے کہ یہ بے ڈھب سوالات ہیں فیلسوف مفکرین کے علاوہ ان کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں آئے مجھے اکہتر برس ہونے کو ہیں۔ لاکھوں، ہزاروں آدمیوں کو دیکھنے، ملنے جلنے اور سینکڑوں سے شیر و شکر ہونے کا شرف ملا ہے مگر میری ملاقات کسی ایسے خوش بخت سے نہیں ہوئی جو اپنے منہ سے اپنی ساری زندگی کے بارے میں کامیابی کا دعویٰ کرے۔

ہمارے سارے معاشرے کی صورت حال کچھ ایسی ہے کہ کامیاب ہونا اور کامیاب سمجھ لیا جانا کسی بڑے خطرے کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے، کوئی ایسا شرمناک فعل اور گناہ ہے جس کا اعتراف کر لینے سے مرگ و ہلاکت نہ سہی منہ دکھانے کے قابل رہنا کسی بھی صورت ممکن نہیں ہوتا۔

دوسرے افراد کو کامیاب جان کر رشک فرمانے والے تو بے شمار ہیں اگر کامیاب زندگی کسی فرد کی ذاتی تمناؤں اور آرزوؤں، امنگوں کے پورے ہو جانے یا مسلسل پوری ہوتی چلی جانے سے عبارت ہے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ انسانوں میں سے کوئی بھی ایسا عالی ظرف نہ ملے گا جو اپنی زبان سے یہ کہہ رہا ہو گا کہ ایسے لوگ بھی ہوں گے ان کی کوئی امید بر آئی ہو گی مگر ہمارا تو کوئی مطلب، کوئی خواہش یا آرزو پوری نہیں ہوئی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ جھجکتے ہوئے شاید یہ مان لیں کہ فلاں کام کر لیا یا وہ ہمارے وہ ارمان پورے ہو گئے لیکن ایک دو خواہشوں کا پورا ہو جانا تو ساری زندگی کی کامیابی نہیں کہلا سکتا۔ غالب نے اس حقیقت کی بڑے خوبصورت انداز میں ترجمانی کی ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

حفیظ کہتے ہیں کہ میں اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر یہ سمجھتا ہوں کہ آدمی بقائمی ہوش وحواس اپنی زندگی کامیابی سے گزارنے کا اقرار کرنا چاہتا ہی نہیں یا پھر کر ہی نہیں سکتا اور اقرار سے گریز، یہ اقرار نہ کرنا اور نہ کرسکنا ہی ثبوت ہے اعتراف ناکامی کا۔

کسی فن میں کامیاب رہنے کے سلسلے میں حفیظ کے ہمعصر تعلّی باز شاعروں یا ادیبوں کے سوا کوئی ایسا نظر نہیں آیا یعنی ایسا صاحب فن بھی نہیں دیکھا جس کو ہم اگر سنجیدگی کے ساتھ یہ کہہ دیں کہ آپ اپنے فن کی تخلیق میں کامیاب ہیں اور اس کی تحسین میں بھی تو وہ کچھ اس انداز سے جواب دیتا ہے کہ اس کو سننے سے داد دینے والا خود شرما جاتا ہے۔

حفیظ نے اپنے اردگرد کے انسانوں کی دنیا میں کبھی کسی کو کامیاب زندگی کے جرم کا اقرار کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ البتہ کہانیوں، افسانوں اور سوانح لکھنے والوں نے کامیاب زندگی کی بے شمار شاہراہیں تیار کر رکھی ہیں۔

ہر انسان کی زندگی کے سفر کا آغاز قصوں، کہانیوں سے ہوتا ہے۔ بچپن میں دادا، دادی کی سنائی ہوئی بادشاہوں، شہزادوں، شہزادیوں اور جنوں پریوں کی داستانوں سے ہوتا ہے لیکن ان کا اثر بچپن کے گزرنے کے ساتھ ہی گزر جاتا ہے۔ لیکن حفیظ کو وہ ناول اور افسانے یاد ہیں جن کا اثر قبول کر کے کامیاب زندگی گزارنے کے لیے گھر سے کئی مرتبہ بھاگ نکلے لیکن کبھی خود ہی واپس آ گئے اور کبھی ان کو واپس لایا گیا۔ حفیظ کو اپنی زندگی کے آغاز میں اپنے کنبے، گلی، محلے، حاکم، اہلکار، وکلاء، ملا، امام، واعظ، مذہبی اور سیاسی رہنما سب ان کو دلکش نظر آتے تھے مگر ان کے دل میں کبھی بھی ان سب کی پیروی کرنے کا خیال نہ آیا۔ حفیظ نے اپنی زندگی میں اپنے ہر طرح کے شوق پورے کیے۔ مثلاً تھیٹر کے ایکٹروں کے آگے پیچھے، پہلوانوں کے گرد منڈلانے، شکاری بنے، بٹیریں لڑائیں، کبوتر پالے، شکرہ داہنے ہاتھ پر بٹھایا۔ لیکن یہ تمام شوق چند روز سے زیادہ کے نہ تھے۔

عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناولوں نے حفیظ کے دل میں اسلامی شجاعت کا عجیب جذبہ ضرور پیدا کیا مگر اس کا تاثر صرف بہادران اسلام کے کارناموں کو احترام اور فخر سے دیکھنے تک ہی محدود رہا۔ حفیظ کی عمر جب گیارہ برس تھی تب انہوں نے افسانوی دنیا کا بہت زیادہ اثر قبول کیا اور اسے حقیقی دنیا سمجھنے لگے۔ انہوں نے ایک کتاب ''الہ دین اور لیلے'' یہ اردو ترجمہ تھا ولیم رینالڈز کے ایک ناول ''سٹار آف منگریلیا'' کا یہ کہانی طولانی اور متعدد ''تاریخ نما'' افسانوی واقعات سے معمور تھی کا بہت زیادہ اثر قبول کیا۔ مصنف نے ناول میں سلسلہ ہائے کوہ قاف کی ناف میں ایک چھوٹی سی جنت الفردوس کا واقعی موجود ہونا دکھایا اور ساتھ ہی اس میں جیتے جی داخل ہونے کا راستہ بھی بتایا ہے۔ حفیظ نے اسے کئی بار پڑھا اور وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ واقعی ایسا فردوس اس زمین پر موجود ہے۔ جس کی میرے سوا کسی کو خبر نہیں اس ناول کے ذریعے خدا کی طرف سے مجھے یہ شرف ملا ہے کہ میں جا کر اس کی سیر کروں۔

حفیظ نے اس ناول کو پڑھ کر جو تصور قائم کیا وہ کچھ یوں ہے۔

''یہ ایک چھوٹی سی وادی ہے جس میں نہ موذی درندے ہیں اور نہ ہی نقصان پہنچانے والے جانور ہیں۔ وادی کے چاروں طرف برف سے لدے ہوئے پہاڑ ہیں بارہ مہینے دن رات برف باری ہوتی رہتی ہے اور سردی اس قدر ہے کہ انسان تو کیا جانور بھی سردی کی وجہ سے اس جنت میں پھلا نگنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن اس قدر نرم جزیرے اندر ایک ایسی چھوٹی زمین ہے جہاں نہ تو سرد ہوائیں داخل ہو کر کسی کے جسد خاکی کو پلپلاتی ہیں اور نہ آندھیاں آفت ڈھاتی ہیں۔اس زمین کا ہر گوشہ گل اندر گل اور بہار اندر بہار ہے۔ اس میں کہیں آب گرم اور کہیں آب سرد کے چشمے ابلتے ہیں۔اس کے اندر خوبصورت درختوں اور پودوں کے انبار ہیں اور خوبصورت قسم کے جانور موجود ہیں جن کا دودھ آسانی کے ساتھ دوہا جا سکتا ہے اور یہاں کے پتھروں کو مرمر اور سنگ ریزوں کو لعل ہیرے جواہر بنا رکھا ہے۔ جو ہر طرف بکھرے پڑے ہیں اس کے اندر داخل ہونا ایک عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے البتہ انسانی کاریگری ہی کا بنا ہوا ایک راز ہے۔ جو ہر دور میں تین آدمیوں کو لازماً معلوم رہتا ہے ان تینوں میں جو بھی مرنے کے قریب ہوتا ہے وہ اپنے دوسرے دو کی اجازت سے ایک خاص کردار کے مرد یا عورت کو یہ راز بتا جاتا ہے۔اس راز کو جاننے والا صرف ایک بوڑھا سوداگر زندہ تھا دوسرے دو راز دار اچانک مر گئے تھے۔اس بوڑھے سوداگر نے اپنے دوسرے دو رازداروں کی وصیت کے مطابق اپنی موت سے بیشتر منگریلیا کی دوشیزادہ شہزادی لیلیٰ کو اور قسطنطنیہ کے جواں سال امیر زادے الہ دین کو یہ راز بتا دیئے تا کہ اس بوڑھے سوداگر سمیت راز دار دنیا میں موجود رہیں۔ چنانچہ بوڑھے سوداگر نے پیغام بھیجا کہ وہ بھیس بدل کر ایک ہی روز ملک جارجیا کے دارالسلطنت طفلس میں وارد ہو جائیں اور ساتھ ہی ان کو ایک ایک انگشتری بھی بھیجی تا کہ ایک دوسرے کو پہچاننے میں آسانی ہو۔ بوڑھے سوداگر نے اپنے ایک خاص غلام کو پیغام دے کر بھیجا تھا مگر وہ یہ سمجھا کہ اس کا آقا سوداگر کسی خفیہ خزانے میں سے کچھ لینے کے لیے اکیلا پہاڑوں کا سفر کرے گا۔اس کو اپنے مالک سے بے ایمانی کی سوجھی اور اس نے مشہور راہزن سے مل کر سازش کی کہ دونوں مسافروں کو حراست میں لے کر مار دیا جائے گا اور دونوں شناختی انگشتریاں چھین لی جائیں گی اور پھر ڈاکو خور الہ دین اور اپنی بیوی کو لیلیٰ بنا کر سوداگر کے سامنے پیش ہوگا اور اس طرح وہ خفیہ خزانے کے مالک بن جائیں گے۔ چنانچہ ڈاکو نے ایسا ہی کیا مگر الہ دین کی شجاعت اور حواس نے لیلیٰ کو بچا لیتا ہے۔ بوڑھا سوداگر دونوں کا انتظار کرتے کرتے اور ان کی رہنمائی کے لیے کاغذ پر کچھ لکھ رہا ہوتا ہے کہ جل مرتا ہے اور کاغذ کا بہت سا حصہ بھی جل جاتا ہے لیکن غلام کو اس کی خبر نہیں ہوتی مگر ان دونوں کو مل جاتی ہے اور آخر کار دونوں کی شادی ہو جاتی ہے پھر جنت

الفردوس کی وادی میں ان کی آبادی کے بعد اس بے اندازہ دولت خداداد کا دنیا بھر کی بھلائی کے لیے استعمال ہوتا ہے"۔۱۰

اس ناول کو پڑھ کر حفیظ طفلس اور کوہِ قاف کے خواب دیکھنے ہی میں نہیں بلکہ اس خواب کی تعبیر کو پورا کرنے کی دھن میں لگ گئے۔ بچپن میں انہوں نے مرنے کے بعد ملنے والی جنت کے بارے میں مولوی صاحبان سے سن رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے ایک ہم سن فوجی کو ساتھ لیا اور گھر سے بہت سارو پیہ ہتھیا لیا اور بمبئی پہنچ گئے۔ ان کے خیال میں جس طرح ریل کا ٹکٹ لیا جاتا ہے اسی طرح قسطنطنیہ کا ٹکٹ لے کر جہاز میں سوار ہو جاؤں گا۔ قسطنطنیہ پہنچ کر ترکوں کی فوج ظفر موج میں افسر بنوں گا۔ بلغاریہ، سرویہ، رومانیہ کے دھرے بکھیر دوں گا اور روس کے زار کو اسلامی دنیا کے خلیفہ کے ساتھ شرارت کرنے کا ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ وہ تخت چھوڑ کر بھاگ جائے گا تو پھر گرجستان میں گھس کر طفلس کی سیر کروں گا۔ کوہِ قاف کے پہاڑوں کا کلیجہ چیر کر اپنے خوابوں کی شہزادی یعنی اس رشک وادی کو تلاش کر لوں گا پھر وہی وادی میرا مرکز مقام ہوگی اور میں خشکی کے راستے ایران، افغانستان کے لوگوں کو اپنی شان دکھاتا ہوا جالندھر آیا اور جایا کروں گا۔ انہی خیالوں میں وہ بمبئی تو پہنچ گئے مگر وہاں پہنچ کر وہاں بھیڑ بھاڑ میں ایسے گم ہو گئے کہ ترکی اور بلقان کی جنگ میں شامل ہونے کا جذبہ کہیں بچھڑ گیا اور پھر خیال تب آیا جب جیب خالی ہوگئی اور جالندھر واپس جانے کے لیے بھی پیسے نہ رہے تب انہوں نے جہازوں میں ملازمت کرنے کا سوچا مگر صرف حسرت سے ان بڑے بڑے جہازوں کو دیکھتے ہی رہے کہ ایک صبح ان کے خوجی کی نظر حفیظ کے ابا میاں پر پڑی وہ خود تو بھاگ گیا مگر حفیظ پکڑا گیا اور پھر سے اسکول جانا پڑا۔

کامیاب زندگی گزارنے کے لیے حفیظ کی یہ پہلی کوشش تھی۔ افسانے سے متاثر ہو کر جنت میں پہنچ جانے کے لیے حفیظ کی یہ روداد افسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

اسی طرح ہمارے قوم وملت کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں کامیاب زندگی کے لیے کیا کیا امنگیں اپنے دل میں پالتے ہیں اور پھر ان میں سے کتنے ڈاکہ زنی، فحاشی، چوری، رہزنی اور غارت گری پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ملک اور ہمارے معاشرے کے نوجوان افسانوں اور ذاتوں کو پڑھ کر اپنی زندگی کے آغاز میں ہی انہیں حقیقت سمجھ کر خود ان کے ہیرو بن جاتے ہیں اور اپنی کامیاب زندگی گزارنے کے لیے اس افسانے یا ناول کے ہیرو کا کردار ادا کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں صرف ذلت ورسوائی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

وہ نوجوان جو آغاز ہی سے ان کہانیوں کی گمراہی سے باخبر کیے جاتے ہیں کیا ہمارے ملک اور ہمارے معاشرے میں تعلیمی اور تہذیبی دنیا اس مقام پر پہنچ گئی ہے۔ جہاں ایک نوجوان کو آغازِ حیات ہی میں حقیقت اور افسانے کے درمیان امتیاز کا شعور مل جائے۔ حفیظ کا خیال ہے کہ ابھی تک ہمارا ماحول حقیقت نہیں بلکہ افسانے ہی کا بہروپ ہے۔ اس لیے پوری

نوع انسانی کیا کسی ایک آدمی کی تقدیر کا کامیاب زندگی بسر کرنا کیسے ممکن ہے؟

(۲) سوانحی مضامین

(۱) علامہ مشرقی

''علامہ مشرقی'' ایک سوانحی مضمون ہے۔ حفیظ نے اس مضمون میں اپنے زمانے کی ایک معروف اور شعلہ بیان شخصیت کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ وہ چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔

> ''یہ عظیم حکیم لفظ کی صورت گری ہی سے نہیں بلکہ معنی سے قلوب پر اثر انداز ہوتا ہے وہ اپنے آنسو بوتا ہے اور ایسے ستارے اگانے کے لیے سینہ کاری میں لگا رہتا ہے جو کج روی اختیار نہ کریں۔ ساتھ ہی ساتھ زمین و آسمان میں کج روی اور تفرقے کے مارے ہوئے انسانی ستاروں کے ٹکرانے سے جو حشر برپا ہوتا ہے اس سے بھی بے نیاز نہیں۔ ان سب کو راہ پر لانے کے لیے کوشاں ہے''۔۱۱

علامہ مشرقی کے علم و کمالات کی گونا گونی اور بوقلمونی پر اہل نظر و فکر بہت بہتر انداز سے روشنی ڈال رہے ہیں۔ حفیظ کو بھی علامہ سے قربت حاصل تھی۔ علامہ نے کئی بار راستے میں روک کر حفیظ کو مخاطب کرنے کا شرف بھی بخشا۔ وہ اپنی عظیم شخصیت ہونے کے باوجود لاہور کی سڑکوں پر پیدل چلتے پھرتے تھے۔ حفیظ کہتے ہیں کہ ان کی سپاہیانہ وردی ان کی قائدانہ مگر بے تصنع شاندار وضع اور عزیمانہ رفتار آج بھی میرے تصور میں ہے۔ علامہ حفیظ کو محض شاعر اور سیاسی و معاشرتی آویزشوں سے الگ تھلگ صرف شعر و شاعری کے تاثر سے روحوں کو گرمانے والا سمجھ کر بے تکلفانہ پکار لیتے تھے۔ حفیظ سلام کرتے تو وہ کلام سے محروم نہیں رکھتے تھے۔ کئی دفعہ علامہ کے ساتھ ان کے چند پیروکار بھی ہوتے تھے لیکن اکثر علامہ اکیلے ہی دکھائی دیتے تھے۔ جب ان دونوں کی ملاقات ہوتی تو علامہ حفیظ کو جو کام وہ ان دنوں کر رہے ہوتے تھے اس پر حوصلہ بخشتے تھے اور پھر اپنی راہ اختیار کرنے سے پہلے حفیظ کی شاعری کا ہی ایک بند سنا دیتے جس میں کسی زمانے میں انہوں (حفیظ) نے یہ لکھا تھا کہ:

تجھے سمجھتے ہیں اہل دنیا — خراب خستہ ذلیل رسوا
نہیں عیاں ان پہ حال تیرا — کوئی نہیں ہم خیال تیرا

کسی کی پروانہ کر پیئے جا

لیکن علامہ مشرقی پیئے جا کی جگہ جیے جا لگا دیتے تھے۔ وہ حفیظ کو حفیظ صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ان دونوں کی ملاقاتوں کا یہ سرسری شرف اچھرہ کے اڈے پر یا لاہور کے میوہسپتال سے نیلے گنبد تک لانے والی سڑک پر ہوتا تھا۔ لیکن یہ آہستہ آہستہ کم ہو گیا۔

حفیظ کہتے تھے کہ علامہ مجھے روک کر اپنے اشعار سنانا شروع کر دیتے تھے اور بہ اصرار سناتے چلے جاتے تھے۔ میں چونکہ ان کو شعر و شاعری کی دنیا سے بہت بلند مقام پر دیکھنے کا عادی تھا۔ مجھے محض ان کو شعر کی صورت میں ایسے مقاصد کا اظہار فرماتے دیکھ کر کسی قدر افسوس ہوتا تھا۔

حفیظ کو علامہ سے ملاقات کرنے کے بعد اپنی راہ لیتے ہوئے ہمیشہ شاعر مشرق علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آ جاتا تھا اور ان کی آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے میرا

اقبال کے اس شعر پر کس نے غور کیا ہوگا اور کون رویا ہوگا؟ لیکن محض ذہنی لذت اور شعر کے کہنے پر واہ واہ کرنے والوں کو اس پر کیوں رونا آئے گا۔

اقبال نے شاعری کے ذریعے انسانوں کو بیدار کرنے میں ساری زندگی گزار دی لیکن ہم لوگ یعنی انسان جو اس دنیا کے اصل ستارے ہیں الٹے راستے پر چلنے سے باز نہیں آتے ہیں۔ تو اقبال اپنی ہمت و کوشش کے باوجود اللہ کو پکار اٹھتے ہیں اور اپنی شاعری کے ذریعے اللہ سے انسانوں کی ہدایت کی دعا کرتے ہیں۔

علامہ مشرقی نے تاریخی دور کے ایسے مرحلے پر ہمارے لیے قدم اٹھایا کہ نظم و ضبط والے سرفروشوں کو ایک وحدت میں لا کر دوسروں کے لیے قائم کرنا مشکل سمجھا جا رہا تھا۔ حفیظ نے ان مجاہدوں کو لاہور کے گلی کوچوں میں اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے اور ۱۹۴۰ء میں سر کٹاتے، گولیاں کھاتے مگر ثابت قدمی کے ساتھ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

حفیظ کی نظر میں علامہ مشرقی بہت ہی عظیم الشان وجود ہے اس لیے حفیظ کہتے ہیں:

وہ قائل تھا فقط اسلام ہی کی بادشاہی کا
دیا اس نے بھی ہم کو درسِ احکام الٰہی کا
نظر ڈالی نہ تھی اس نے کبھی اسبابِ زینت پر
خدا رحمت کرے اس پاک باطن نیک طینت پر

(ii) دُوری بھی حضوری بھی

حفیظ کا یہ مضمون ''دوری بھی حضوری بھی'' سوانحی مضمون ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی اور اقبال کی ملاقاتوں کا احوال بیان کیا ہے۔ یہ ایک خوبصورت، معلومات افزا، ذاتی ملاقات پر مبنی مضمون ہے۔ انہوں نے اس مضمون میں سلیس، سادہ اور رواں اسلوب استعمال کیا ہے۔ پر لکھتے ہیں:

> ''میں ذرہ ہوں یا ستارہ۔ اتنا جانتا ہوں کہ روشنی کی جو چند کرنیں مجھ تک میرے ظرف کو ملحوظ رکھتے ہوئے آتی ہیں وہ بنات النعش سے نہیں بلکہ براہِ راست اسی بِرِ اعظم سے میں نے اخذ کی ہیں جس کا نام اقبال ہے''۔۱۲

حفیظ نہ تو اقبال کے حلقہ احباب میں شامل تھے اور نہ ہی ان کے مریدان خاص الخاص تھے میں شامل تھے۔ حفیظ مولانا گرامی کے شاگرد تھے۔ مولانا گرامی اور اقبال میں گہری دوستی کے علاوہ ایک اور رشتہ بھی تھا۔ اقبال اپنے فارسی کلام کی زبان اور محاورے کے بارے میں گرامی سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ گرامی اور اقبال کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ حفیظ کی نظر سے بھی گزرا۔ اکثر گرامی کے خطوط حفیظ ہی اقبال کے پاس لے کر جایا کرتے تھے اور بعض اوقات جوابات بھی لے جایا کرتے تھے۔

اس مضمون میں حفیظ کی اقبال سے ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ حفیظ کی اقبال کے ساتھ عقیدت بھی دکھائی دیتی ہے۔

حفیظ نے آٹھ نو برس کی عمر میں ایک نظم نیا شوالہ پڑھی اور یاد کی اور اپنے ہم مکتب برہمن زادے کو سنائی۔ حفیظ نے اقبال کو پہلی بار ایک بہت بڑے مشاعرے میں دیکھا جہاں حفیظ کو بھی شعر پڑھنے کے لیے جالندھر سے بلایا گیا تھا۔ سولہ برس کی عمر میں حفیظ کو اردو اور پنجابی کا اچھا شاعر مانا جاتا تھا۔ یہ مشاعرہ پہلی عالمی جنگ کے آخری دور میں پنجاب پبلسٹی کمیٹی کی طرف سے منعقد ہوا تھا۔ شمالی ہندوستان کے سب سے بڑے اور وسیع ہال لاہور میں جمع تھے۔ جس شاعر نے سٹیج پر آ کر اپنے اشعار سنانے کی کوشش کی کالجی نوجوانوں نے اس شاعر کو پس پا ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ بعض لوگ بڑے دعوے کے

ساتھ سٹیج پر آئے اور داد میں بڑی ندامت ملی اور بعض خود ہی بیٹھ گئے اور بعض کو بٹھا دیا گیا۔ چنانچہ پولیس کو بلایا گیا، پولیس ایکشن سے بجتی ہوئی تالیاں اور اجتماعی سیٹیاں تو دم سادھ گئیں مگر ستر ہزار بھینچے ہوئے دانتوں اور نیم واہونٹوں سے ایسی شوں شوں اُوں اُوں کی صدائیں آنے لگیں۔ جیسے آبشار گر رہے ہوں جس شاعر نے سر اٹھانے کی جسارت کی اس پر ہزاروں گھڑے پانی پڑنے لگا۔ سر مائیکل، حکیم احمد شجاع اور نواب سراج الدین سائل جیسے خوش قامت اور خوش الحان کو لایا گیا مگر ان سب کی وجاہت بھی کام نہ آئی لیکن جب ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کے نام کا اعلان کیا گیا تو ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ حفیظ نے اقبال کو پہلی بار یہاں پر دیکھا تھا۔ اقبال نے فارسی زبان میں ایک نظم ترنم کے ساتھ سنائی۔ ستر ہزار سامعین میں سے فارسی نہ جاننے والے بے شمار تھے اور جاننے والے چند سینکڑوں سے زیادہ نہ تھے۔ اقبال جب نظم سنا کر بیٹھ گئے تو تحسین کی تالیوں سے ہال ہی نہیں زمین و آسمان بھی مسحور ہو گئے۔ حفیظ نے تب جانا کہ شاعروں کے اس ہجوم میں اصل شاعر کون ہے؟ اور اقبال کیا ہے اور کیوں سب سے بلند ہے؟

حفیظ نے اقبال کو (امرتسر) مسلم لیگ کے جلسے میں شعر سناتے سنا تھا۔ یہ وہ پر آشوب دور تھا جب غلاموں نے آزادی کی پہلی کروٹ لی تھی کانگریس اور مسلم لیگ نے اتحاد کر لیا تھا اور ان کے ہنگامہ خیز اجلاس ہو رہے تھے۔ حفیظ ان دنوں باغی شاعر بن رہے تھے۔ مسلم لیگ کا اجلاس اس تھیٹر ہال میں تھا جہاں حفیظ امرتسر کے مسلم ہائی سکول سے بھاگ کر تھیٹر دیکھنے آتے تھے۔ آج اسی ہال میں اپنے دوستوں کے ساتھ آئے۔ اقبال نے چند فارسی شعر پڑھے جس کا عنوان فلسفہ اسیری تھا۔ حفیظ کو اقبال کی آواز دل میں اترتی محسوس ہوتی جب جلسہ ختم ہوا۔ اقبال لوگوں کے جھرمٹ سے باہر نکل رہے تھے کہ حفیظ اقبال کے ساتھ لپٹ گئے۔ علامہ حفیظ کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔ حفیظ کی اس حرکت سے تمام لوگ رُک گئے۔ کچھ دیر بعد چودھری شہاب الدین نے ''اولے ہن بس وی کر'' کہہ کر حفیظ اقبال سے الگ کیا۔ حفیظ کا چودھری شہاب الدین سے یہاں پہلی بار سامنا ہوا تھا اور دوسری مرتبہ جب حفیظ کی تصنیف کردہ ''سوز و ساز'' اردو شعر کی وہ کتاب جس کو پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے اپنی تشکیل میں پہلی مرتبہ نثر کی کتابوں کے ہوتے ہوئے اول درجے کا انعام تجویز کیا۔ اس انعام کا آدھا حصہ چودھری نے بٹور لیا کیونکہ انہوں نے مسدس حالی کا پنجابی ترجمہ کیا تھا اور وہ میونسپل کمیٹی کے صدر اعظم بھی تھے۔

حفیظ اس دور میں لاہور کی پنجاب پبلک لائبریری میں جایا کرتے تھے۔ گرامی بھی وہاں آیا کرتے تھے اور حفیظ کے ہاتھ اقبال کو خطوط بھجواتے تھے۔ اقبال حفیظ کو دیکھتے ہی کہتے۔ آؤ حفیظ جی آؤ بیٹھو۔ یہاں چودھری صاحب نہیں ہیں اور پھر چھوٹا سا قہقہہ لگا دیا کرتے تھے۔

حفیظ کی اقبال سے اولین شاعرانہ جسارت ملاقات ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ جالندھر سے ''اعجاز'' نامی ایک رسالہ نکالا گرامی اس رسالے کے سرپرست تھے۔ پہلے نمبر کے لیے حفیظ کو اقبال کے اشعار کی خواہش تھی وہ گرامی کی چھٹی لے کر اقبال کے ہاں آئے۔ اقبال نے گرامی کا پورا خط پڑھا۔ جس میں گرامی نے حفیظ کی تعریفوں کے پل باندھے ہوئے تھے۔

جب اقبال خط پڑھ چکے تو حفیظ سے ان کی تعلیم کے بارے میں پوچھا۔ حفیظ نے کہا ''ساتویں جماعت'' اور اس سے آگے کچھ کہہ نہیں سکے تھے۔ اقبال نے حفیظ کو فارسی شاعری کے پانچ اشعار لکھوا دیتے تھے۔ حفیظ گرامی صاحب کا نام لے کر اقبال سے کبھی کبھی قلمی امداد لے لیا کرتے تھے۔ رسالہ تو پانچ ماہ بعد بند ہو گیا۔ حفیظ ۱۹۲۲ء میں جالندھر چھوڑ کر لاہور آ گئے۔ حاضری کا شوق حفیظ کو شیخ صاحب سر عبدالقادر اور ڈاکٹر اقبال کے حضور لے جایا کرتا تھا۔ اقبال نے ایک دو بار حفیظ سے شعر سنانے کے لیے کہا مگر حفیظ نے نہیں سنایا۔ حفیظ پورے براعظم کا گاماں پہلوان سخن تھا لیکن حفیظ کو اقبال کے سامنے شاعر بننا اور شعر سنانا بے ہودگی ہی لگتی تھی۔

حفیظ ایک بار اپنے دوستوں کے ساتھ اقبال کے ہاں گئے۔ وہاں اقبال نے ان سب سے شعر سنانے کے لیے کہا لیکن کسی نے اقبال کے سامنے ہمت نہ کی سوائے ایک کے۔ اس نے اقبال کے سامنے ایک غزل کہہ ڈالی جس پر حفیظ اور اس کے دوست اس دوست کی حماقت پر پانی پانی ہو رہے تھے۔

حفیظ نے ایک نظم تین نغمے (ٹیگور، اقبال اور حفیظ) لکھی تھی۔ حفیظ نے سب سے پہلے فارمن کرسچین کالج کے ایک بہت بڑے جلسے میں سنائی اور بعد میں یہ نظم ہر جگہ سنی جانے لگی تھی۔ سر راس مسعود جو کہ علامہ اقبال کے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ انہوں نے کانپور کی اردو کانفرنسوں میں اور عظیم مشاعروں اور جلسوں میں یہ نظم سن سن کر اس کی نقل بھی اپنے پاس رکھی ہوئی ہے۔ ایک دن وہ حفیظ کے غریب خانے پر آئے اور حفیظ سے کہا کہ اپنی نظم تین نغمے لو اور میرے ساتھ موٹر پر سوار ہو جاؤ اور پھر حفیظ کو لے کر اقبال کے گھر آئے اور کہا۔ ڈاکٹر صاحب آپ کا سب سے بڑا مجرم پکڑ کر لایا ہوں۔ اقبال نے حفیظ سے وہ نظم سنی اور بعض شعروں کو دوبارہ بھی پڑھوایا اور جب حفیظ نے اقبال کی شاعری کو ایک تلاطم خیز دریا کہا اور ٹیگور کی پر بہار نہر یاندی کو چھوڑ کر اس دریا کے کنارے کنارے ڈگمگاتے ہوئے جلسے کے شعر سنائے تو علامہ اقبال حفیظ کی طرف حیرت اور غور سے دیکھنے لگے۔ سر راس مسعود اور اقبال دونوں کی آنکھیں بھی پر نم ہو گئیں تھیں جب حفیظ نے یہ شعر پڑھا۔

میرا نغمہ نغمہ دریا سے کم آواز تھا
ہاں مگر ہم رنگ وہم آہنگ وہم آواز تھا

تو اقبال کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ہم آہنگ بھی ہم آہنگ بھی بلند آواز، بلند آواز، بہت شیریں اور جب حفیظ نے نظم ختم کی تو سر راس مسعود نے حفیظ کا ماتھا چوما اور اقبال سے کہا۔ میرا بیٹا! اللہ نے حالی کا بدل عنایت کر دیا ہے۔ اقبال نے حفیظ کی نظم نہ صرف سنی بلکہ اس سے متاثر بھی بہت زیادہ ہوئے۔ اقبال نے کہا کہ یہ پہلی نظم ہے جس میں کسی ہندوستانی شاعر نے

میرے کلام کی روح بیان کی ہے۔

ایک دن اقبال نے حفیظ کو جالندھر سے بلوایا اور تب اقبال بہت زیادہ بیمار تھے۔ حفیظ سے کہا کہ ''تم میرا مرثیہ لکھنا'' اور اس کے بعد پہلے حفیظ سے نعت سنی اور پھر شاہنامہ اسلام میں سے ولادتِ رسول ﷺ کے اشعار سنے تو پھر ان کو ذرا سکون ملا اور حفیظ کو کہنے لگے کہ تم میرے لیے دعا کرنا۔

حفیظ نے اقبال سے ملاقات کے چند اور واقعات اپنی زیر ترتیب کتاب ''میرا اقبال میرا گرامی'' میں وضاحت سے بیان کیے ہیں۔

(iii) ''مرحوم'' شاہد

حفیظ کا یہ مضمون ''مرحوم'' شاہد'' سوانحی مضمون ہے اس میں حفیظ نے اپنے پہلی بار دہلی جانے اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے پوتے شاہد احمد دہلوی سے ملاقاتوں کا احوال اور ان سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اس مضمون کا اسلوب ادبی، سادہ اور سلیس ہے۔

> ''لڑکپن میں میری والدہ نے چند ایسی کتابیں پڑھنے اور پھر عمر کے بڑھنے یا ترقی کرتے چلے جانے کے ساتھ ساتھ ان کو سمجھنے اور اگر اللہ توفیق دے تو جہاں تک ہو سکے ان سے اثر لینے اور ان پر عمل کرنے کا شوق عطا فرمایا تھا''۔۱۳

''مرحوم'' لفظ کسی بیمار کے جو اپنی آخری سانسیں لے رہا ہو اس کے منہ پر کہنا بھی اس کے عزیز و اقارب کو تکلیف دیتا ہے۔ حفیظ یہاں پر کہتے ہیں کہ

> ''شاید آج تک کسی شاعر نے ''مرحوم'' تخلص استعمال نہیں کیا یا پھر میری نظر سے گزرا ہی نہیں ۔ جیسے میرا تخلص وہی حفیظ کا حفیظ میرا نام ہی ہے جو ولادت کے وقت میرے بزرگوں نے تجویز کیا تھا''۔۱۴

حفیظ نے بچپن ہی میں نظمیہ پنجابی کتب کے علاوہ مسدس حالی کے بعد مرۃ العروس، توبۃ النصوح اور

بنات النعش بھی اور علامہ راشد الخیری کی کتاب کی غم آلود داستان ہائے حیات مستورات کا بھی مطالعہ کیا۔ حالی کے بعد نذیر احمد کی کتابوں کا زیادہ اثر حفیظ پر پڑا۔ اسی زمانے میں حفیظ پر شعر وشاعری کا بھوت سوار ہو گیا۔ اسی ذوق شاعرانہ کی وجہ سے پہلے سکول سے بھاگ کر گلی کوچوں اور پھر اپنے شہر سے بھاگ کر کپورتھلہ، امرتسر اور لاہور کی سیر وسیاحت کرنے لگے۔ حفیظ نے اپنے پالنے والے رانا کرم بخش (جنہوں نے حفیظ کو اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا) کے خفیہ خزانے سے کچھ اڑایا۔ حفیظ اپنے دو ہم تین رفیقوں کو ساتھ لے کر تھرڈ کلاس کے تین ٹکٹ کروا کے دہلی پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر ایک ہوٹل میں قیام فرمایا۔ حفیظ کے دوستوں سے شعر وشاعری یا ادب سے کوئی واسطہ نہ تھا لیکن حفیظ دلی کی اردو کا وہ لہجہ سیکھنے کا شوق رکھتے تھے جس کے محاورات مراۃ العروس اور توبۃ النصوح کے ہر صفحے کی سطر سطر پر بکھرے ہوتے ہیں۔ آخر حفیظ کوچہ بتاشاں میں جا پہنچے وہ اس حویلی کے پاس جاتے جو شاہد احمد کے دادا نذیر احمد کی تھی۔ وہاں جا کر حفیظ نے اونچی آواز میں ڈپٹی صاحب، نذیر احمد کی صدائیں لگانے شروع کر دیں جس سے تمام محلے والے جمع ہو گئے۔ اتنے میں حویلی کی ڈیوڑھی والا دروازہ کھلا ایک نوکرانی اور اس کے ساتھ ایک آدمی باہر آیا اور ان سے آنے کا مقصد پوچھا جب حفیظ نے نذیر احمد سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے نذیر احمد کے بارے میں بتایا کہ وہ کہاں ہیں مگر شور کی وجہ سے ان کو سمجھ نہ آئی اور وہاں کے لونڈے اور لاڑپے حفیظ کے پیچھے لگ گئے۔ حفیظ وہاں سے جان بچا کر ہوٹل پہنچے مگر وہاں انہوں نے نذیر احمد کی حویلی اور ان کے بیٹے کو ایک نظر دیکھ لیا۔

حفیظ کئی بار دہلی گئے مگر اب ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ نذیر احمد کا انتقال ہو چکا ہے مگر ان کی کتابیں موجود تھیں لیکن حفیظ شاہد احمد کو نہیں جانتے تھے البتہ اس حویلی کے پھاٹک پر ایک چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا تھا جس پر ساقی بک ڈپو لکھا ہوا تھا۔

شاہد احمد سے حفیظ کی ملاقات ان دنوں ہوئی جب حفیظ دوسری جنگ عالمگیر میں سونگ پبلسٹی کا ڈائریکٹر تھا "ساقی" مخزن کے زمانے میں حفیظ کی نظر سے گزر چکا تھا۔ مگر مخزن سے ساقی کا تبادلہ نہ تھا۔ لیکن حفیظ کے ایک دوست ایم سلیم صاحب سے ان کو ساقی مل جاتا تھا۔ حفیظ کی شاہد صاحب سے ملاقات کی صورت ادبی نہ تھی ایک محفل کی دعوت ملی۔ حفیظ نے اپنے دوست کے ساتھ گلی بتاشاں والی میں سے گزرتے ہوئے ڈیوڑھی سے سیڑھیاں چڑھ کر اس محفل میں آئے جس کے میزبان شاہد احمد تھے یہ جلسہ موسیقی کے ایک بہت بڑے استاد کا فن سماعت کرنے کے لیے سجایا گیا تھا۔ حفیظ کو شاہد احمد سے مل کر بہت زیادہ مسرت ہوئی۔ شاہد احمد کو موسیقی کے فن میں استادی کا درجہ حاصل تھا۔ لیکن حفیظ کو ان سے کبھی کوئی راگ راگنی سننے کا شرف حاصل نہ تھا۔ حفیظ کو شاہد احمد کو دیکھتے ہی ڈپٹی صاحب اور ان کے والد کی تصویریں ان کے سامنے آ جاتی تھیں۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ یہ ان کے وارث سے راگ سننے کی گستاخی کرتے۔ وہ حفیظ سے عمر میں چھوٹے تھے مگر بزرگ زادے تھے۔

جب شاہد احمد پاکستان آئے اس وقت حفیظ پہلے محاربہ کشمیر میں اور پھر افواج پاکستان میں تبلیغ شجاعت کی خدمت پر مصروف تھا۔ انہی دنوں ایک دوست نے "ساقی" کا شمارہ حفیظ کو بھیجا جس میں ڈاکٹر تاثیر کے ایک نئے ملاقاتی نے

اس ''مرحوم'' کی کسی ادا پر خفا ہو کر ان کو ''ساقی'' کے صفحات پر بے نقط سنائی تھیں۔ حفیظ کو ایسے بزرگ زادے کے رسالے میں گالی گلوچ پسند نہ آئی تھی۔ اگر چہ یہ شاہد احمد کی طرف سے نہیں تھی لیکن وہ اس مجلّہ کے مدیر تھے اور حفیظ کو شاہد احمد سے بے پناہ عقیدت تھی جس کی وجہ سے حفیظ کو یہ بات بری لگی۔

ایک اور ملاقات جو حفیظ کی شاہد احمد سے ہوئی وہ کراچی کے ایک دفتر میں ہوئی۔ حفیظ نے شاہد صاحب سے اس دفتر آنے کی وجہ پوچھی تو شاہد احمد نے جواب دیا کہ ریڈیو پاکستان میں نوکری کے لیے آیا ہوں حفیظ کو یہ سن کر بہت دکھ ہوا کہ شمس العلماء کا پوتا اور دہلی کا رئیس زادہ ایک بہت بڑے کتب خانے کا مالک اور بہت بڑی جائیداد کا وارث آج نوکری کی تلاش میں دفتروں کے چکر کاٹ رہا ہے۔ حفیظ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہا

بڑی مصیبت شریف کو ہے امیر ہو کر غریب ہونا

پاکستان رائٹرز گلڈ کی منظوری میں حفیظ کا بھی ہاتھ تھا مگر انہوں نے اپنے لیے کسی عہدے کی خواہش ظاہر نہ کی۔ لیکن شاہد احمد نے حفیظ کی خدمات کے صلہ کے طور پر مشہور و معروف مجلّہ ''افکار'' کے حفیظ نامے یا حفیظ نمبر میں ایک تحریر شائع کروائی۔

حفیظ کی نظر سے ''ساقی'' کا ایک شمارہ گزرا۔ جس پر شاہد احمد دہلوی کے بجائے عاصمہ (خاتون کا نام) بطور ایڈیٹر تھا۔ اس خبر کی وجہ سے شاہد احمد کو دل کا دورہ بھی پڑا اور خود حفیظ کو بھی بہت دکھ ہوا۔ شاہد احمد کے اپنے قلم سے تحریر شدہ خط حفیظ کو ملا۔ حفیظ نے اس کو ان خطوط کے ساتھ رکھا ہوا ہے جن کو وہ تعویذ سمجھتے تھے۔ شاہد احمد کا یہ خط حفیظ کے پاس پہلا اور آخری خط تھا۔ چند دنوں بعد حفیظ کو خبر ملی کہ شاہد احمد دہلوی کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر سنتے ہی حفیظ پر سکتہ طاری ہو گیا اور ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا ''آج میرے لیے دہلی مر گئی''۔

(iv) عابدؔ علی عابدؔ

حفیظ کا یہ مضمون ''عابدؔ علی عابدؔ'' سوانحی مضمون ہے۔ اس مضمون کا اسلوب ادبی سلیس اور رواں ہے مثال کے طور پر:

> ''آج عابدؔ پرانا رشتہ توڑ کر مجھے پیچھے چھوڑ کر براہ راست خدا سے لو لگاتے ہوئے چلے گئے ہیں۔ میں سمجھوں کہ میری ''یاری'' ان کی خدا دوستی کے باوجود ختم ہو نہیں سکتی۔ میں ان کے علم و فضل سخنوری اور سخن فہمی ہی کا نہیں ان کی ایسی قدردانیوں کا بھی شکر و سپاس لیے چل رہا ہوں''۔۱۵

حفیظ کو شاعری کی دنیا میں آنے کی بنا پر نہ صرف گھر سے بلکہ جالندھر سے بھی نکال دیا گیا اس وقت حفیظ اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر سسرال میں جا ٹھہرے۔ حفیظ کی ملاقات اپنی بیوی کے بھائی کے ذریعے جون ۱۹۲۲ء میں عابد علی عابد سے

ہوئی۔ان دونوں میں ایک دوسرے کی قدر دانی اور قدر افزائی عابد کی وفات تک موجود رہی۔ عابد علی عابد حفیظ کی بہت زیادہ قدر کرتے تھے جس کا اظہار وہ حفیظ کے سامنے نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے ایم اے اردو کا امتحان دینے والا طالب علموں کے سامنے کرتے تھے۔ جس کے نتیجے کے طور پر وہ طالب علم اکثر اپنے مقالوں کے لیے حفیظ کی سخن وری کے کوائف پوچھنے کے لیے ان کے پاس چلے آتے تھے۔

عابد علی عابد حفیظ کے کسی شعر میں اگر کوئی خوبی دیکھتے تو اسے اپنے حلقے میں بیان کرنے سے دریغ نہ فرماتے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں جب حفیظ ''شباب اردو'' کے جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ عابد علی عابد اپنی اولین تالیف جو کہ ایک ڈرامہ تھا حفیظ کے پاس لائے تا کہ حفیظ اس پر تبصرہ کریں اور اسے اشباب اردو کے صفحات پر چھاپ دیں۔ عابد صاحب نے بتایا کہ یہ ڈرامہ انگریزی سے ماخوذ ہے اور مشرقی انداز میں ڈھالا گیا ہے۔ حفیظ ڈرامے کو ادب لطیف کی اہم ترین صنف مانتے تھے۔ حفیظ نے خیال کیا کہ یہ تو اخذ کردہ ہے میں طبع زاد لکھوں تو شاید بہتر ہو سکتا ہے کیونکہ افرنگی معاشرت ہماری زندگی سے مختلف ہے اپنی ثقافت کو ہم بہتر لکھا جا سکتا ہے۔ عابد صاحب کے ڈرامے پر حفیظ نے سرسری سا تبصرہ کیا۔ اسی دوران حفیظ کے ایک نظم ''فرصت کی تلاش'' کے عنوان سے لکھی۔ جس کی چند سطور نثر کے ساتھ عابد صاحب کو بھجوا دیں۔ عابد صاحب کو وہ نہ صرف پسند آئی بلکہ حفیظ سے پوچھے بغیر روزنامہ ''زمیندار'' میں شائع کروا دیا۔

جب یہ نظم شائع ہوئی تو ہر طرف ''بے تکی نظم'' اور ''بے تکا شاعر'' کا شور مچ گیا۔ سب سے پہلے لکھنو پھر دہلی اور پھر ہر جگہ شور مچ گیا۔ حفیظ نے عابد صاحب سے کہا کہ آپ نے یہ نظم چھپوا کر مجھ پر بھڑوں کا ایک چھتہ حملہ آور کرا دیا ہے۔ جس پر عابد نے کہا کہ آج لوگ جسے بے تکی نظم کہہ رہے ہیں کل اس کی نقل کرنے لگیں گے اس وقت حفیظ نے ہنس کر بات ٹال دی مگر چند ماہ بعد نظم نئے، پرانے شعراء کے لیے بھی ''کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیان کے لیے'' کا بہانہ بن گئی۔

حفیظ ایک روز علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے اودھ پنچ دیکھ کر کہا کہ آج کل آپ کی بے تکی نظم کی پیروڈیاں مزا دے رہی ہیں اس پر حفیظ نے اصل واقعہ بیان کر دیا کہ میرے اس بے تکے پن کی شہرت عابد صاحب کو سبب ہوئی ہے۔ علامہ نے فرمایا کہ ہر وہ طباع جو کوئی نئی چیز پیش کرتا ہے بے تکا کہلاتا ہے۔ آپ اس کی پرواہ نہ کریں اور اپنی اختراعات کو جاری رکھیں۔

حفیظ کی یہ نظم ان کے گیتوں اور دوسری تمام نظمیات کا آغاز تھی۔ اگر عابد علی عابد اسے روزنامہ زمیندار میں نہ چھپواتے تو شاید حفیظ اسے شائع ہی نہ کرواتے۔ عابد علی عابد دیال سنگھ کالج کی پرنسپلی کے زمانے میں اپنے شاگردوں اور استادوں کے سامنے حفیظ کی نظموں، گیتوں اور غزل کو تین تین اور چار چار گھنٹے تک سنوارتے اور پھر بحیثیت صدر مجلس ان اشعار کے بارے میں اپنے شاگردوں اور سٹاف سامنے حفیظ کے فن کی تصریح فرماتے۔ حفیظ ہمیشہ ان کی محفل سے ان کی وسیع النظری اور سچی قدر دانی سخن کا شکر گزار ہو کر نکلے۔

حفیظ کی عابد علی عابد سے ملاقات تقریباً ہر مشاعرے سے پہلے اور بعد میں ہوتی اور ایک دوسرے سے شعروسخن سنتے۔ عابد علی عابد حفیظ کے سب سے بڑے مدح تھے اور وہ حفیظ سے پہلے ہی اس دنیا سے چلے گئے۔ حفیظ اپنا ہی ایک شعر اس موقع پر دہراتے نظر آتے ہیں۔

پیاروں کی موت نے میری دنیا اجاڑ دی
یاروں نے جا کے دور بسائی ہیں بستیاں

حفیظ کے قدر دانوں میں عبدالقادر، سر راس مسعود، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر ذاکر حسین، حبیب الرحمٰن شیروانی اور خواجہ حسن نظامی نہیں ہیں اور ہم عصروں میں تاثیر، عبدالمجید سالک اور امتیاز علی تاج بھی نہیں ہیں۔ حفیظ کو امید تھی کہ سید عابد علی عابد ان کا مرثیہ لکھیں گے مگر وہ ان سے پہلے ہی دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ اب حفیظ اپنا مرثیہ خود ہی ہیں۔

جینا پڑے گا اے جان شیریں
کرنی پڑے گی تلخی گوارا

حفیظ کا کہنا ہے کہ میرے ہم عصروں میں عابد علی عابد شعر و ادب کے دریاؤں میں غواصی اور تیراکی ہی میں ان کی زندگی گزری وہ وسیع القلب تھے وہ اب جسمانی طور پر موجود نہیں ہیں۔ البتہ روحانی اور ذہنی طور پر میرے ساتھ اور میرے ساتھ ہی اس دنیا سے جائیں گے۔

مولانا محمد حسین آزاد کی برسی کے پروگرام میں حفیظ کو دعوت کی شرکت کے لیے کہا گیا۔ حفیظ عابد صاحب کا نام دیکھ کر جانے کے لیے رضا مند ہو گئے کہ شاید ان سے ملاقات ہو جائے مگر افسوس ان کا مقالہ سننے کی بجائے حفیظ کو اس تقریب کی صدارت تفویض ہوتی اور حفیظ کی طرف ہی سے ان کی وفات پر قرارداد ماتم دنیا کے سامنے آئی۔

اسی طرح ایک اور پرانے دوست کی جدائی کا اعلان بھی حفیظ کو ریڈیو اسٹیشن سے بھی کرنا پڑا تھا۔

(۳) تنقیدی مضامین

(ا) غالب

محمد طفیل کی سرپرستی میں نکلنے والا رسالہ ''نقوش'' میں شامل ''غالب نمبر'' کے بعد طفیل صاحب نے اپنے عہد کے تمام شاعروں کے نام ایک خط بھیجا جس کا عنوان تھا۔

''اس عہد کے شاعروں کا غالب کے بارے میں اظہار رائے
حفیظ صاحب کے نزدیک اس پر لکھنا آسان کام نہیں ہے۔(بہ حیثیت شاعر)۔''۱۶

غالب کی تعریف میں حفیظ اس طرح رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

''میں غالب کو فارسی زبان کے ان شاعروں کی محفل میں دیکھتا ہوں جو ایک دوسرے کو اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ان میں سے ہر ایک کا طرز بیان الگ اور منفرد ہے مگر ایک دوسرے کی تحسین میں اس لیے کمی نہیں کرتے کہ یہ سب واقعی اہل کمال ہیں۔آفتاب دوسرے آفتاب کو تاریک نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب ہوتا ہے تاہم کسی کا بھی سارا کلام یکساں بلندی کی سطح پر نہیں، خیال اور اظہار خیال کی پستیاں بھی موجود ہیں۔کسی میں کم کسی میں زیادہ۔''۱۷

حفیظ صاحب کا یہ مضمون'' غالب'' تنقیدی مضمون ہے اس میں حفیظ نے غالب کی شاعرانہ عظمت کا اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''میرے نزدیک یہ ہے اصل غالبؔ، فارسی کا شاعر......! زبان کوئی بھی ہو، دوسروں سے الگ نیا اندازِ سخن پیدا کرنا اس زبان کے مزاج کو بھی ملحوظ رکھتا یہ ہے سخنوری......!''۱۸

حفیظ اپنے تصور میں ایک مشاعرہ دیکھتے ہیں جس میں اردو زبان کے ذریعے اظہار خیال کرنے والے مشہور شعراء اور ان کے ساتھ غالب کو دیکھتے ہیں۔ ہر شاعر باری باری اپنا کلام سناتا ہے اور آخر میں غالب کی باری آتی ہے۔ کچھ لوگ سن کر چپ ہیں کچھ واہ سبحان اللہ کہہ دیتے ہیں اور ایک طرف سے آواز آئی ہے۔
اجی! اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب اردو زبان کی رگ رگ سے واقف ہیں غزل کے علاوہ ہر صنف، ہر موضوع نظم ہو یا نثر، غالب کی سخنوری پاکیزہ، شگفتہ اور کوثر سے دُھلی ہوئی اردو میں ہے مگر اردو غزل کہتے وقت غالب اپنی فارسی دانی اور تلازمات کا استعمال کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ اردو زبان کا مزاج فارسی سے الگ ہے۔

غالب اردو غزل کہتے وقت کیوں فارسی تراکیب اور اصطلاحات کا استعمال کرتے ہیں۔اس لیے کہ غالب کے خیال میں سادہ اردو الفاظ کا استعمال گھٹیا اور پھسپھسا ہے اور وہ اپنے ہمعصروں سے آگے نکلنا چاہتے ہیں۔حفیظ غالب کو میرؔ، مومنؔ اور حالیؔ سے کم تر نہیں سمجھتے اور نہ ہی ان سے بہتر و برتر سمجھتے ہیں۔

حفیظ کہتے ہیں کہ ہر شاعر کا اپنا رنگ و اسلوب و طرز اظہار ہے اسی طرح غالب نے ہم سب کو وہ کچھ دیا ہے جو بعد

کی آنے والی نسلوں کو کوئی نہیں دے سکتا۔ دیوان غالب کے متعدد نسخے دیکھے ہیں مغلق اشعار فارسی کی اصطلاحات کی گٹھڑیاں ہیں جو اردو کی نزاکت پر بار اور سوار نظر آتی ہیں۔ اگر غالب کی یہ صفت گری زیوراتی ہے تو ان زیوروں کو اس طرح غزل کے ہر شعر پر لاد دیا گیا ہے کہ تغزل کی بجائے دیوان غالب زیور فروش کی دکان نظر آتی ہے۔

حفیظ کا کہنا ہے کہ غالب کی زندگی ہی میں ان کی اردو غزل کے اشعار کو بے معنی، مغلق اور مہمل کہا جانے لگا تھا۔ اس وقت سے اب تک پے در پے سخن گری اور سخن فہمی نے اپنی اپنی آرا ظاہر کیں یہ سلسلہ چلتا ہوا ہم تک پہنچا اور اب ہم سیلاب کی طرح اس کو اپنے بعد آنے والوں تک پہنچانے کے درپے ہیں اور ہم یہ نہیں مانتے ہیں کہ اردو زبان میں غزل کہنے کے لیے فارسی تلازمات شعرگوئی کا جو ذخیرہ غالب نے جمع کر رکھا تھا اس کو ڈھنگ سے برتا نہیں گیا اپنے زور بداعت میں اس ذخیرے میں سے اٹھا اٹھا کر اردو کے چند الفاظ پر مار امار کر دی گئی ہے۔ غالب کی عظمت جن اشعار کی وجہ سے ہے ان میں غالب کا کمال ہنر بحسن وخوبی موجود تو ہے لیکن ہنر کی نمائش نہیں یہ اشعار دماغ میں الجھے بغیر کانوں اور آنکھوں کے ذریعے ہمارے دلوں میں اتر گئے ہیں اور اب ہماری جان اور زبان ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ غالب کی اردو اشعار غزل کی شرحیں کیوں کی جارہی ہیں؟ کیوں غالب کی فارسی غزل کا کوئی شعر اپنے عمق اور بلندی کے باوجود قابل اعتراض نہیں ٹھہرا؟ کیوں اس کی اردو غزل کے بہت سے اشعار کے معنی جاننے کے لیے کنپٹی کھر چنی پڑتی ہے؟ اس کیوں کا جواب فارسی کے بارے میں یہ ہے کہ غالب کا مزاج فارسی زبان کے مزاج کی تخلیق، غالب فارسی ماں کا ایسا فرزند ہے جیسے ہندی میں سپوت کہنا مناسب ہے لہذا اس کے فارسی کلام کی شرح ہر شعر خود کر دیتا ہے۔ شارحین نے جو بولیاں بولی ہیں ان کی رو سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا غالب اپنی غزل کے ہر شعر کو مداری کی پٹاری بنا گیا ہے کہ اس میں سے تماشائیوں کے لیے جو چاہو نکال کر ''واہ رے مداری'' کا شور بٹور لیا جائے۔ یا اس نے جان بوجھ کر بے شمار ایسے شعر کہہ ڈالے تھے کہ لوگ تا قیامت بھول بھلیاں میں رہیں۔ ڈاکٹر بجنوری نے نسخہ حمیدیہ کا اعلان کرتے ہوئے صدا لگائی تھی کہ ہندوستان میں دو ہی آسمانی کتابیں ہیں۔ ایک ''وید مقدس'' اور (یہ نسخہ حمیدیہ) ''دیوان غالب'' واہ واہ وید مقدس اس خدا کی نازل کردہ ایسی کتاب ہے جس کی بولی تیس کروڑ ہندو دیوتا بھی نہ سمجھے اور ویدوں کے مقابل شاستروں میں پرمیشور ہی کے منکر ہو گئے۔ اگر دیوان غالب بھی ایسی ہی الہامی بولی میں نازل ہوا ہے تو کیا ہم اردو دیوان میں درج شدہ تمام اشعار کو واقعی ناقابل فہم دیوتائی یا خدائی کلام مان کر خاموش ہو جائیں کہ بھائی آؤ ڈنڈوت کرو۔ ورنہ ناستک قرار دیئے جاؤ گے اور چنڈال کہلاؤ گے۔

حفیظ کا کہنا ہے کہ بیاضِ غالب کا جو بخط غالب ہے۔ وہ طفیل کا ان پر احسان ہے۔ احسان یہ ہے کہ انہوں نے گیارہ برس سے بائیس سال تک کی غزلوں کے بیاض کو محاسبے اور جائزے کے لیے زیر مطالعہ کیا۔ فارسی کی تلمیحات اور لوازمات شعری کو جانتے ہوئے ان کی ابتدائی مشق کا ایک شعر بھی ان کی نمائش کا مظہر نہیں بلکہ ان کی وہ غزلیں جن کو انہوں

نے خود بھی شائع نہیں کروایا تھا کوئی شعر غالب کے اس بیاض کی غزلوں سے کسی صورت میں بھی فروتر نہیں۔

(ii) ملی کردار پر ہماری شاعری کا اثر

حفیظ جالندھری کا یہ مضمون ''ملی کردار پر ہماری شاعری کا اثر'' تنقیدی مضمون ہے۔ اس مضمون میں ان کا اسلوب کہیں کہیں سپاٹ نظر آتا ہے یہاں پر شاعروں کو تنقید سے زیادہ نصیحت نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر

> ''اگر ہم شاعر لوگ سیدھی راہ پر آجائیں تو شاید بگڑی ہوئی سنور جائے اس سے آگے کچھ اور کہنا اپنے شاعر بھائیوں کی طرف سے ملامت کا ہدف بننے کا سامان ہوگا''۔ ۱۹

حفیظ نے اس مضمون میں سپاٹ اسلوب کے علاوہ سلیس اور رواں اسلوب سے کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر

> ''لیکن مذاق سخن خوش مذاقی بھی ہو سکتی ہے اور بد مذاقی بھی۔ دونوں اپنا اپنا اثر رکھتی ہیں۔ بد مذاقی بڑھائی جائے تو قوم بد مذاق، یعنی بد اخلاق ہو جائے گی۔ خوش مذاق خوش کرداری کا نام ہے اس سے کام لیا جائے تو قوم اپنے کردار کی خوبیوں سے شہرآفاق بن جائے گی۔'' ۲۰

حفیظ اردو زبان کا پنجابی شاعر ہے انہوں نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی کام کیا ہے۔ ہمدرد کے فرد واحد حکیم سعید کی طرف سے دعوت نامہ ملا۔ اس دعوت نامے میں ایک شام حفیظ کا ''ہمارے قومی اور اخلاقی کردار پر ہماری شاعری کا اثر'' مقالہ پر بولنے کی دعوت دی گئی۔

''ہمارے قومی اور اخلاقی کردار پر ہماری شاعری کا اثر'' یہ تو نفسیات کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ اتنا اہم کہ اس پر تبصرہ اس ڈھلتی ہوئی شام کے مقام پر عیش دماغی کی تفریحی مجلسوں میں کیسے ممکن ہے؟ اس موضوع پر تو سنجیدگی کے ساتھ بات چیت ہونی چاہیے۔

حفیظ کہتے ہیں:

''میری شاعرانہ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھ سے ایک عقل کی بات نثر کے لہجہ میں ہی سن لیجئے بات کوئی اتنی تلخ نہیں کہ آپ کو ناگوار گزرے یہ عقل کی بات محض اتنی سی ہے کہ میں تو محض شاعر ہوں اور اردو کا اہل زبان بھی نہیں۔قومی کردار پر ہماری شاعری کے اثر کے پیچیدہ معاشرتی یا انقلابی مسئلے کو مجھ ایسے شاعر سے طلب ہی نہ کریں تو بہتر ہے ہماری شاعری تو ابھی تک زلفِ یار میں الجھی ہوئی ہے وہ قومی کردار کے مسائل کو اور بھی الجھائے گی''۔۲۱

حفیظ کو مدعو کرنے والے محترم ستم ظریفوں نے آج کی شام حفیظ کے مقالے کو گراں قدر بتایا ہے۔حفیظ کو نظم چھوڑ کر نثر میں کچھ کہنا پڑ گیا ہے۔مقالہ ازقسم مقالہ لکھنا کچھ پروفیسروں، عالموں اور فاضلوں ہی کا کام ہے۔جس کو پڑھ کر وہ سناتے ہیں تو اسی طرز کے پروفیسر، عالم اور فاضل سنتے سمجھتے بھی ہوں اور چہ مگوئی بھی فرماتے ہوں گے۔شاعری پر مقالہ وہ عالم لوگ ارشاد فرمارہے ہیں جو نہ تو خود شاعر ہیں اور نہ شعر کو موزوں طریق سے پڑھ سکتے ہیں۔مقالہ خوانی کی محفلوں میں اپنی قومی افتادِ طبع جو حفیظ نے دیکھی ہے حفیظ اس پر افسوس کرتے نظر آتے ہیں۔مقالہ سننے والے چند افراد ہی اصل معنوں میں کچھ جاننے کے شوقین ہوتے ہیں۔باقی بلائے ہوئے بھولے بھالے رونقِ محفل کے طور پر سامعین دکھائی دیتے ہیں۔مشاعروں کی نسبت بہت قلیل تعداد میں مجمع ہوتا ہے۔تھوڑی دیر بعد ان میں سے بہت سے لوگ اونگھتے پائے جاتے ہیں اکثر جماہیاں لیتے ہیں بعض کھانسی کھانس کر فضا کو دق آلود کرتے ہیں اور مقال نڈھال ہو کر رہ جاتا ہے۔مقالہ خوانی کے دوران کسی صاحب نے اعلان کردیا کہ ''حضرت گھبرائیے نہیں۔ذرا وہ حرکت جس کا نام انتظار ہے فرمائیے'' دیکھیے فلاں صاحب تشریف رکھتے ہیں کوئی اور نہیں تو حسنِ اتفاق سے شاعرِ اسلام ابوالاثر حفیظ جالندھری بھی موجود ہیں مقالے کے ختم ہونے پر اپنے کلام سے نوازیں گے۔صدرِ مجلس مقالے والے کے کان میں کچھ پھونک دیتے ہیں مقالے کو مقطع پر لایا جاتا ہے۔یہ مقالہ خوانی لوگوں کو جمع کرنے کا بہانہ گمان ہوتا ہے۔مقالے کی مجلس میں شعر و شاعری شروع ہوتے ہی اونگھنے والے بھی جاگ اٹھتے ہیں جماہیاں بھی ہوا ہو جاتی ہیں۔نعرۂ عاشقانہ لگانے لگتے ہیں بلکہ وہ مقالہ فہم جو چپکے سے مجلس سے باہر نکل گئے تھے اور دوسروں کو بھی باہر آنے کے لیے اشاروں اشاروں سے ورغلا رہے تھے وہ سب بھیڑ بھر کا بن کر پلٹ آتے ہیں اور شاعر پر واہ واہ یا آہ آہ کے اولے برسنے لگتے ہیں۔

حفیظ کہتے ہیں:

''ہماری قومی اور اخلاقی زندگی پر ہماری شاعری کا بہت ہی برا اور بہت ہی بڑا اثر پڑا ہے اور یہی اثر ہمارا کردار بنا ہوا ہے۔ہم شاعر لوگ ہماری بات صاحبانِ علم وفضل ذرا کم ہی مانا کرتے ہیں میں تو اپنے محدود علم اور غیر محدود یقین کی بنا پر کہتا ہوں کہ ہماری قوم کے ذہن اور کردار پر ہماری شاعری نے ایک مدت سے جو سکہ جما رکھا ہے اس نے کثیر تعداد میں افراد کروڑوں عوام الناس اور لاکھوں خواص الناس کے لیے سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر سے کام لینے اور کسی قابل عمل فیصلے پر پہنچنے کی ذہنی راہیں قطعاً بند کر رکھی ہیں وہ راہیں جن پر چل کر حوصلہ مند قومیں ترقیوں کے میدان میں آگے بڑھتی ہیں۔بلندیوں پر چڑھتی ہیں اور سرفراز نظر آتی ہیں۔ہمارے قومی اور اخلاقی کردار حرکات مذبوحی کے سوا کچھ نہیں ہیں قوم پر مشاعروں نے جذباتی نفسانی بھوت سوار کر رکھا ہے اور یہی ہمارا کردار بن گیا ہے۔''۲۲

شاعروں کا طبقہ اپنی ڈفلی اپنا راگ الاپتا چلا جارہا ہے اپنے اپنے ماحول کے اندر انہی جذبات کو ترقی دیتا نظر آتا ہے جس سے شاعر کو ''واہ واہ'' ملے اور یہ واہ واہ تفریح طبع کے عوض ملتی ہے۔ بھانڈ مہنگے ہیں شاعر سستے ہیں شاعر خود معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے شاعر اپنے ماحول کے بہت سے جذبات اخذ فرما کر اپنی ذات کے جذبات سے ہم آہنگ کر لیتا ہے ان کو لباس الفاظ پہناتا ہے۔ان رنگا رنگ کے جذبات کے ذخیرے کو استعمال میں لاتے ہوئے کہیں نفسیات کا شرتو تخلیق نہیں کر رہا وہ ان جذبات کو اپنی اُپج کے لباس میں ایک مجسم آواز بنا دیتا ہے۔یہ آوازیں لاکھوں ہزاروں میں کیونکہ ہماری قوم میں لاکھوں ہزاروں شاعر ہیں ۔ یہ مجسم آوازیں کانوں یا آنکھوں کے ذریعے سے قوم کے اکثر افراد کے جذبات میں کہیں قدرے زیادہ اور کہیں قدرے کم ہیجان پیدا کرتی ہیں۔قوم کے افراد میں جذبات تو یوں بھی جمع ہوتے رہتے ہیں لیکن سب جذبات کی صورت گری کی صلاحیت نہیں رکھتے۔شاعر کے الفاظ کو شاعر کے جذبات کے آئینے میں غیر شاعر لوگ اپنی ہی خواہشوں کی من موہنی صورتیں دیکھتے ہیں۔

ہمارے قومی اور اخلاقی کردار پر ہماری شاعری کے اثر کا معاملہ بہت سنجیدگی کا ہے۔مقالہ سننے والے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کے منہ سے بھی یہ سننے کو ملتا ہے کہ یار ہم تو بور ہوگئے۔ یہ ''بور'' ہو جانا شاید کوئی اچھی بات نہیں حفیظ یہ نہیں چاہتا کہ محض میری گذارش کی شنوائی پر مجبور رہ کر مجھ سے رخصت ہوتے وقت اپنے لیے بور ہونے کا احساس یا اعلان فرماتے ہوئے جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس تقریب کے صدر کی زبان سے میرے بارے میں فردوسی اسلام سنتے ہی بور ہوگئے ہوں۔شاعر لوگوں کو بھی سمجھنا چاہیے کہ اپنی قوم کے نفسانی جذبات کے ساتھ کھیلنے کی بجائے کچھ بہتر طریقہ تخلیق شعر اختیار فرمائیں تو ان کی شاعری واقعی بہتوں کا بھلا کرے گی۔ساتھ ہی قوم کو بھی محض جذباتی طور پر رنگ رنگ کے

جذبات سے متاثر ہونے کی خوش مذاقی سے منع فرمائیں۔ حفیظ ''ملی کردار پر ہماری شاعری کا اثر'' کے مقالے پر تنقید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہتے ہیں:

''یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے دوستو! عزیزو! بزرگو! خردو! غالباً آپ نے اس امید میں سن لیا ہے کہ یہ شاید زیر موضوع مقالہ کی شگفتگی کے گرم مصالحے کی تمہید ہے مگر میں کہتا ہوں کہ جو کچھ مجھے آج کے موضوع پر کہنا تھا کہہ چکا۔ آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ اگر مقالوں کی صورت حال یہی ہے تو خود ہی فرمائیے کہ آپ ابھی اور کیا چاہتے ہیں؟ جو بھی میں کہہ چکا ہوں اگر اس میں نصف کے قریب بھی مبالغہ شاعرانہ سے خالی ہے تو ہماری قومی اور اخلاقی زندگی پر ہماری شاعری کا بہت ہی برا اور بہت ہی بڑا اثر پڑا ہے اور یہی اثر ہمارا کردار بنا ہوا ہے''۔۲۳

(iii) احمد ندیم قاسمی

حفیظ جالندھری کا یہ مضمون ''احمد ندیم قاسمی'' تنقیدی مضمون ہے۔ اس مضمون میں حفیظ نے سادہ سلیس اور رواں اسلوب اختیار کیا ہے۔

''جو مخلوق کی بھلائی کے لیے بگڑے ہوئے کردار کو درست کرنے کے لیے گمراہی کی رفتار کو وہ راستہ دکھانے کے لیے جو قرآن نے بتایا ہے ہر شاعر اور ہر ادیب کا فرض ہونا چاہیے''۔۲۴

حفیظ کا کہنا ہے کہ احمد ندیم قاسمی پر ایک معمولی مضمون لکھ کر یہ سمجھ لینا کہ سخن فہمی اور انسان شناسی کا فریضہ ادا ہو گیا ہے تو یہ درست نہیں۔ حفیظ نے اس موضوع پر اتنے صفحے لکھنے کے بعد یہ اندازہ لگاتا ہے کہ یہ اس شخصیت کے بارے میں اظہار رائے کی تمہید ہے۔ اس لیے حفیظ احمد ندیم قاسمی کے لیے مختصراً بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ ان سے حفیظ کے اتنے دوستانہ تعلقات نہیں تھے۔ جتنے حفیظ کو اپنے قریبی دوستوں سے ہیں حفیظ اہل قلم کے اس طبقے کو ذاتی طور پر جانتے ہیں جو احمد ندیم قاسمی کو اپنے حلقے میں شمار کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کا شعور اور حسن کارانہ تخلیقات نظم و نثر میرے مطالعے میں ہیں اس حلقے میں ایک بھی ایسا نہیں جو ان کے مماثل کہلوایا جا سکے۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری شاعروں سے محض واہ واہ اور ان کی انشا پردازی ادیبوں اور نقادوں سے داد طلب نہیں ہے۔

حفیظ کے نزدیک احمد ندیم قاسمی شعروادب کے اس دور میں وہ کام کررہے ہیں جو مخلوق کی بھلائی، بگڑے ہوئے کو سیدھا راستہ جو اسلام اور قرآن بتاتا ہے۔ جو ہر شاعر اور ادیب کا فرض ہے۔ احمد ندیم قاسمی اپنے ملک اور ملت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور وہ اس کی بقا چاہتے ہیں اور وہ اپنے گھر کی خرابیوں کو دور کرنے کے درپے ہیں اور وہ دوسروں کے حوالے نہیں کرنا چاہتے کیونکہ انہیں اپنے گھر کی چند خرابیاں ناپسند ہیں وہ اپنی جان، ایمان، فن اور اپنے شعور کے ذریعے ہم سب کی خیر و بقا کے خواہشمند ہیں۔

(iv) میزانِ اقبالؒ کے خلاف

حفیظ جالندھری کا یہ مضمون ''میزان اقبالؒ کے خلاف'' تنقیدی مضمون ہے۔ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے حفیظ لکھتے ہیں۔

> ''اقبال کا سب کچھ ہے اسلام، قرآن جس کو وہ ہم سب مسلمان کہلانے والوں کی منتشر اور تفرقہ کے دشت میں سرگرداں زندگیوں کو اس مقام پر لانا چاہتا ہے جو توحید انسانیت کا مقصود ہے اقبال ساری نوع انسانی کو وہ پیغام دے رہا ہے جو انسان کاملﷺ کے ذریعے خالق کائنات نے تسخیر کائنات کے لیے وحی فرمایا ہے''۔۲۵

حفیظ کو اقبال کے ساتھ بہت زیادہ عقیدت تھی جس کی وجہ سے حفیظ نے اپنی زندگی کا آغاز ہی کلام اقبال کے مطالعے اور پھر ساری عمر ان کے حضور استفادہ کی غرض سے حاضر رہنے میں گزاری اور ان کے انتقال کے بعد بھی بے شمار مضامین اور کتابیں ان کے مطالعہ میں رہیں۔

حفیظ نے ایک اہم فریضہ ادا کرنے کے لیے انتہائی علالت کی حالت میں قلم اٹھایا ہے کیونکہ میزان اقبال میں دو مقالے جوش اور حفیظ سے بواسطہ اقبالؒ تعلق رکھتے ہیں۔ ''علامہ اقبال جوش ملیح آبادی کی نظر میں'' اس میں جوش کی اقبال دشمنی کا مصنف نے جائزہ لیا ہے اور دوسرا ابوالاثر بحضور اقبال میں اقبال سے حفیظ کی نیازمندی کے متعدد واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ منور صاحب کو یہ مقالہ لکھنے کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب جوش ملیح آبادی نے ''جنگ'' کراچی میں اپنی کالم نویسی کے دوران عیارانہ، مفتریانہ اور فتنہ انگیز انداز تحریر کے تحت اردو کے شاعروں کو بے اصول، بے وضع، سفلے تنگ ظرف اور غدار قوم کہا جس میں اقبال کو ''سر'' اور حفیظ جالندھری کو ''خان بہادر'' کے خطابات شاعرانہ کمینگی، کانگریسی

مقاصد قومی سے انتہائی غداری کے صلے میں وصول کرنے والے شاعر بتایا اور پاکستانیوں کو ہوشیار رہنے کی تلقین اس طرح کی کہ اگر خدانخواستہ پاکستان پر کسی دشمن نے حملہ کر دیا تو یہی شاعر سب سے پہلے دشمن کے کیمپ میں داخل ہو جائیں گے۔ جوش کے اس حملے کا جواب منور صاحب نے دینا لازم گردانا اور جوش کو سمجھانا چاہا۔ منور صاحب نے جوش کے اس مقالے پر مقدمہ لکھنے والے سید عبداللہ نے اس مقالے کو بے محل ٹھہرایا اور فرماتے ہیں کہ اس مجموعے میں ایک مضمون ایسا ہے جس میں مضمون نگار نے خود ہی اپنے مقصد کو نقصان پہنچایا گیا ہے۔ یہ مضمون اقبال جوش کی نظر میں میں جوش کو بلا ارادہ اہمیت ملی ہے اور جوش اقبال صاحب کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اس سے اقبال کا کچھ نہیں بگڑتا اور جوش کا اپنا ایک خاص انداز اور اپنا نقطہ نظر ہے وہ انہیں مبارک ہو۔

سید عبداللہ مانے ہوئے تنقید نگار اور انشا پرداز ہیں۔ وہ اس کتاب پر مقدمہ لکھتے وقت اپنے استادانہ مقام کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے شاگرد کی مقالہ نگاری پر جو کچھ چاہیں فرمائیں۔

سید صاحب نے فرمایا کہ جوش کے کہنے سے اقبال کا کچھ نہیں بگڑتا۔ مگر حفیظ کا کہنا ہے کہ جوش سے بھی زیادہ بے ہودہ اور بے مایہ شخص اگر کوئی ہو اور اس مقصود پر حملہ کرے جس مقصود کے لیے حضرت علامہ اقبال نے اپنے خونِ جگر سے گلزار ملت کو سینچا ہے تو اس باغ کو اجڑنے سے بچانے کے لیے ہر غیرت مند مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے فتنہ طراز بد باطن شخص کا منہ توڑ دے۔ اس رنگ کی ہرزہ سرائی سے اقبال کا سب کچھ بگڑتا ہے۔ اقبال کا سب کچھ اسلام اور قرآن ہے۔ اقبال تمام مسلمانوں کو ذلت اور رسوائی کی زندگی سے اٹھا کر سر بلندی کی راہ دریافت کرنے کے لیے تلقین کرتا ہے اگر یہ ہے کلام اقبال کا مقصود یعنی اسلام درِ مصطفےٰ ﷺ سے ہر انسان کو فرمودۂ قرآن کے مطابق اقطار السمٰوات سے بھی بلند ہونے اور ربانی بن جانے کا پیغام تو اگر اس پیغام کے خلاف ایک ایسی تباہ کار تحریک اٹھے جو درِ مصطفےٰ ﷺ کی طرف رخ کرنے والوں کو اس راہ سے ہٹا کر بولہبی کی ذلتوں کی لذتیں لیتے ہوئے مٹ جانے کی تعلیم دی ہے۔ کیا ان کے بارے میں لوگوں کو نہ بتایا جائے کہ یہ دلال تمہارے دشمن ہیں؟ کیا ان سے تعرض اس لیے نہ کیا جائے کہ ایسے گھٹیا لوگوں کا نام لینے اور ذکر کرنے سے ان کو ''اہمیت'' مل جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں بار بار شیطان الرجیم کی شیطنیت سے بچنے کی آیات کیوں ہیں؟ کیا شیطان کو خاص اہمیت دی جائے خدا کا مقصد ہے؟ اگر دغا باز کی کوئی اہمیت نہ ہو تو خود خداوند کریم ہی انسانوں کو شیطان کے مکر سے بچنے پر بار بار اصرار کیوں فرماتے ہیں؟ انسان احسن تقویم ہے اور خالق کائنات اس کو احسن المخلوقات ثابت ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔

حفیظ کا کہنا ہے کہ الٰہ آباد مسلم لیگ کے صدارتی خطاب میں احیائے شعائر اسلام کے لیے قومی وطن کی تجویز علانیہ پیش کر دی۔ اقبال نے ساری عمر ہماری روحوں میں نافذ کرنے کے لیے سینہ کاوی کے نقوش اپنے کلام میں رکھ دیئے تھے یہ اسی کا کلام تھا۔ جس نے تسخیر پاکستان کے لیے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو یکجا کر دیا تھا۔ خدا کو ایک اور نوع انسانی کو

صورۃ اور معناً ملت واحدہ بنانے والے نقیب اقبال کو یہ لوگ کیسے پسند کریں اور اقبال پر الزام کیوں نہ دھریں؟ کہ اس کی ذات اور مقصود ہی سے لوگ بدظن ہو جائیں۔ جوش کے کہنے سے علامہ اقبال کا کچھ نہیں بگڑتا ایک سطحی اظہار خیال ہے یا حقیقت سے گریز۔ اقبال کا مقصود پورا نہ ہو اس کو روک دیا جائے اس مقصود کے خلاف کامیابی حاصل کر لی جائے تو علامہ کا سب کچھ بگڑتا ہے۔ پاکستانی نونہالوں تک کلام اقبال مسلسل پہنچنا چاہیے موجودہ اثرات بدکاری کا قلع قمع کرنے کے لیے منور صاحب نے اپنے مقالے میں جس طریق سے جوش کی ہفوات کا جواب دیا ہے وہ تو شریف انسانوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کافی ہو گا۔

میزان اقبال کے مقدمہ میں سید صاحب نے یہ تو لکھا ہے

''جوش کا ایک خاص انداز اور ایک خاص نقطہ نظر ہے جو انہیں مبارک ہو۔''۲۶

کاش یہ بھی بتا دیا ہوتا کہ جوش کے لیے ''مبارک نقطہ نظر'' قوم ملک و ملت کے لیے مبارک ہے یا نہیں۔

حفیظ نے جوش کے تین نظریات پیش کیے ہیں وہ یہ ہیں:

> ''جوش کا ایک نقطہ نظر بہت واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں سے ملے جیسے ملے روپیہ ملے، شراب ملے ، لونڈا ملے، دعوت ملے اور بدکاری کے ایسے مواقع حاصل ہوں۔ جن کی باز پرس نہ ہو سکے۔ ہر شب شب عیش کی سہولتیں حاصل ہوں۔ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اپنے ہوس پرستانہ کوڑھ کر اس رنگ سے پیش کیا جائے کہ جیسی کھاج اپنے کوڑھ میں جوش کر رہے ہیں دیکھنے والے اس کھاج کو انقلابی شاعری سمجھیں اور ان کا کوڑھ اپنے جسم پر وارد کر لیں ساتھ ہی اس کوڑھ کے کھجائے چلے جانے کو ''انقلاب شاعرانہ'' قرار دیں۔ تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ پاکستان میں رہ کر پاکستان کو کھا کر۔ پاکستان کی جڑیں کھودنے میں بھارت کی مدد کی جائے۔''۲۷

(۴) اسلامی مضامین

(ا) کیوں اسلامی معاشرہ نہیں

حفیظ صاحب کا یہ مضمون ''کیوں اسلامی معاشرہ نہیں'' مذہبی نوعیت کا مضمون ہے۔ اس میں اسلامی معاشرہ قائم ہوتا دیکھنے میں کیوں مشکل پیش آ رہی ہے اور اس کی کیا وجوہات ہیں پر بحث کی گئی ہے۔

''کیوں اسلامی معاشرہ نہیں'' میں حفیظ نے سادہ سلیس اور رواں اسلوب میں اسلامی معاشرے کے سامنے کھڑی ہوئی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر:۔

"یہ درباری کون تھے آج کے درباریوں سرکاریوں کے دادا پردادا لوگ جب انگریز سرکار بن گئے تو ان کے ہاتھ مسلمانوں کو بیچ دینے والوں کی اولادیں مسلمانوں کے ذہن اور عمل میں سے رہے سہے اسلامی اطوار نکالنے کی آلہ کار بن گئیں"۔۲۸

ہم سب کو اسلامی معاشرہ قائم ہوتا دیکھنے میں جو مشکل پیش آرہی ہے اس کی اصل وجہ ہماری اپنی معاشرتی خرابیاں ہیں۔جن سے ہم خود اپنے آپ کو بری، پاک یا معذور سمجھتے ہوئے دوسروں پر طعنہ زن ہیں۔ یہ خرابیاں جو ہماری عاقبت کو ناصواب بنا چکی اور دنیا کا شدید ترین عذاب بن چکی ہیں ان کو ہم نے بہت پہلے لے پالک بنا کر، اپنا ایمان، اپنی جان کھلا پلا کر پالا پوسا تھا۔گندگی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیروں کو اگر دفن نہ کیا جائے تو ان میں سے بُو سڑاند اٹھ اٹھ کر گونا گوں انبار در انبار گندگیاں پیدا کرتی ہے۔ ہواؤں اور فضاؤں کو بیماریوں سے بھرتی ہے۔ ہماری ذہنی اور معاشرتی زندگی کا بھی یہی حال ہے ہم اپنے خیال و اعمال کی رنگ برنگی گندگیوں کو لپٹائے ہوئے ہیں اور شکایت کر رہے ہیں۔ بدبو ہے سڑاند ہے بیمار ہے لیکن ہم یہ نہیں دیکھتے ہیں کہ یہ تعفن کہاں سے سر اٹھاتا اور وبائیں پھیلاتا ہم میں سے رہی سہی توانائی والوں کو بھی لاشوں کا ڈھیر بناتا چلا جارہا ہے۔ یہ کرۂ ارض انسانوں کا جنگل ہے۔مسلمان بھی اس جنگل کے خطہ وار حدود میں آباد ہیں ہم بہت سے مقامات پر گنجان باغ یا وسیع باغ میں جھاڑیاں، بیلیں، شاندار درخت اور شاخیں۔ پھول پھل ہیں۔ جھاڑیوں، درختوں کو تو قدرتی ہوائی آندھیاں آپس میں ٹکراتی اور ٹھکراتی ہیں مگر ہمیشہ تشریف نہیں لاتیں لیکن ہم مسلمان انسانی زندگی کے باغ بغیچوں، جنگلوں کو اس مصیبت میں مبتلا کرنے والی آندھیاں سماوی اور طبعی نہیں یہ تو انسانوں کی اُڑائی ہوئی ہیں۔ یہ آندھیاں اسلام دشمنی کی تحریکیں ہیں جو مسلمانوں کے دینی ذہن کو برباد کرنے کے لیے سوچ سمجھ کر چلائی گئی ہیں۔

فرنگ (یورپ) سے صلیبوں کی یورش اور اسلامی ممالک پر خصوصاً ایک یلغار اٹھی تھی۔ فلسطین، عراق اور شام پر مسلمانوں کے خلاف قتل و غارت عام ہوگئی۔ خلافت عباسیہ کمزور ہوگئی اور اسلامی سلطنت کی وحدت قائم نہ رہی تھی۔ عیسائیوں نے بیت المقدس ہی نہیں اردگرد کے علاقوں پر بھی قبضہ کرلیا تھا۔ لاکھوں مسلمان قتل اور لاکھوں غلام بنا لیے گئے۔ آخر سلطان نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی جیسے مجاہد اور سرداروں کی قیادت میں پرچم ہلال سے صلیب بردار افرنگ نے شکست کھائی اور بھگا دیئے گئے۔ان کو بھگا کر مسلمانوں نے سکون کا سانس لیا لیکن اس شکست نے بعد افرنگ نے مسلمانوں کو برباد کرنے کا ایک نیا طریقہ اپنایا۔قلوب میں کسی نہ کسی صورت میں کارفرما دینی روح جہاد

کو مسلمانوں کے پیکر سے نکالنے کے لیے نظریاتی پروپیگنڈے کا ایسا حربہ استعمال کرنا شروع کیا جو واقعی کارگر ثابت ہوا ہم فرقے بن گئے۔ ہماری وہ توحیدی روح گم ہوگئی جس روح کا یہ ایمان تھا کہ مجاہد زندہ رہے تو غازی اور جہاد میں کام آ جائے تو شہید کا رتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ جب یہ روح کمزور کر دی گئی تو افرنگ کی صلیبیوں نے چاروں طرف سے ہر مقام پر مسلمانوں کا گلا دبوچ لیا۔ وہ مسلمان جو ہندوستان پر کئی سو برس سایہ فگن رہے وہ مسلمان جن کے کردار نے ہندوستان کو جنت نشان بنا دیا۔ یہ حاکمانہ سایہ نہیں تھا یہ تو اسلامی طریق زندگی تھا یہ علماء وصلحاء کی تبلیغ تھی جو گفتار و اطوار کے زور سے تینتیس کروڑ دیوتاؤں کو سرنگوں کر رہی تھی۔ یہ انسانیت کا سایہ عاطفت تھا۔ یہ شریفانہ انداز و اطوار تھے لیکن بادشاہوں، نوابوں، درباریوں اور ان کے ڈوم دھاڑیوں نے لذت عیش وعشرت کی رنگین صورت زندگیاں بسر کرنا شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ اسلام کی روح سب بادشاہوں کے تن سے اور ان کے درباریوں کے قالبوں سے نکلی۔ اگر کسی بادشاہ میں کسی وقت پلٹ بھی آئی تو درباریوں نے اس بادشاہ کو قتل کر دیا۔ بادشاہ یا درباری جیسے بھی تھے لیکن مسلمانوں کی تعلیم گاہیں مسجدوں ہی سے وابستہ تھیں۔ انگریز نے قرآنی اطوار کی پاکیزہ تعلیم کے مراکز مساجد کو رزق اور عہدہ کے منافی بنا دیا اور ایسے سکول اور کالج قائم کیے جن سے اسلامی روح رخصت ہوگئی۔

سب سے زیادہ مظلوم ہماری مسجدیں اور مسجدوں میں اذان دینے والے نماز پڑھانے اور خطبہ سنانے والے ہیں۔ وہ پتھر جو ہم میں سے ہر ایک کے گلے میں بندھے ہوئے ہیں یہ پتھر خوبصورت زیوروں کی ذہنی صورت میں ہماری گردنوں میں آج سے نہیں انگریز بہادر کے ملک سنبھال لینے کے بعد سے بندھنے شروع ہو گئے تھے اور اب انگریز تو دور اپنے جزیرے کے ساحل پر کھڑا ہنس رہا ہے اور ہم اس کے پیدا کردہ گندگی کے اس گندے جوہڑ میں ڈوب رہے ہیں۔ جس پر دور سے رنگا رنگ روشنیاں چھلکائی جا رہی ہیں۔ ان پتھروں کے بندھن کا آغاز ان صاحب نما چھوٹے اور بڑے صاحبوں کے باپ داداؤں کے ذریعے کیا گیا تھا جن کے ہاتھوں آج ہم تعلیمات کی چٹانیں اپنے بچوں کے گلوں میں بندھوا رہے ہیں۔ یہ آغاز ساری دنیا کے ممالک پر مختلف رنگوں کی نمائش سے کیا گیا تھا۔ مقصود اسلام کا نام لیتے ہوئے اسلام سے عملاً الگ کر دینا تھا۔ نیم براعظم ہند میں حالات صلیبیوں کو مسلمانوں کی بربادی کے لیے زیادہ سازگار نظر آئے بربادی کا آغاز تعلیمات سے کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے تعلیم و تربیت مسجد سے وابستہ پاکیزہ نگاہی کی بنیادوں پر آغاز کی جاتی تھی۔ ہمارے ساتھ رہنے والی اقوام جو مندروں، گوردواروں سے متعلق تھیں وہ بھی زیادہ تر مسجدوں ہی کے درس سے انسانیت حاصل فرماتی اور مسلمانوں کے علوم کی مدد سے ترقی کی راہوں سے گزرتی تھیں۔ یہ تعلیم تھی جو ذہنوں کو پاک باطنی سکھا کر آگے بڑھاتی تھی اس تعلیم کو بدل دینا افرنگی صلیب کاروں کا سب سے بڑا حربہ تھا۔

حفیظ کہتے ہیں:

''افرنگ کا مقصد کروڑوں مسلمانوں کو عیسائی بنانا نہیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اٹھتے بیٹھتے مسلمان کہتے رہیں بلکہ مسلمان ہونے کے نعرے بھی لگاتے ہوئے افرنگ کی بے دام غلامی کو بطیب خاطر سہتے رہیں۔ یہ عمل پاکستان سے بہت پہلے سے جاری تھا اب ہماری روحوں میں اس کی عملداری ہے اور ہماری بھی اس کیننگی سے سنواری جارہی ہے۔ فتنہ، اغوا، قتل وغیرہ کی خبریں، مذہب کے نام پر ہنگامے اور فسادات یہ سب کیا ہیں یہ ایک سکیم کے ماتحت افرنگ کی تعلیم کا ماحصل ہے۔ نئی گھڑنت کے دل کہہ رہے ہیں کہ دین کو قطعاً تج دو۔ دینی تعلیم جس نے انسان کو اخوت اور مساوات سکھائی تھی اب اس کی ضرورت کہیں نہیں ہے۔ اب انفرادیت کا دور ہے۔ انگریزی سکولوں اور کالجوں میں پڑھے ہوئے بھی اور ہم عام اَن پڑھ مسلمان بھی دین مبین کے معاملے میں جاہل ہیں۔ روٹی کھانا ہی ہمارا دھندا ہے ہم سے علانیہ کہا جا رہا ہے اے مسلمان کہلاتے چلے جانے والو دیکھو تمہارا مذہب اپنوں سے بَیر رکھنے والوں کے سوا اور تو کچھ سکھاتا ہی نہیں۔ آؤ اس سے آزاد ہو جاؤ ہم تمہیں کارخانوں میں بھرتی کریں گے تم کاریگر مزدور کہلاؤ گے کماؤ کھاؤ گے جو کچھ تمہاری کمائی ہو گی ہم تم سے لے کر تمہاری ہی مزید کمائی کے لیے باہر بھیجیں گے جو چیزیں وہاں سے منگائیں گے ان کو دکانوں میں سجاؤ اپنے ہاں بھی یہ چیزیں اب روسی امریکی استادوں کی نگرانی میں چلاؤ۔ یہود و ہنود تمہارے وجود کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔''۲۹

ان سب باتوں کا محض ایک ہی علاج نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ مسجد کی طرف چلے آؤ اور مسجد کو مرکز بنا کر تعلیم گاہیں کھولو۔ ہمارے ہاں عام اسکول، پبلک اسکول، کانونٹ اسکول، مشنری اور دوسرے اسکول اور کالج نوجوانوں میں سے چن چن کر افرنگ کی صلاحیت والوں سے بھرے جاتے ہیں باقیوں کو دھتکار کے سوا کچھ نہیں مل رہا۔ یہ بہت عمدہ بات ہے اس دھتکار سے سبق سیکھنا چاہیے کسی بھی مسجد کا ملا ہو۔ بچوں کو ابتدائی تعلیم دے سکتا ہے ابتدائی تعلیم مسجد کے سوا مل ہی نہیں سکتی۔ اسلامی فضا مسجد ہی میں ہے یہی فضا اسلام کی تعلیم کے لیے ایسی بنیاد ہے جس پر آئندہ اسلامی معاشرہ کا ایوان قائم کیا جاسکتا ہے۔

(۵) خطوط

(ا) پانچ اشعار کا انتخاب

خطوط کے عنوان سے یہ ایک مضمون ہے جو نثرانے میں شامل ہے۔ حفیظ کے اس خط ''پانچ اشعار کا انتخاب'' میں انہوں نے شاعرانہ اسلوب اپنایا ہے۔ مثال کے طور پر

> ''یہ لکھتے اور کہتے وقت ایک صاحب ہیں جن کا نام نامی حضرت دل ہے ان صاحب نے ہر مرتبہ یہی کہا کہ بات ہی کیا ہے؟ جب چاہوں گا پانچوں شعر اپنی یادوں کی گٹھلی سے نکال کر آپ کی زبانِ قلم پر رکھ دوں گا اور کیوں پسند ہیں؟ ان میں کون سی خوبی ہے یہ بھی عرض کر دوں گا۔ دل صاحب میرے جنم کے ساتھی ہیں میں ہمیشہ مان جاتا رہا''۔۳۰

یہ خط حفیظ صاحب نے اپنے دوست ممتاز حسن کے نام تحریر کیا تھا۔ اس میں انہوں نے اپنے دوست کو کہا ہے کہ آپ نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں ایسے پانچ اشعار آپ کو لکھ کر بھیجوں جو میرے اپنے تخلیق کردہ نہ ہوں اور میں نے ان اشعار کو اپنے اوپر مسلط کر رکھا ہو۔ حفیظ کہتے ہیں کہ میں نے بہت سوچا کہ کوئی شعر تو ایسا ہوگا جو میں نے بہت سنا اور یاد رکھا ہو۔ لیکن مجھے بارہا سوچنے پر بھی ایسا کوئی شعر نہ ملا۔ بہت سے اشعار ایسے تھے جو مختلف مرحلوں پر ساتھ نباہتے رہے لیکن جونہی حالات نے پلٹا کھایا وہ شعر بھی وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوتے رہے۔ حالانکہ ایک وقت ایسا تھا جب لگتا تھا کہ شعر اور ہم لازم وملزوم ہیں۔

آخر میں حفیظ صاحب کہتے ہیں کہ ایک شعر ہے جو بچپن میں مسجد ادائے نماز کے لیے جاتے ہی دیوار پر نظر آتا تھا اور آج بھی کبھی کبھی کسی پرانی مسجد میں دو سجدے کرنے جاؤں تو یہ دو مصرعے میری نگاہوں کا استقبال کرتے ہیں یہ ایک شعر اب تک میری گردن کا ہار ہے۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

(۶) متفرق مضامین

متفرق مضامین میں حفیظ کی پہلی تحریر ''اردو کی مخالفت'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں وہ مختلف اطراف سے اردو کی مخالفت، حکومت کا رویہ، سکھوں کی پنجابی زبان اور کئی دوسرے تاریخی واقعات کا دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے۔

(۱) اردو کی مخالفت

حفیظ کے اس متفرق مضمون ''اردو کی مخالفت'' کا اسلوب سادہ سلیس اور رواں ہے مثال کے طور پر

> ''یہ کمیشن پنجاب بھی تشریف لایا تھا اور پنجاب؟ دہلی، گڑگاؤں تک پنجاب ہی پنجاب تھا۔ اس کمیشن نے ان دنوں بالکل ایک انوکھی اور نئی بات جو اردو کے خلاف تخلیق کی۔ وہ یہ تھی کہ صوبہ پنجاب میں تعلیم چونکہ صوبے کی مادری زبان میں نہیں ہوتی۔ ایک غیر زبان میں ہوتی ہے جس کا نام اردو بیان کیا جاتا ہے'' ۳۱

اس مضمون میں حفیظ نے اردو زبان کی موافقت میں دلائل پیش کیے ہیں ان کے نزدیک جب ۱۸۲۲ء میں انڈین ایجوکیشن کمیشن مقرر کیا گیا تو اس کمیشن نے تمام صوبوں کا مجموعی طور پر تعلیمی حوالے سے جائزہ لینا اور دیکھنا تھا کہ وہاں تعلیم کی صورتحال کیسی ہے کمیشن جب پنجاب پہنچا تو یہ پتا چلا کہ چونکہ تعلیم پنجابی کے بجائے اردو میں ہے اس لیے اس کی اشاعت کم ہے یہ اردو کے خلاف پہلا احتجاج تھا۔

اردو کے خلاف دوسرا احتجاج یہ تھا کہ سکھوں نے کہا کہ پنجابی ہندی سے ایک الگ زبان ہے۔ اس لیے ہم پنجاب میں اس کو رائج کر دکھائیں گے ورنہ کرپان چلائیں گے اور اردو سے بھی اس کا گٹھ جوڑ نہیں۔ پنجابی گورمکھی حروف میں لکھی جاتی ہے۔

اردو کے خلاف تیسرا احتجاج یہ تھا کہ چند آدمیوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ یہ زبان کا کوئی تنازعہ ہی نہیں۔ رسم الخط یعنی حرف حروف کا جھگڑا ہے لہذا اسے ان انگریزی حروف میں لکھا جانا چاہیے جن کو رومن حروف کہتے ہیں یہ مسٹر گاندھی کی چال تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے پنجاب کے سکولوں، کالجوں کے بورڈنگ ہاؤسوں میں طلباء کے درمیان اس سوال پر

کشمکش عملی صورت اختیار کر گئی اور ان تین گروہوں نے آپس میں لڑنا، جھگڑنا، مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ صوبہ پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر سر چارلس آئیچسن امرتسر پہنچے۔ سکھوں نے ان کو مودبانہ ایڈریس دیا جس میں اردو کو ترک کرنے کے بعد ہندی بھاشا بحروف ناگری کے استعمال کی۔ تجویز کو ایک نئی مصیبت بیان کر کے پنجابی کو گورمکھی جلد از جلد رائج کرنے کا مطالبہ کیا اور اس کے ساتھ گورنر کو یاد دلایا کہ انگریزی سرکار کے سب سے زیادہ وفادار سکھ ہی ہیں لہذا ان کا مطالبہ مانا جائے۔

لیفٹیننٹ گورنر نے اس ایڈریس کے جواب میں جو کچھ کہا وہ اس طرح درج گزٹ ہوا۔

''دانا اور تجربہ کار انگریز عہدہ داروں اور عام تربیت یافتہ ہندو مسلم اور سکھ شرفا کی آرا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ صوبہ پنجاب اور شمالی ہند میں اردو زبان قائم رہنی چاہیے۔ ان میں سے کسی کی رائے طرف دارانہ یا متعصبانہ رائے خیال کی ہی نہیں جا سکتی۔ یہ ہیں وجوہ جس کے مدنظر میں ہندوستانی (اردو) زبان فارسی حروف میں لکھنے پڑھنے کو ترجیح دیتا ہوں'' ۔۳۲

انگریز لیفٹیننٹ گورنر جانتا تھا کہ اگر پنجاب میں مسلمانوں پر زبان کا حربہ بھی کر دیا تو فوجی پنجابی مسلمانوں پر سب سے برا اثر برطانیہ کے خلاف پڑ سکتا ہے۔ اس نے بڑی مصلحت سے یہ فیصلہ سنا دیا اس کے اس فیصلے نے پنجابی گورمکھی اور دیوناگری وغیرہ کے حامیوں اور اردو کے دشمنوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

اس کمیشن نے بھی فیصلہ دے دیا کہ اب پنجابی وغیرہ کو پیش کرنے کا معاملہ چونکہ علمی نہیں ''سیاسی'' بنا دیا گیا لہذا کمیشن اس میں کوئی دخل نہ دے گا۔

اردو کی مخالفت حفیظ کی پیدائش سے پہلے ہی آغاز کر چکی تھی۔ حفیظ نے بھی اردو کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۰۹ء تک سنگھ سبھا نے دوبارہ یہ سوال اٹھایا۔ سکھ اردو کو پنجاب سے اکھاڑ پھینکنے میں اپنی ایڑی ہی نہیں چوٹی کے کیسوں کا زور بھی لگا رہے تھے مگر ۱۹۰۹ء میں سر آئیچسن کی طرح پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر ٹوٹی ڈین نے بھی سارے ہندوستان میں زبان کے شور و شر سے گھبراتے ہوئے سکھوں اور ہندوؤں کے منصوبے یہ کہتے ہوئے رد کر دیئے کہ

''ہمیں اردو کو اعلیٰ تعلیم کا اعلیٰ ذریعہ ماننے پر مجبوراً بدستور قائم رہنا چاہیے'' ۔۳۳

اس انگریز نے سکھوں کو حصول اردو کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی تھی۔

''اردو آپ کو لازماً سیکھنی چاہیے ......اس لیے کہ یہ عدالتوں اور سرکاری دفتروں اور مہذب انسانوں کی مستند زبان ہے۔اب ہماری تمام سرکاری مثلیں اسی زبان میں لکھی رکھی جاتی ہیں پس آپ کو اس معاملے میں اپنے قومی پیشوا سری گوبند سنگھ جی کی مثال پر کاربند ہونا چاہیے۔ جنہوں نے فارسی کو اس وقت کی سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے بہت ذوق شوق سے سیکھا اور اس میں اعلیٰ درجے کی دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ایسی دستگاہ کہ ان کے فارسی اردو اشعار اب تک زبان زد خاص و عام ہیں''۔۳۴

حفیظ پنجابی اور اردو دونوں کے شاعر تھے مگر حفیظ کے مذاق سخن اور غور و فکر نے حفیظ کو اردو میں ہی اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کرنے کی تلقین کی۔

اردو کے خلاف ہر لحہ شعلے بھڑکے بعض امیدوں اور ''شہوں'' کی بنا پر امرتسر ڈسٹرکٹ بورڈ، اور لائل پور ڈسٹرکٹ بورڈ نے یہ قرارداد یں منظور کرا ڈالیں کہ:

''پرائمری مدارس میں تعلیم کا ذریعہ اردو کی جگہ پنجابی کو قرار دیا جائے''۔۳۵

دشمنانِ اردو نے اس مطالبے کو پنجاب کا متفقہ مطالبہ ظاہر کرنے کے لیے شملہ کی چوٹی پر ایک بہت بڑا پنجابی دربار بھی منعقد کر ڈالا۔اس میں پنجابی کے شاعر جن میں ہندو، سکھ اور مسلمان بھی شامل تھے بلائے گئے۔مسلمان شاعر اپنی پنجابی میں سہ حرفی شاعری فرماتے اور ہندوؤں اور سکھوں سے داد کے ساتھ روپیہ بھی بطور امداد حاصل کرتے تھے۔شملے میں اس شاندار پنجابی دربار کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں پر ثابت کر دیا جائے کہ اب پنجابی زبان اردو کی جگہ چھین لینے کے قابل ہو گئی ہے۔حفیظ نے ان لوگوں کو شکست دی۔

شیخ نیاز علی ریٹائرڈ انسپکٹر تعلیمات پنجاب حفیظ سے ملنے ان کے دفتر (مخزن) میں گئے اور کہا کہ جس طرح بھی ہو مجھ ہی کو شملہ پہنچ کر اس فتنے کے خلاف آواز بلند کرنا ضروری ہے کیونکہ میرے سادہ گیت ہندو مسلمان سکھوں کی زبانوں پر ہیں اور سب اسی کو اپنی بولی سمجھتے ہیں اس کے بعد وہ تشریف لے گئے تو حفیظ دارالاشاعت پنجاب گئے اور اپنا روپیہ طلب کیا مگر انہوں نے معذرت کی تو حفیظ نے اپنی بیوی کی چوڑیاں ساڑھے تین سو روپے میں گروی رکھیں اور خود شملہ کے مسلم ہوٹل میں جا پہنچے۔وہاں ہر خاص و عام شاعر حفیظ سے یہی سوال کرتا کہ پنجابی دربار میں بلائے گئے ہو اور اب تو ہم ضرور آئیں گے کیونکہ ہم نے آپ کی زبان سے کبھی پنجابی شعر نہیں سنے۔

حفیظ جب ڈیوی کو ہال کے باہر پہنچے تو سینکڑوں شملوی مسلمان اور ہندو ان کے گرد جمع ہو گئے اندر جانے کا راستہ

بند تھا۔ بکرم سنگھ شہید نے حفیظ کو سٹیج پر جگہ دی۔ حفیظ کے اندر داخل ہوتے وقت لوگوں کا ایک ہجوم بھی اندر داخل ہوا۔ حفیظ کو سامنے دیکھتے ہی مجمعے نے تالیوں ''لو بھئی حفیظ بھی آ گیا'' کے شور کو شملہ کی چوٹی سے بھی بہت بلند کر دیا۔ پنجابی کے شاعر بلائے جاتے اور آتے اپنی بولی میں سناتے رہے چند سامعین جوان کی بولی کو سمجھتے تھے ایک آدھ واہ کہہ دیتے۔ لوگوں نے حفیظ حفیظ کے ساتھ ''ابھی تو میں جوان ہوں''، ''رقاصہ''، ''برسات'' کا شور برپا کر دیا۔ پنجابی دربار کے صدر اور سیکرٹری نے حفیظ کو مخاطب ہو کر کہا کہ میں تو بن بلائے آیا ہوں اپنے پنجابی شاعر بھائیوں کو سننے کا شوق شملے لے آیا۔ ''ابھی تو میں جوان ہوں'' بعد میں سناؤں گا پہلے وہ گیت سناؤں گا جو ہر پنجابی بلکہ ہندوستان کا ہر شخص سمجھتا ہے۔ جسے میں اردو اور گاندھی مہاتما ہندوستانی کہتے ہیں۔ حفیظ پر بیت کے گیت کے ہر بند پر پوچھتے دھرم سے کہو بات سمجھ میں آتی ہے یا نہیں۔ سب کے نعرے تھے ہم سب سمجھ رہے ہیں۔ صدر سیکرٹری نے کہا کہ پہلے ان پنجابی شاعروں کو سن لیجیے جو اتنا خرچ کر کے دور دور سے پنجابی شعر سنانے آتے ہیں۔ حفیظ کو گیت سنائے بغیر نہیں جانے دوں گا۔ اس وعدے پر پنجابی بھائیوں کی شاعری ہوتی رہی آخر لوگ حتیٰ کہ سکھ اور ہندو بھی تنگ آ کر چلا اٹھے کہ دیوان صاحب حفیظ کو سنوا دیجیے اور صدر حفیظ کو بلائے بغیر نہ رہ سکا۔ حفیظ نے ان کو ادب سے مخاطب کر کے کہا کہ یہ زبان کا جھگڑا سامنے بیٹھے ہوئے عوام وخواص کا نہیں ہے یہ تو سیاسی سر پھٹول کے لیے چند لیڈر گلاس کے لوگ پیدا کر رہے ہیں۔ پنجابی اور اردو دو زبانیں نہیں ہیں میں آپ کو دس گیت سنانے کو تیار ہوں۔ ایک گیت کا ایک مصرعہ یا ٹک اگر آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو دھرم کا نام لے کر مجھے ٹوک دیجیے۔

پھر حفیظ نے درشن درشن میرا، لو پھر بسنت آئی، ابھی تو میں جوان ہوں، باری باری سنائی اور ساتھ ہی کہا کہ یہ بولی ہے جس کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ حاضرین چلا اٹھے یہی بولی ہماری زبان ہے اور اس کے ساتھ حفیظ نے سب کو سلام کیا اور باہر نکل آئے لوگ ہجوم در ہجوم ہال سے باہر نکل آئے اور حفیظ کو گھیرے ہوئے ہی ان کی قیام گاہ مسلم ہوٹل تک پہنچا گئے۔

اردو زبان کو ہزار برس میں ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں، دیسیوں پردیسیوں نے مل کر ایک مہذب اور علمی زبان بنایا ہے اور اس قابل کر دیا ہے کہ ہندوستان کی ان گنت مختلف قومیں اس کے ذریعے میل جول، محبت اور یگانگت کے سلسلے کو مضبوط کرتی ہیں اور یہ تفرقہ انگیز سیاست ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو شودر چنڈال بنا دیتا ہے۔ گاندھی مہراج لکھتے چلے جا رہے ہیں کہ اردو کا رسم الخط مسلمانوں کو قرآن کی طرف کھینچتا ہے۔ اس لٹریچر کی طرف بھی جو فارسی میں ہو یا اردو میں سب میں مسلمان کو قرآن ہی نظر آتا ہے۔

(ii) جالندھر کا بہشتی دروازہ

حفیظ کا یہ مضمون جالندھر کا بہشتی دروازہ ایک متفرق مضمون ہے۔ اس مضمون کے اندر اس مزار کی باتیں اور عرس کی تقریب کا احوال ہے۔ اس مضمون کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔ مثال کے طور پر

> ''ادھر اُدھر سڑک کے دونوں کناروں پر تاش کی بازیاں دکھاتی ہوئی نوسر بازوں کی ٹولیاں ایک پیسہ لگاؤ پچاس پیسے لے لو، کے نعرے...... دیہاتی ہی نہیں بلکہ شہری بھی مسلسل پیسے لگاتے ہوئے، ہار جیت مناتے ہوئے ہجوم...... یہ تھا بہشتی دروازے کا میلہ......!''۔۳۶

جالندھر میں ایک چھوٹی سی خانقاہ بہشتی دروازہ کہلاتی ہے۔ یہ ایک بزرگ سید علیم اللہ شاہ کا مزار تھا۔ یہ مزار آدھے ایکڑ زمین پر واقع تھا ایک خاندان جالندھر کے سادات میں سے اس مزار کا مالک اور متولی کہلاتا تھا اس خاندان کے متولی ارکان نے اس مزار پر کچھ سائیں لوگ بٹھا رکھے تھے۔ خود یہ خاندان جالندھر کے جملہ سادات میں ایک حویلی میں رہائش پذیر تھا۔ اس مزار سے سائیں لوگوں کے ذریعے آنے جانے والوں اور منت ماننے والوں اور ماننے والیوں سے ہر روز جو یافت ہوئی تھی یہ خاندان ہر شام وصول کرتا اور آپس میں بانٹ لیتا تھا۔ سید علیم اللہ شاہ اپنی عبادت و زہد و تقویٰ کا ثواب تو ان کی ذاتِ عالی صفات نے دوسری دنیا میں لے لیا ہوگا یا حشر کے بعد یہ جنت میں جو چاہیں گے پائیں گے۔ لیکن اس خاندان نے ان کی قبر پر چھوٹی سی گنبدی بنا کر ایک دروازہ داخلے کا اور دوسرا خارج کے لیے تعمیر کیا اور اسے بہشتی دروازہ کے نام سے مشہور کر دیا۔ یہاں پر ہر سال تین دن میلہ لگتا جس کو بہشتی دروازے کا میلہ کہتے تھے یہ میلہ محرم کی پانچ تاریخ کو لگتا تھا اور اس میں جالندھر شہر اور اس کے اردگرد کے دیہات سے بے شمار لوگ آتے تھے۔

عقیدت مند، مرادیں مانگنے والے مرد ہوں یا عورتیں اس گنبد کے نیچے قبر کے قریب سے گزرنے کے لیے ایک دروازے سے داخل ہوتے، جھکتے، اپنا ماتھا مزار پر گڑتے اور ساتھ ہی اپنی بساط اور اپنے ظرف عقیدت کے مطابق روپے پیسے، بالیاں، چوڑیاں، چڑھاوا چڑھا کر دوسرے دروازے سے نکل جاتے اس طرح داخل ہو کر نکل جانے والے اپنے آپ کو بہشتی بھائی اور بہشتی مائی سمجھ لیتے تھے اور ان کو یہ یقین ہو جاتا کہ اب ان کے تمام گناہ دُھل گئے ہیں اور اب وہ پاک ہیں اور ایک نئے سرے سے زندگی کا آغاز کریں گے۔

اس میلے میں بھی دوسرے میلوں کی طرح کھانے پینے کی اشیاء مثلاً کھانڈ چڑھے ہوئے چنے، تیل میں تلی ہوئی مچھلی کے قتلے، جلیبیاں، پکوڑے وغیرہ پر لوگوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔

دنیا مکافاتِ عمل ہے ''جو بیجیں گا سو وَڈھیں گا'' یعنی تو جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔ لوگ ان آوازوں کو درگاہ تک

آتے اور بہشتی بن کر واپس پلٹتے ہوئے سنتے تھے یعنی ''اے انسان جو بہشتی دروازے سے گزرنے کو جا رہا ہے سمجھ لے کہ آج جو تو بوئے گا، اس کا پھل تجھ کو ویسا ہی ملے گا'' یہ آوازیں کوئی فرشتے نہیں بلکہ سڑک کے دونوں کناروں پر چٹائیاں بچھائے ننگ دھڑنگ ملنگ لوگ مرد زیادہ اور عورتیں کم، بیٹھے ہوئے دین کی تلقین مسلسل کرتے نظر آتے تھے۔ ان چٹائیوں پر روپے تو نہیں البتہ پیسوں، دوانیوں، چوانیوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں چاندی کی بالیوں، مُرکیوں اور ہمہ قسم کے غلوں کے ڈھیر لگتے جاتے تھے۔ یہ تھے بیج جو مسلمان بہشت میں جانے اور وہاں پر جو کچھ ملے گا پھل پانے کے لیے بیج کی مانند بویا کرتے تھے اور سب کو یقین تھا کہ یہی کاشت ہے جو ہمارے لیے پھل لائے گی۔ سب کچھ ملنے کا یقین جالندھر کے اس لیے بہشتی دروازے میں حاضری دینے سے مل جایا کرتا تھا۔

(iii) شعر، شاعر اور مشاعرے

حفیظ کے اس مضمون ''شعر، شاعر اور مشاعرے'' میں چند معاشرتی کج رویوں کا ذکر رواں دواں انداز میں کیا گیا ہے۔

> ''مشاعروں کے اندر گھناؤنے، بڑھے ہوئے اور اُلجھے ہوئے بال سروں پر بکھیرے، شراب میں دھت شاعر نماؤں کی جو آؤ بھگت ہوتی ہے وہ تفریح کا سب سے بڑا سامان ہے''۔ ۳۷

اس مضمون میں شاعروں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ حسن و جمال کو بے نقاب کرنے میں ان شاعروں کا کمال انسانی شرف کی صورتِ زوال ہے۔ ان کے نزدیک بدمعاشی عشق اور فحاشی حسن ہے۔ شاعر جب تک شراب خور نہ ہو اور شراب خوری کے ساتھ شرابی جو اشغال رکھتا ہے وہ سب شاعر میں نہ پائے جائیں تو ایسا فرد ہرگز شاعر نہیں ہے واعر ہے۔ مشاعرے میں بکھرے ہوئے بالوں اور نشے میں دھت شاعروں کی جو آؤ بھگت ہوتی ہے وہ تفریح کا سامان مہیا کرتی ہے۔ لوگ اس رنگ و وضع کے شاعروں کو اپنے دوستوں کی محفل کو گرم کرنے کے لیے دعوت دیتے ہیں۔ ان کو کھانا بھی کھلایا جاتا ہے اور شراب جیسی بھی ملے پلائی جاتی ہے۔ محفل گرم ہوتی ہے خبط الحواسی کے عالم میں یہ شاعر ئے لا، ئے لا جو کچھ ان کے منہ سے نکلے اس کو یہ دعوت دینے والے لوگ، انسانی دنیا پر کسی دوسرے برزخ سے نازل شدہ واردات تصور فرماتے ہیں۔ مشاعروں کی تقریبوں میں بہت سے شاعروں کا پیٹ شراب کباب اور ان کی جیبیں لوگوں سے وصول کیے ہوئے چندے اور مشاعرے پر لگائے ہوئے ٹکٹ سے بھری جاتی ہیں۔

حفیظ جالندھری اس مضمون میں اپنے ایک شعر کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں شعر درج ذیل ہے۔

وہ سامنے دھری ہے صُراحی بھری ہوئی
دونوں جہاں ہیں آج مِرے اختیار میں

حفیظ کہتے ہیں نہ آپ شرابی ہیں اور نہ ہی میں۔ میں تصور میں تنہا بیٹھا ہوا ہوں۔ بھری ہوئی صراحی کو دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ میری انا ایک پکا اور بڑا شاعر ہونے کی مہر مشاعرے سے لگوانا چاہتی ہے۔ تو کیوں نہ صراحی کی گردن ناپ لوں اور پیالے کے بغیر ہی منہ کھول کر غٹ غٹ اپنے حلق سے پیٹ میں انڈیل دوں اور مشاعرے میں لے جایا جاؤں تو اس وقت جو کچھ منہ سے نکلے اس پر واہ واہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور سوچ جو کانٹے کی طرح چبھتی ہے وہ یہ کہ یہ تو لعنتیں ہیں جو اس طرح بڑا شاعر متصور ہو کر واہ واہ کی صورت میں ملتی ہیں۔ یہ شاعری کی تحسین نہیں ہیں۔ حفیظ کہتے ہیں میں نے ابھی تک صراحی کو حلق میں انڈیلا نہیں ہے اب میری نظر دوسرے مصرع پر ہے یعنی دونوں جہاں اپنے اختیار میں ہونے کا دعویٰ اگر صراحی کو منہ لگا لوں تو مشاعرے میں جو اشعار یا تک بندیاں جھوم جھوم کر سناؤں تو میں سب سے بڑا شاعر انا جا سکتا ہوں۔ مشاعرے میں موجود سب لوگ میری مدح سرائی کریں گے اور مدح سننا ہی تو اس دنیا میں سب سے بڑی انسانی آرزو ہے اور شاعر انسانوں کا اصل نمائندہ مانا جاتا ہے۔ یہ آگ اور یہ سیال شے جو سامنے دھری ہوئی اس صراحی میں بند ہے اگر میں اس کو اٹھا کر پیتا تو کیا اس کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں تو ایک اور جہاں میرے ہاتھ میں آ سکتا ہے۔ کیونکہ میں پیدائشی طور مسلمان ہوں کلمہ گو ہوں شاعر سہی لیکن منافق نہیں ہوں۔

ایک جہان ہے لوگوں کی مضحکہ انگیز تفریحی واہ واہ جو شاعر کو مزید ئے لا کے بعد ئے لا پر خوش رکھتی ہے دوسرا جہاں وہ منزل مراد جس کی جانب ہر فرد بشر اپنی حرکات کے ساتھ قدم بڑھائے چلا جا رہا ہے۔ جس کا دروازہ سب پر کھلا ہے۔

(iv) بھارتی حملے سے چند برس پہلے

حفیظ کے اس مضمون ''بھارتی حملے سے چند برس پہلے'' کا اسلوب ان سطور سے ظاہر ہوتا ہے

> ''آسمانی آواز یہ بھی کہہ رہی ہے پاکستانیو، کشمیر تمہارے ہاتھ نہیں تو تم خود بھی نہیں ہو کیا تم نہیں دیکھتے کہ کشمیر جنت نظیر کی بہار جہنم زار بنی ہوئی ہے کیا کشمیری مسلمان تمہارے اپنے دینی بھائی بہنیں نہیں ہیں کیا تم نے ان کی چیخ و پکار نہیں سن رہے ہو''۳۸

اس مضمون میں کشمیری مسلمانوں کے ساتھ ہونے والا ظلم اور ان کے بہادرانہ جذبے کو دکھایا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستانی مسلمانوں کو متحد رہنے کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ کہ باہمی اتحاد کے ساتھ ایسے مضبوط بن جاؤ کہ اگر دشمن تم سے ٹکرانے کے لیے امریکی و برطانوی بجلیاں لے کر آئیں بھی تو اس طرح منہ کی کھائیں جس طرح راجہ جے پال نے درہ خیبر میں گھیر کر سلطان سبتگین پر حملہ کیا تھا اور منہ کی کھائی تھی۔

ہم پاکستانی مسلمانوں کو کہا جا رہا ہے کہ کشمیری مسلمان تمہارے بہن بھائی ہیں کیا ان کی چیخ و پکار نہیں سن رہے ہو؟ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ ان کی چیخ و پکار کو بند کرائے۔ ہم خود تو اپنی رنگ رلیوں میں لگے ہوئے ہیں ہم کسی کے تن پر اچھا کپڑا بھی گوارا نہیں کرتے۔ حکومت امریکہ سے نہیں تو چین سے مدد لے کر غنیم کو سرحد ہی پر روک دے گی۔

ہم اس نیم براعظم کے مسلمان خلافت اور کانگریس کے چند روزہ میل ملاپ کے عارضی وقفے کے بعد شدھی سنگٹھن اور پھر نہرو رپورٹ کے ''ہندو مسلم بھائی بھائی'' کی اصل صورت بھونچکے ہو کر دیکھ رہے تھے اور ہندو مہاسبھا پوتر بھارت ورش کی دھرتی سے مسلمان کہلانے والوں میں سے چند لاکھ انسانوں کو اس دھرتی ماتا کی گود سے اکھاڑنے کا منصوبہ عمل میں لا رہی تھی جو عربستان، افغانستان یا ترکستان سے آنے والوں کی اولاد ہیں اور ان کروڑوں کو شودر اور چنڈال بنا کر پچھاڑنے کا جتن کر رہی تھی جو اس خالص کفرستان مسلمان ہونے کے بعد بھی اس ملک میں آباد ہیں۔ اس وقت محض کشمیری مسلمان ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے عملی طور پر آزادی کا علم بلند کیا اور انگریزی لوہے کی بنی ہوئی خاردار سلاخوں کے اندر سے ایک شیر کی دھاڑ گونجی تھی۔

برطانیہ کے لوگ کشمیریوں کو بزدل سمجھتے تھے۔ نیم براعظم ہند کے بہادر سیٹھ ساہوکار اور سود خور بھی یہی خیال کر رہے تھے کہ کشمیری مسلمان بھیڑ بکریاں ہیں یا زیادہ سے زیادہ دو دو مَن بوجھ اٹھا کر چند پیسوں کے لیے گڑگڑانے والے ساتھ ہیں۔ ان کشمیری مسلمانوں کو بال بچوں اور زمینوں سمیت انگریز نے سرزمین کشمیر کے ساتھ ہی پچھتر لاکھ روپے میں بیچ دیا تھا اور یہ سودا ساہوکار ڈوگرہ سے ہوا جس کا پہلا نام گلاب سنگھ تھا۔ جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی دلالی کرتا ہوا گلابو سے گلاب سنگھ بن گیا تھا۔ اس نے سکھوں کے بعد انگریزوں کی مدد سے جموں کشمیر قبضہ کر لیا تھا گلابو سنگھ کی اولاد اور برادری مسلمانوں کو بھینٹ چڑھا چڑھا کر جموں کشمیر کی مہاراج ادھیراج بن بیٹھی تھی اور کشمیری مسلمانوں سے بھیڑ بکریوں کی طرح کام لیا جاتا تھا۔ لیکن پہاڑوں سے گھرے ہوئے اس باڑے سے ایک مسلمان کی آواز شیر کی دھاڑ بن کر گونجی تو نیم براعظم ہند میں ہلچل مچ گئی تھی۔ اس دھاڑ کو سن کر ڈوگرے سے سیٹھ مہاراج نے اپنے کلرک کو بلایا جس کا نام کاک تھا وہ اپنے ساتھ انگریزی گماشتے بھی لایا۔ سب نے اس دھاڑ کا منہ بند کرنے کے لیے انگریز دیوتا کا پچھتر لاکھ کا خط دیکھا اور اس کو جانچا۔ پھر انگریزی بندوقوں کی گولیاں چلیں، ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنائی گئیں لیکن شیر دھاڑتا رہا اور وہ لاکھوں جن کو بھیڑ

بکری گردانا گیا تھا اپنی پرانی شیرانہ خُو پر آ گئے۔

اور جہاں تک حکومت کی بات ہے تو ہم مسلمانوں نے کانگریسی بگلہ بھگتوں کے ساتھ میل ملاپ کے دنوں غیر ملکی حکومت کے خلاف اتنا ہی سیکھا کہ حکومت چاہے کسی معاملے میں اچھائی بھی کرے، جب بھی الزام ہی دیتے جاؤ۔ کانگریسیوں کا مقصود تو یہ تھا کہ لیگ یا خلافتیں نہیں کانگریسی بگلہ بھگت برسرِ اقتدار آ جائیں اور ہمارا گلا اس طرح دبائیں کہ اسلام کا نام تک بھول جائیں۔

(۷) ہمارے کلمہ گو اچھوت

حفیظ کو اس متفرق مضمون ''ہمارے کلمہ گو اچھوت'' میں مسلمان کو ملت واحدہ کا ثبوت دیتے دکھایا گیا ہے

> ''ہم انسان جو بھی مسلمان ہیں اپنے دین ایمان کے ساتھ رہنے بسنے کی خوشی میں بغلیں بجا رہے ہیں وہ جو دوسرے دین دھرم کے لوگ ہیں ان پر ثابت کر رہے ہیں کہ ہمارا دین ایمان انسان کی ایسی ہی بہتری کے لیے ہے ہمارا وجود مسلمان کے سوا ہر انسان کی مسرت کے لیے ہے ہم ساری دنیائے انسانی کی ترقی چاہنے کا ایک نمونہ ہیں''۔۳۹

پاکستان کے مسلمان ساری دنیا میں اسلامی ملت واحدہ کا ایک بہت بڑا حصہ ہیں اور یہ حصہ اس ملک کی مالک ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ ہم دعوے دار ہیں کہ ہمارا ملک سارے کرۂ ارض پر واحد ایسا ملک ہے جو اسلامی مساوات و اخوت کا علمبردار ہے۔ نیم براعظم ہند میں ایک ہزار سال حکمران رہنے والے مسلمانوں کو ''جاتی پاتی'' اکثریت اچھوت ہی سمجھتی تھی لہذا ہم نے اپنا گھر الگ کر لیا تھا تاکہ ثابت ہو جائے کہ نہ ہم اچھوت ہیں اور نہ دنیا میں کوئی اور انسان اچھوت ہے۔

اسلامی ملت واحدہ کا دین و ایمان ہی انسان کی مساواتی معاشرت ہے اور اس معاشرت کا سامان ہے ہمارا دین ہماری سیاست، ثقافت اور ایمان ہم رات دن ورد کرتے ہیں کہ آخرت کی کھیتی ہماری دنیوی زندگی ہے۔ اسلامی ملت واحدہ سینکڑوں، ہزاروں مقالات اور بیسیوں ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان مسلمانوں کی نسلیں، قومیتیں، رنگ ڈھنگ اور عادات واطوار الگ الگ ہیں۔ لیکن اس رنگا رنگی میں اسلام ہم آہنگی ہے یہ ہم رنگی ہے ایک کلمہ طیبہ کو زبان سے کہنے اور دل سے مانتے رہنے کی ہم آہنگی اور یہ ہے ہم ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کلمہ پڑھنے والا کالا ہو یا گورا، عربی یا عجمی۔ ایک اللہ

کے سوا کوئی اور نہیں جس کے حکم کی تعمیل ہم کریں۔ یہ حکم ایک کتاب، قرآن میں حرف بہ حرف موجود ہے۔ اللہ کے احکام ہمیں اس وجود پاک کے ذریعے پہنچائے جا چکے ہیں جن کا اسم مبارک زبان پر آتے ہی ہم درود پڑھتے ہیں۔

ہر وہ انسان جو یہ اعلان کرتا ہے کہ میں کلمہ طیبہ پر ایمان رکھتا ہوں وہ ایک واحد نظریہ حیات کی وجہ سے ایک واحد ملت میں شامل ہو جاتا ہے وہ کسی رنگ کا ہو کسی ملک میں رہتا ہو، مالدار ہو یا مفلس، طاقتور ہو یا کمزور ایک واحد برادری کا فرد ہے۔ برابر کا فرد، برادری کو اخوت کہتے ہیں اور برابری کو مساوات۔

اگر ایک آدمی کلمہ طیبہ پڑھتا ہے یعنی اس واحد اسلامی برادری کا ایک فرد ہونے کا اعلان کرتا ہے تو خواہ وہ جھاڑو ہی کیوں نہ دیتا ہو گندگیاں ہی صاف کیوں نہ کرتا ہو خواہ وہ تخت پر کیوں نہ ممکن ہو، عالم ہو یا جاہل، پیر ہو یا مرید حاکم یا محکوم، تاجر ہو یا خریدار، بڑا کرخندار ہو یا ٹوکری ڈھونے والا مزدور اس برادری میں سب کے سب برابر ہیں۔ ہم پکار پکار کر دنیا کو بتاتے ہیں کہ مسلمان ایک ملت واحدہ ہیں اسی طرح جیسے ایک انسان کا جسم۔

اگر انسان کے جسم کا ایک حصہ گندا ہو تو وہ اسے دھو کر پاک صاف کر لیتا ہے۔ جیسے استنجا کرتے وقت ہاتھ گندا ہوتا ہے تو اس ہاتھ کو دھو کر ہم پاک صاف سمجھتے ہیں اور اسی ہاتھ سے پاکیزہ سے پاکیزہ۔ مقدس سے مقدس چیز کو ہاتھ لگانے سے پرہیز نہیں کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ شخص مرد یا عورت جس کو ہم بھنگی، بھنگن، چوہڑا، چوہڑی کہتے ہیں ان سے گندگی اٹھوائے چلے جانے کا کام نسلاً بعد نسلاً لیتے چلے جانے کی نیت سے اس کو مہتر، نوکر، جمعدار اور مادہ کو جمادارنی کہہ کر عزت بخشتے ہیں۔ ہم ان سب کی زبانوں سے بھی کلمہ طیبہ سنتے ہیں ان کو اچھوت سمجھنا ملت واحدہ کے خلاف بات ہے۔ آدم زاد کے لیے کوئی آدم زاد اچھوت نہیں اور پھر جس نے کلمہ طیبہ پڑھ کر اسلام کا اعلان کیا ہے وہ تو ملت واحدہ اسلامیہ کے جسم کا ایک حصہ ہے۔

نیم براعظم میں ہندوؤں سے سیکھ کر ہم نے چھوت چھات کو کس طرح اپنی زندگیوں کا تعویذ بنا رکھا ہے ایسا تعویذ جس نے ان تمام لوگوں کو جو ہماری ہی طرح انسان ہیں جو ہندوؤں کے مظالم اور نفرت کے مارے ہوئے ہم سے اسلام کا درس لینے کے لیے ہمارے خادم ہیں کلمہ پڑھتے ہیں۔ مسلمان ہیں ہم نے ان کو رفتہ رفتہ عیسائی ہونے پر مجبور کر دیا ہے اور پاکستان کی بہت بڑی طاقت اسلام دشمنوں کے ہاتھوں اس ملک کی بیخ کنی ہماری اس پاکیزہ چھوت چھات کے چلن سے ہو رہی ہے۔

(vi) فرشتے آئیں گے تنبیہ کو

حفیظ کے اس مضمون '' فرشتے آئیں گے تنبیہ کو'' میں مسلمانوں پر طنز کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

> ''سچ کہنے والے کی بات پر گالی دیجیے۔ تحسین کیجئے ان کی جو فساد باہمی کی تعلیم دیتے ہیں، چنتے جایئے فرقہ بازی کے کاغذی پھول چنتے جایئے کیونکہ آپ کے لیے ان ہی کاغذی پھولوں میں ناچ نچوانے کا جادو بھرا ہوا ہے خبردار کرنے والے کسی بے وقوف کی نہ سنیے ساتھ ہی خود اعلان بھی کرتے جایئے کہ بھارت کو ہم کچل دیں گے''۔۴۰

حفیظ اپنے اس مضمون میں ہم مسلمانوں پر طنز کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ ہم برے کام کرتے جائیں اور جو ہمیں تلقین یا سمجھاتے ہیں ہم ان کا مسکرا کر مذاق اڑاتے ہیں۔ اسی لیے حفیظ کہتے ہیں کہ ہمارا حال کچھ ایسا ہے کہ۔

آسمان سے کچھ فرشتے آئیں گے تعلیم کو

عالم فاضل جو قرآن کریم کے اصل معانی ہم کو بتا سکتے ہیں وہ ہم کو یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ قرآن کریم بھی اور تاریخ بھی یہی بتا رہے ہے کہ آسمان سے جب بھی غافل اور فاسق فاجر قوم کی تنبیہ کے لیے فرشتے اتارے جاتے ہیں تو جو حشر اس قوم کا ہوتا ہے وہ تا قیامت ہولناک سزا کا نشان بن جاتا ہے۔ قرآن کو ہم نے محض جھوٹی قسم کھانے کے لیے لکھا ہوا ہے کیونکہ ہم نام کے مسلمان اس پر عمل نہیں کرتے ہیں۔ ہم وہی ناچ ناچ رہے ہیں جو مٹنے سے پہلے بد بخت قومیں ناچا کرتی تھیں۔ سینما میں غیر ملکی ہی نہیں بلکہ اپنے ملک میں بنی ہوئی زندہ ناچ گانے کی پھدکتی اور رنگ رنگ کے انگ دکھاتی ہوئی زینتوں کی جسمانی بناوٹ والی تصویریں دیکھتے ہوئے ناچتے ہیں۔ اس ناچ کو اسلامی ناچ قرار دے کر اپنی اسکولی اور کالجی بچیوں کو کھلے میدانوں اور وسیع ایوانوں میں نچوائے ہیں۔

بازاروں میں دوسروں کا حق مار کر اپنی تجوریاں بھرنا اور اپنے ہی جیسے بھائیوں کا گوشت اتار کر قیمہ کر کے کباب بنا لیتے ہیں اور اپنی ہی بچیوں کے خون کی شراب لنڈھاتے ہوئے ناچتے ہیں۔ ہم ان مجاہدوں کو بھی بھول چکے ہیں جو دن رات ہماری حفاظت کے لیے مشقت کر رہے ہیں اور ان شہیدوں کو بھی جن کا ثانی صحابہ کرام کے بعد تاریخ میں غازیانِ پاکستان کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

ہم اسلامی ناچ ناچتے ہیں ہم ان کی ریس کیوں کریں جو ہمیں اور ہمارے خاندانوں کو آنے والے دن سے بچانے کے لیے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں بلکہ ان کی ریس کریں وہ جو زندہ رہنا نہیں چاہتے اور وہ جو ایک رسول ﷺ ایک قرآن اور ایک ہی ایمان کے جھنڈے تلے متحد ہو جانے اور اپنے دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹ جانے کے لیے بلا

رہے ہیں۔ہمیں آپس میں اتحاد کرنا ہوگا حرام کو چھوڑ کر حلال کے لیے سَر دھنا ہوگا۔شیرانہ اور مردانہ لباس کے لیے ایمان دارنہ محنت و مشقت کا پسینہ بنا ہوگا۔ ہم میں سے کسی کو ہوش ہے کہ مشرقی پاکستان میں جو ہو رہا ہے اس کو نہ روکا تو مغربی پاکستان پر بھارت حملہ کر سکتا ہے اور یہ حملہ ہوا تو ہم اپنے ذاتی مفاد اور تفرقہ بازی ہی کے ناچ کا ایسا ناخوشگوار تاریخی مزہ لیں گے جو آج تک تاریخ ملت میں موجود نہیں۔

(vii) پتنگ اور شاعری

اس مضمون ''پتنگ اور شاعری'' میں پتنگ اڑانے کو بھی ایک فن کہا گیا ہے۔شاعری کے اجزا کو پتنگ کے اجزا سے تشبیہ دی گئی ہے۔

> ''پتنگ بلندیوں پر اڑانا اور ہواؤں میں قائم رکھنا پیچے لڑا کر فتح پانا بھی ایک فن ہے پتنگ بازی کا شوق ہے تو کسی استاد پتنگ باز سے یہ فن سیکھنا ضروری ہے''[۱۴۱]

حفیظ کو ابتدائی غزل طفلانہ پتنگ بازی کی سی امنگ نظر آتی ہے۔غزل کے اشعار، پتنگ، گڈے گڈیاں اور تکلیں جن کا خلا میں تیرنا جاذب چشم خیال تھا۔حفیظ کو بھی ہ پتنگ اڑانے کی خواہش ہوئی کہ ڈورے میرے ہاتھ میں ہوا اور میرا پتنگ سب سے اونچا ہو۔ وہ شعر سازی سے پہلے پتنگ اڑانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ وہ اپنی حویلی کی تیسری منزل پر کھڑا ہو کر پتنگ اڑاتے ہیں۔ دوسری پتنگوں سے پیچ بھی لڑتے کبھی ان کے پتنگ کی ڈور کٹتی اور کبھی دوسروں کی اور وہ کاٹا وہ کاٹا کا شور مچ جاتا۔ پتنگ اڑانا اور پیچے لڑانا بھی ایک فن ہے جس کے لیے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔حفیظ کو شعر کی پتنگ بازی کا بھی بہت شوق تھا۔مگر جالندھر میں ان کو کوئی استاد نہ ملا۔ بالآخر حفیظ کے ہاتھ محمد حسین آزادی کی کتاب ''آب حیات'' آ گئی جس نے حفیظ کو میر تقی، میر درد، انشا، ذوق، مومن اور غالب تک پہنچا دیا۔ یہ تمام اردو شاعری کے وہ باکمال پتنگ ساز و پتنگ باز ہیں کہ ان کی تکلیں پتنگیں اپنا اپنا جدا رنگ و روپ رکھتی ہیں اور فضاؤں میں مسلسل اڑتی ہی رہتی ہیں۔ حفیظ نے کتابوں میں سجی ہوئی اونچی اڑان سے اپنے ذوق نظر و قلب سے پتنگ خانے اور بلندیوں پر قائم رکھنے کی کاریگری کا راز بھی پالیا۔

شاعری کی صلاحیت بھی خداداد ہوتی ہے۔شاعری کے پتنگوں، کنکوؤں کے بنانے سنوارنے کے ان تمام سالوں یا دوسرے لفظوں میں صنائع بدائع، مصطلحات، لوازماتِ شعر کو جان لینے اور مہیا رکھنے کی ضرورت کے باوجود پتنگ اپنی طبع زاد ایجاد سے خود بخود عمدہ بنانا مشکل تو ہے لیکن محال نہیں۔

وہ الفاظ مصطلحات ترکیبیں، تلازمے، صنائع بدائع وغیرہ تو مدتوں کے بنے ہوئے چلے آ رہے ہیں لیکن پتنگ کی وضع قطع اور اسے اونچی سے اونچی اڑان پر لے جانا قائم رکھنا یہ اپنی اندرونی ذات یعنی خداداد صلاحیت پر منحصر ہے۔ حفیظ کو اپنے استاد داغ سے بہتر پتنگیں بنانے کا شوق رہا اور بنا بھی لیں اور واہ واہ بھی ہوئی لیکن گرامی صاحب روک دیا کہ اگر تم نے داغ کے رنگ کی داغ سے بہتر پتنگیں بنا بھی لیں تو یہ تمہارا نہیں بلکہ داغ کا کمال گنا جائے گا۔ تم اپنا شوق پورا کرنے کے لیے اپنے قلب کو چیرو اور پھر شاعری کرو۔ شعر بازی میں دوسروں کی تقلید تو نقالی ہے شاعری نہیں۔ حفیظ نے اپنے استاد کی بات مان لی اور اپنے قلب کو ہی نہیں بلکہ جگر کے خون سے اپنے پتنگ اڑانے کا مانجھا بنایا اور لگائے چلا جا رہا ہے اور ڈور حفیظ کی رگ زندگی ہے لیکن اب حفیظ کو پیچے لڑانے کا شوق نہیں رہا۔

(viii) قدم کس رخ پر

یہ مضمون ''قدم کس رخ پر'' ایک انٹرویو پر مشتمل ہے یہ انٹرویو حفیظ سے جون ۱۹۷۰ء میں لیا گیا۔ اس مضمون میں ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد پاکستان کے مسلمانوں کے رویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔

> ''ہر دکاندار جو انسانوں کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، بچھونے، پڑھنے لکھنے اور ضروریات پیدائش و مرگ بیچتے ہیں چیز کی اصل قیمت پر جو نفع جی چاہتا ہے لگاتے ہیں اور ضرورت مند کو بدزبانی کے جو ہر دکھا کر دھونس کے ساتھ جو چاہیں وصول فرماتے ہیں'' ۴۲

قدم کس رخ پر کے انٹرویو میں سوال کیا گیا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد سے ہم پاکستان کے مسلمان کس رخ پر چل رہے ہیں؟ اس کے جواب میں یہ کہا گیا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران قوم کی یکجہتی، وحدت اور ایک دوسرے کی مدد، رشوت، قتل و غارت، زنا کا یک لخت بند ہو جانا، چوری اور رہزنی کی وارداتوں کا بہت بڑی حد تک فقدان اور اس فضا کا فخریہ اظہار ان نظموں سے ہوا کرتا تھا جو ریڈیو پاکستان اور ریڈیو آزاد کشمیر پر سنی جاتی تھیں۔ یہ نظمیات فوج کو ہی نہیں کروڑوں شہری مرد و زن کو بھی ایک جائز فخر کا احساس دلاتی تھیں۔

دوسرا سوال ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ہم مسلمانانِ پاکستان کیا کر رہے ہیں؟ اس کے جواب میں یہ کہا گیا کہ عیش کر رہے ہیں۔ موج میلا کر رہے ہیں۔ شہر ہوں یا دیہات افواج کی فتح مندی کو اپنی ہی بہادری، اپنی بے باکی قرار

دے لینے والے ''بلند ہمت'' لوگ مسلمان بیٹیوں، بہنوں، عورتوں کو زبردستی اغواء کرتے ہیں۔ مسلمان کارخانہ دار اپنی قوم کے ہر فرد کا خون ہر چیز کی ناجائز ایک سو پچھتر گنا زیادہ قیمت وصول کرنے کی ترکیب سے چوستے ہیں اور بلیک مارکیٹوں میں خفتہ و نہفتہ یافت مسلسل ترقی کر رہی ہیں۔

تیسرا سوال کیا یہ خطرے سے بے خبری کا عالم ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ جی نہیں ہم سب جانتے ہیں سرحد کے اس پار آگ، گندھک، بجلی اور لوہے کا طوفان زمین اور آسمان پر سے پاکستان کے سر پر جھوم جھوم کر آ چکا ہے۔ تہ در تہ بادل پر افق سے برسنے کے لیے رعد کی مانند گرج رہا ہے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی کہ حملہ آوروں نے نئے ہتھیار استعمال کرنا آغاز کر لیتے تھے یہ ہتھیار دوبارہ حملہ کرنے سے پہلے ہم میں پھوٹ ڈالنے کی ہر طرح کی تفرقہ سازی کی پرانی برطانوی بازی تھی۔ چونکہ ہم ترقی پسند سے ہیں۔ اب ان سے انعام لیتے ہوئے ہم خود تفرقہ پرور ہیں۔ پھوٹ ڈالنے کا ہتھیار ثقافت نامی ہے اور اسی ہتھیار کے ذریعے کامیاب ہو کر بھارت مہا بھارت کے مہا یدھ کا سنکھ بجا رہا ہے۔ بھارت کے مسلمان جسے ہندالا پتے اور ہم کو برا بھلا کہتے ہوئے بھی ڈھٹ ہیں اور خاک و خون میں تڑپائے، جلائے اور جھٹکائے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے اخباروں میں تو قتل عام کا نام فساد رکھ کر ہزاروں سنانیوں میں سے ایک آدھ خبر آتی ہے یہ خبر فرانس یا کسی اور ملک میں پہنچ کر پاکستان میں بھی پہنچ جاتے تو ہم سے چھپی نہیں رہتی لیکن وہاں مسلمانوں کے خون سے دھرتی ماتا جس طرح سیراب ہو رہی ہے اور مسلمانوں کی ہڈیوں سے جو کھاد بن رہی ہے اس کا حال انہی فرانسیسی، انگریز، امریکی اور روسیوں کی مدد سے سب کچھ ہو رہا ہے۔

ہم ۱۹۶۵ء میں افواجِ پاکستان کی شیرانہ اور غازیانہ دلیری کو سراہتے ہیں جوان مجاہدوں نے ہم غیر فوجیوں کے مال، ناموس اور جانیں بچا لینے کے لیے کی تھی لیکن خود رات دن اپنی ہی بیٹیوں، بہنوں کے ناموس اور ساری ملت کے جان اور مال پر دست دراز ہیں۔

اگر پاکستان کے ذمہ دار اور باخبر افراد بھی ہمیں بتا دیں کہ پاکستان کے سر پر جنگ کا خطرہ منڈلا رہا ہے تو ہم افرادِ ملت کروڑوں مسلمان ملک و ملت کو اس خطرے کے مقابل تیار اور خبردار رہنے کی بجائے جو کچھ کر رہے ہیں شاید اسی کا نام مزے کی زندگی ہے۔ ہم تو دشمن کے آنے سے پہلے ہی اپنی ماں بہنوں کی عصمت دری کرنے کے ہنر، لوٹ اور قتل و غارت اور گھرانے گھرانے فرد فرد کی تفریق میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی ہمت سے ایسی تیاری کر رہے ہیں کہ دشمن آ جائے تو ہم سب کو اپنی مرضی کے مطابق استقبال کے لیے خون و خاک میں رقصاں پائے۔

(ix) نادِر" عجوبہ"

اس متفرق مضمون" نادر عجوبہ" کو سادہ سلیس اور رواں اسلوب میں بیان کیا گیا ہے مثال کے طور پر

> "میری طرف دیکھ کر حضرت نے کہا: برخوردار تم رسول اللہ کے اسم گرامی سے مجھے خوش کرتے ہو تمہارے لیے میرے پاس بس دعائیں ہی ہیں۔ انشاء اللہ تم دیکھو گے کہ آج تو تم دوسری کی لکھی ہوئی نعتیں سناتے ہو، لیکن ایک دن تمہاری لکھی ہوئی نعتیں لوگ دوسروں کو سنایا کریں گے"۔۴۳

"سیارہ ڈائجسٹ" کے مدیر مقبول جہانگیر نے حفیظ کو ۱۹۷۱ء کے اولین روز شائع ہونے والے سالنامے کے لیے کوئی نثری نذرانہ پیش کرنے کے لیے مئودبانہ گذارش کی۔ حفیظ اکہتر برس کی عمر میں بیماری کے باوجود صحت مند دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی پرانی تحریر کو غیر مطبوعہ قرار دے کر مقبول جہانگیر کو بھیجنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ان کو سیارہ ڈائجسٹ کا شمارہ دسمبر ۱۹۷۰ء مل گیا جس کے ایک مضمون نے حفیظ کی مشکل آسان کردی۔ اکبر کاظمی کا مضمون" وہ کون تھا" میں وہ کہتے ہیں کہ ان کا چھوٹا بھائی بیمار ہو گیا اور بیماری یہ تھی کہ بیٹھے بٹھائے تڑپنے لگتا اور چیخیں مارتے مارتے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ بہت علاج کروایا آخر معلوم ہوا کہ" رام رکھا" نامی ایک بھوت کسی بے ادبی کا انتقام لینے کے لیے اس معصوم کے سر پر چڑھا ہوا ہے۔ ایک بزرگ نے کلام الٰہی کی کرامت سے اس بھوت سے نجات دلائی اور اب اکبر کاظمی کا چھوٹا بھائی ہیڈ کلرک اور ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ اور اس قسم کے دوسرے صحیفے میں اس طرح کے واقعات پڑھ کر عقل مند لوگ ہنستے ہیں اور ایسے واقعات کو جھوٹ کا نام دیتے ہیں۔ حفیظ نے بھی ایک ایسا عجوبہ واقعہ دیکھا جس سے وہ بلاتکلف بیان کرتے ہیں۔ حفیظ کو بارہ سال کی عمر میں نعت خوانی کی محفلوں میں بلایا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں شعروشاعری بھی کرنے لگے مگر سکول سے بھاگ جانے کی وجہ سے آوارہ مشہور ہو گئے۔ حفیظ کا رشتہ اپنی خالہ زاد کے ساتھ ہو گیا ان کے خالو نے اپنے مرشد سے یہ تصدیق کرانی چاہی کہ ان کی بیٹی کا رشتہ ان سے ہو یا نہ ہو اس لیے وہ حفیظ کو شہر گجرات کے قریب قصبہ جلال پور جٹاں لے گئے۔ اسی پچاسی برس کی عمر کے بزرگ حضرت قاضی عبدالحکیمؒ تھے جن کے پاس لوگ دینی اور دنیوی استفادہ کی غرض سے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ ساون کا مہینہ تھا اور بارش نہیں ہو رہی تھی۔ لوگ بارش کے لیے میدان میں جا کر نماز استسقاء ادا کرتے تھے۔ بچے، بوڑھے، جوان مرد وزن دعا کرتے لیکن گھنگھور گھٹا تو کیا کوئی معمولی بدلی بھی نمودار نہ ہوتی تھی۔

قاضی صاحب ایک بڑے کمرے میں مصلے پر بیٹھتے تھے اور ان کے پاس بہت سے نیاز مند بھی بیٹھے ہوئے تھے

کہ سات آٹھ مولوی صاحبان اندر داخل ہوئے اور سلام عرض کرنے کے بعد کہنے لگے کہ ہمیں ہزاروں مسلمانوں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ نمازی اور بے نماز سب بارانِ رحمت کے لیے دعا کرتے کرتے ہار گئے ہیں۔ ہر جگہ نماز استسقا ادا کی جارہی ہے۔ کیا آپ اور آپ کے ان مریدوں کے دلوں میں کوئی احساس نہیں ہے۔ کہ یہ لوگ اٹھ کر نماز میں شرکت کریں۔ قاضی صاحب نے پوچھا کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں تو ان میں سے ایک مولوی نے کہا کہ اگر تعویذ گنڈا نہیں تو کچھ دعا ہی کردیں سنا ہے پیروں فقیروں کی دعا جلد قبول ہوتی ہے۔ یہ الفاظ سن کر قاضی صاحب مسکرائے اور فرمایا'' آپ کتوں سے کیوں نہیں کہتے کہ دعا کریں'' یہ سن کر مولوی صاحبان کو غصہ آگیا اور بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے تھوڑی دیر بعد ان میں سے دو مولوی اندر آئے اور کہا کہ ''حضرت! ہم تو کتوں کی بولی نہیں بول سکتے آپ ہی کتوں سے دعا کرنے کے لیے فرمایئے''۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا کل صبح تشریف لایئے کتوں سے دعا کروائی جائے گی۔ مولوی صاحبان نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ صوفی لوگ اچھے خاصے مسخرے ہوتے ہیں۔

قاضی صاحب نے چھوٹے قاضی صاحب کو بلا کر حلوے کی تیاری کا حکم دیا اور ڈھاک کے پتوں کے ڈیڑھ سو دونے بھی منگوا کر رکھنے کو کہا اور ڈیوڑھی کے باہر ساری گلی میں صفائی بھی کی جائے کل نماز فجر کے بعد میں خود مہمانداری میں شامل ہوں گا۔ لہٰذا حلوے کی تیاری کے لیے چیزیں نکالی جانے لگیں۔ مرید لوگ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے کہ کتوں کو حلوہ کھاتے کبھی نہیں دیکھا۔ صبح ہوئی نماز فجر کے بعد قاضی صاحب دو تین آدمیوں کے ساتھ ڈیوڑھی سے باہر آئے جلال پور جٹاں میں سے مختلف عمر کے لوگ بچے، بوڑھے، جوان سبھی کتوں کی ضیافت کا کرشمہ دیکھنے کے لیے اس گلی میں جمع ہونے لگے۔ حفیظ قاضی صاحب نے بھتیجے محمد اکرام کے ساتھ مسجد کی چھت سے یہ عجیب وغریب تماشا دیکھنے لگے۔ قاضی صاحب نے ایک سو بائیس دونوں کو حلوے سے پُر کیا۔ ایک کتا جو کہ یہاں کا باسی تھا اس کے ساتھ بہت سے کتے آئے ان میں سے ایک بھی بھونک نہیں رہا تھا اور نہ ہی غرا رہا تھا۔ قاضی صاحب نے لوگوں کو خاموش رہنے کی تلقین کی۔ گلی والا کتا کالو قاضی صاحب کے قدموں میں آ کر دُم ہلانے لگا۔ قاضی صاحب نے جو الفاظ فرمائے وہ یہ تھے۔

> ''بھئی کالو! تم تو ہمارے قریب ہی رہتے ہو دیکھو، انسانوں پر اللہ میاں رحمت کی بارش نہیں برسا رہے۔ اللہ کی اور مخلوق بھی ہم انسانوں کے گناہوں کے سبب ہلاک ہورہی ہے اپنے ساتھیوں سے کہو، سب مل کر بیٹھ کر یہ حلوہ کھائیں پھر اللہ سے دعا کریں کہ رحمۃ للعالمین ﷺ کے صدقے بادلوں کو اجازت دیں تاکہ وہ پیاسی زمین پر برس جائیں''۔۴۴

قاضی صاحب یہ فرما کر اپنی ڈیوڑھی کے دروازے میں کھڑے ہو گئے اور سب نے ایک عجوبہ دیکھا۔ ہر ایک دونے

کے گرد تین کتے جھک گئے سب حلوہ کھا رہے تھے اور کالو کتا سب کی نگرانی کر رہا تھا یا میز بانی مگر وہ خود نہیں کھا رہا تھا۔ سب نے حلوہ کھانے کے بعد آسمان کی طرف منہ کر کے ایک ایسی متحد آواز میں غرانا شروع کیا اور تھوڑی دیر بعد یہ اس گلی سے چلے گئے ان کے جانے کے بعد قاضی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ اسی لمحے بادل گرجا اور بارش ہونے لگی۔ مولوی صاحبان بھی حلوہ کھانے کے لیے اندر آ گئے اور کچھ نے اس عجوبہ کو جادو کہا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ کتوں نے کبھی مل جل کر نہیں کھایا۔ لیکن یہ تمام آج بھلائی کے لیے جمع ہوئے تھے ان کے امام نے کچھ نہیں کھایا اب وہ آئے گا تو میں اس کے لیے حلوہ حاضر کروں گا۔

حفیظ کو انہی قاضی صاحب نے دعا دی تھی کہ تم مجھے دوسروں کی لکھی ہوئی نعتیں سناتے ہو ایک دن تمہاری لکھی ہوئی نعتیں لوگ دوسروں کو سنایا کریں گے۔ حفیظ کی شاہنامہ اسلام ساری دنیا کے اردو جاننے والے مسلمان خود بھی پڑھتے ہیں اور دوسروں کو بھی سناتے ہیں۔

حفیظ کہتے ہیں مجھے یقین ہے کہ اگر اب بھی کوئی بوڑھا یا بوڑھی جلال پور جٹاں میں موجود ہو جس نے اس عجوبہ کو دیکھا ہو یعنی قاضی صاحب کی کرامت دیکھی ہو۔

(x) ہمارے بھوت پریت

حفیظ کے اس متفرق مضمون ''ہمارے بھوت پریت'' کا اسلوب سادہ سلیس اور رواں ہے مثال کے طور پر

> ''یہ نظارہ دیکھ کر میری نگاہیں اپنے موضوع پر اٹھیں وہ مجھے ترش نظروں سے گھور رہا تھا میں نے آنکھیں جھکا لیں اور وہ کتاب جس پر تبصرہ بوڑھا کر رہا تھا اور جس کو محض معمولی ڈلگر کہہ دینے سے اعتراض رَد کر دیئے گئے تھے اس کتاب کا نام تھا سنگم''۔۴۵

اس مضمون میں بھوت پریت ان لوگوں کو کہا گیا ہے جن کا مقصد پاکستان کے مقصود کا مضحکہ اڑانا، اسلام کا منہ چڑانا، ساری دنیا کو اپنے ہی اس ملک کو قائم رکھنے کے لیے کام کرنے والوں پر ہنسانا، مسلمانوں کی اولاد کو اسلام پر تمسخر سکھانا اور وہ لوگ جو پاکستان کو ختم کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ ایک بڑے آرائشی کمرے میں ایک شخص جو کہ بڑا صاحب گھومنے والی کرسی پر اکڑا ہوا بیٹھا ہے اور ایک چھوٹا صاحب یعنی کلرک بھی وہاں موجود ہے اور میز پر آگ کا دریا کتاب کا انبار لگا ہوا ہے۔ یہ کتاب پاکستان کے مسلمانوں کو اسلامیت سے توڑنے اور مغل بادشاہ اکبر اعظم کی الٰہیت سے رشتہ

جوڑنے کے لیے ناول کے رنگ میں حال ہی میں تصنیف ہوئی ہے اور ناچ کی وہی فضا قائم کرنے کی خاطر لکھی اور شائع کی گئی تھی جو شو جی نے سکھایا تھا اور انگریزی دور میں جس سے مسلمانوں کو نچوایا گیا تھا اس کتاب کے خلاف پاکستانی پریس یعنی اخبارات کی دُہائی باہر سے اس کمرے تک گونج رہی تھی۔ بڑے صاحب نے اپنی مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کلرک کو تاکید کی کہ یہ کتاب ہم نے امریکی ویلج ایڈ کے ذریعے ملی ہوئی رقم سے خریدی ہے اس کتاب کو دیہات کی اصل ترقی کے لیے تمام سنٹروں میں بھجوانے کا جلد انتظام کرنا ضروری ہے۔ ایسی کتابوں اور کتابچوں کے ذریعے ہی نہیں بلکہ بہت سے مختلف طریقوں سے تحریک چلی جس سے پاکستان کے ذمہ دار افراد کو آگاہ کر چکے ہیں۔ کہ پاکستان کو ختم کرنے کے لیے ثقافتی نام سے اس تحریک کے چلانے والے بعض لوگ تو اس اسلامی حکومت کے دفاتر ہی کے اندر ہیں اور اپنے اقتدار سے کام لے رہے ہیں۔ مسلمانوں کی کمائی کھا کر سب مسلمانوں کی جڑ کھودنے میں بالا رادہ ممد و معاون ہیں۔ ان کا مقصد پاکستان کے مقصود کا مضحکہ اڑانا اور مسلمانوں کی اولاد کو اسلام پر تمسخر سکھانا ہے۔ مختلف وضع قطع کے اچھے خاصے شریف بد معاش پاکستان پر اپنی ذریت کی بدنگاہی، بدکاری اور فحاشی کی نیت سے تھوبے چلے جا رہے ہیں۔ اسلامی شوکت کے لیے قومی وملی جذبات ان بدمعاشیوں کا ایک دروازہ بند کرتے ہیں تو ان کی جگہ سو سوراخوں سے یہ چوہے پلیگ پھیلاتے ہیں۔

ایک اور جگہ ایک کمرے میں ایک شریف زادہ تین آدمیوں کے درمیان بیٹھا ہے ان کے پاس ایک کتاب کھلی ہے جس کا نام سنگم ہے۔ ان میں سے بوڑھا آدمی جس کے ہاتھ میں ایک مسودہ ہے وہ اس مسودے کو پڑھ کر سنا رہا ہے اور ساتھ ہی جائزہ بھی لے رہا ہے۔ شریف آدمی کہتا ہے کہ آپ نے صحیح جائزہ لیا ہے۔ میں بھی اس کا قائل ہوں۔ میں نے اپنی طرف سے نہیں بلکہ آپ کی طرف سے بھی اس کتاب پر سخت اعتراض کیا ہے اور اس کتاب کو فوراً ضبط کرنے کا مشورہ تحریری طور پر صاحب بہادر کو پہنچا دیا گیا تھا۔ لیکن پاکستان کے وزیر اعظم کے سیکرٹری آغا کی طرف سے جو جواب آیا وہ یہ تھا

Oh the book is vulgerty written thats all. No action required.

ایسے دشمن عناصر لوگوں کے چہروں سے نقاب اتارنا چاہا تا کہ وہ کروڑوں جو ابھی کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ان کے بچے اس کلمہ پر عمل کریں گے وہ ان لوگوں کی اسلام کش تحریک کے مقابل اپنی اولاد کی تعلیمات کا جائزہ لے سکیں۔ حفیظ نے ایسے لوگوں کے خلاف آواز بلند کی تو وہ چلا اٹھے کہ ہم اسکولوں اور کالجوں کو مسجدیں ہرگز نہیں بننے دیں گے۔

(xi) ''سہیلیاں'' حیرت اور عبرت

اس مضمون ''سہیلیاں'' حیرت اور عبرت'' کا سلیس سادہ اور رواں اسلوب ہے۔

''آپ فرمائیں گے کہ اس میں حیرت اور عبرت کا کون سا قصہ ہے آپ میں سے ایسے بہت سے اصحاب زندہ سلامت ہیں خدا سب کو حفظ و امان میں رکھے جو چشم دید اور یہ گوش ہوش یہ گواہی دیں گے کہ ہم نے تو حفیظ کو چھ سات گھنٹے ہزاروں کے مجمع میں بیک وقت مسلسل، سلسلہ توڑے بغیر شاہنامہ اسلام سناتے دیکھا ہے پھر آج اس پر حیرت و عبرت کیوں مسلط ہیں۔''۴۶

حفیظ نے اپنے اس مضمون میں حیرت اور عبرت کو دو معصوم بچیاں اوپر تلے کی بہنیں کہا ہے۔ جہاں حیرت ہوگی وہاں عبرت بھی ہوگی۔ ۱۹۲۷ء میں جب حفیظ ۲۷ برس کا تھا حفیظ نے ابھی تو میں جوان ہوں اور رقاصہ وغیرہ کو دھتا بتا کر شاہنامہ اسلام لکھنا شروع کیا تھا اور ساتھ ہی نیم براعظم ہند کے ہر گوشہ میں مسلمانوں کے لاکھوں ہزاروں سامعین میں سنانا بھی شروع کر دیا تھا تاکہ ہماری ملت از سرِ نو وجود پاک ﷺ اور آنحضرت کے صحابہ کرام کی سیرتوں سے کچھ بصیرت حاصل کر لے۔ نیم براعظم ہند میں پشاور سے حیدرآباد دکن اور مدارس تک، کراچی اور بمبی سے کلکتہ، رنگون، برما، شیلانگ سے کشمیر تک کون سا ایسا قابل ذکر مقام ہے جہاں شاعروں سے الگ رہ کر خالص شاہنامہ اسلام حفیظ ہی سے نہ سنا گیا ہو۔

پاکستان بننے کے بعد پاکستان کے اندر مشاعرے بہت سے ہوئے مشاعروں کے علاوہ معاشرتی اور تعلیمی جلسے بھی ہوتے تھے۔ جن میں حفیظ کو حاضری اور شمولیت کی عزت تو بخشی جاتی تھی لیکن حفیظ کے کھڑے ہوتے ہی ابھی تو میں جوان ہوں اور رقاصہ کا شور مچ جاتا تھا۔ مشاعرے یا کسی دوسری طرز کی تقریبوں، مجلسوں، محفلوں میں کسی طرف سے شاہنامہ اسلام کی فرمائش بھی ہو جاتی تو دوسرے بے شمار نامی گرامی شاعر منہ بسور لیتے تھے اور سامنے سامعین کرام جو خیالی محبوباؤں سے وصل و ہجر اور تصوری چوما چاٹی کے عارضی گناہ بے لذت ہی کے لیے تشریف فرما ہوتے تھے۔ کسمسا کر چپ سادھ لیتے۔ چپ اس لیے کہ جن دو چار آدمیوں نے شاہنامہ اسلام کی فرمائش کی ان میں کوئی تیز کلام ملا اٹھ کر وعظ نہ شروع کر دے اب اگر حفیظ نے سلام بحضور خیر الانام سنا دیا تو یہ شاعر نواز، سخن فہم گھروں کو جاتے ہوئے تخیلی ترچھی نگاہوں کی ہوس انگیز برچھیاں کھا چکنے کی لذت کے ساتھ حفیظ کا یہ آخری صداقت شعار وار بھی شاید سہہ جاتے ہوں۔ یہاں پر بھی حیرت اور عبرت دونوں سہیلیاں ساتھ ساتھ ہیں۔

پاکستان کے ایک اہم ترین شہر کے اندر ملک کے اہم ترین تعلیمی جامعہ (کراچی یونیورسٹی) کے نئے تعمیر شدہ ایوان میں کوئی بڑا نامی گرامی شاعر بھی موجود نہیں تھا۔ صرف، بوڑھا حفیظ، ۹ فروری کی صبح ساڑھے نو بجے شاہنامہ اسلام

سنانے کی دعوت پر لبیک کہتا ہوا تنہا حاضر ہوا تھا اور شاہنامہ اسلام سوا تین گھنٹے تک مسلسل سنایا اس دوران پانچ منٹ دم لینے کے لیے بیٹھ گیا تھا کیونکہ روزے کی وجہ سے گلا خشک ہو گیا تھا۔ یہ بھی حیرت انگیز بات ہے سامعین میں جامعہ کراچی کے نوجوان طلبا و طالبات اور ان کے اساتذہ شامل تھے اور شیخ الجامعہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بھی شرکت کی۔

قومی وطن کے حصول کے بعد یہ پہلا تاریخی دن تھا جو حفیظ کو پنڈی سے کراچی محض شاہنامہ اسلام ہی سنانے کے لیے لایا گیا تھا اور اس نے چند کالے سرخ رُولڑکوں کے اصرار کی پروانہ کرتے ہوئے شاہنامہ اسلام ہی سنانے کے لیے لایا گیا تھا اور اس نے چند کلمے سرخ رُولڑکوں کے اصرار کی پروانہ کرتے ہوئے شاہنامہ اسلام ہی سنایا اور عزت وآبرو کے ساتھ اس یونیورسٹی سے نکل آیا۔ یہ بھی حیرت انگیز بات تھی۔

(xii) پنجابی حفیظ

اس مضمون ''پنجابی حفیظ'' میں حفیظ کے ایک پنجابی شعر اور اس شعر کا شان نزول بتایا گیا ہے۔

> ''وہ ادبی سلفے کی لاٹ سے کم نہیں بلکہ ایسا ہے کہ چرس کا تصور کرنے والوں کے سامنے یہ لاٹ لو ہالاٹ بن کر ہمیشہ وہی عالم قائم رکھے گی جو سرراہے نویس نے ایک شاعر کے پنجابی شعر کے حوالے سے چمکا دی ہے''۔ ۴۷

نوائے وقت کے سرِ راہے نویس نے حفیظ کو اپنے بچپن کے دن یاد دلا دیئے

۱۷ دسمبر ۱۹۷۳ء کے شمارہ نوائے وقت کا سر راہے میں چرس کا تذکرہ ہے جو کہ شعروشاعری کے اولین استاد کا مصرع ''چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی'' کے حوالے سے جو کچھ ان کالموں میں بھر دیا گیا ہے وہ ادبی سلفے کی لاٹ سے کم نہیں ہے بلکہ ایسا ہے کہ چرس کا تصور کرنے والوں کے سامنے یہ لاٹ لو ہالاٹ بن کر ہمیشہ وہی عالم قائم رکھے گی جو سر راہے نویس نے حفیظ شاعر کے پنجابی شعر کے حوالے سے چمکا دی ہے شعر یہ ہے

رَن نہا کے چھپڑ وچوں نکلی
سلفے دی لاٹ ورگی

اس شعر کا شان نزول یہ ہے کہ حفیظ جب طالب علم تھا تو سکول سے بھاگ کر کسی گوشہ میں چھپ کر شاعری کرتا ہے۔ ان دنوں حفیظ پنجابی شاعری بھی کرتا تھا۔ جالندھری پنجابی شاعری ''بولی'' کہلاتی تھی۔ سکول سے راستے میں ایک تالاب تھا جس میں ہندو، مرد اور عورتیں نہاتے تھے اور وہاں بھنگی اور چرس پینے والے جمع رہتے تھے۔ حفیظ کے لیے ہندو

عورتوں کا غسل اور چرس پینے کی شان عجیب وغریب مماثلت کا سامان تھا۔ رَن نہا کے چھپڑ وچوں نکلی، سُلفے دی لاٹ ورگی مطلب خاتو نہا کر پانی کے گڑھے سے ابھری اس طرح جیسے چرس کی آگ کا شعلہ ہو۔ یہ اس دیوی کا پانی میں سے ڈبکی لگا کر فقط ایک ساعت شعلہ ابھرنے کا استعارہ ہے۔ اس بولی کو اس دور کی بیساکھی کے میلے ٹھیلوں میں اپنے ہجولیوں کے ساتھ گایا تھا وہ منظر اور شرارت کا زمانہ سرراہے نویس نے حفیظ کو یاد دلایا۔

(xiii) ہلال عید

اس مضمون ''ہلال عید'' کا اسلوب سادہ سلیس اور رواں ہے۔ مثال کے طور پر

''آہ یہ مکھڑے اب کم دکھائی دیتے ہیں البتہ اس زمانے کا دھندلا سا تصور اپنی پرانی امنگوں اور بھولی بسری ترنگوں کی یاد کو دل کی اندھی کوٹھڑی میں سے جھلکا دیتا ہے اور بس''۔۴۸

حفیظ اس مضمون ہلال عید میں طنز کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ پہلے لوگ عید کا چاند دیکھنے کے لیے گھروں کی چھتوں اور حویلیوں کی ممٹیوں پر چڑھ جایا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہماری نگاہیں افق کی گہرائیوں اور شفق کی پہنائیوں سے عید کا چاند کھینچ لائیں گے مگر آج کل چاند دیکھنے کا فریضہ ہم مسلمانوں نے اپنے اپنے فرقے کے عالموں فاضلوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ ہم مسلمان روزے تو پورے رکھ لیتے ہیں مگر عید کا چاند دیکھنے کی مصیبت میں مبتلا نہیں ہوتے ہم شکر گزار ہیں ان مولوی، مولانا صاحبان کا جن کی آنکھیں سرکاری نگاہ سے ایک چاند کی تین چار عیدیں منوا لیتی ہیں۔

(xiv) کیا غزل کی اہمیت ختم ہوگئی ہے

اس مضمون ''کیا غزل کی اہمیت ختم ہوگئی ہے'' کا اسلوب سادہ، سلیس اور رواں ہے مثال کے طور پر

''زعفران کا رنگ کندن سونے کا رنگ ہے جس کا تعلق سرمایہ داروں سے ہے یہ سونا سرمایہ ہے ہم اس کو چھین لیں گے ہم سونا چھین کر اپنے مزدوروں کے لیے اپنی نگرانی میں وہ سب کچھ بنائیں گے جو ہمیں ترقی کے لیے پسند ہے ہم خوب جانتے ہیں کہ بریانی اور زردہ کیا ہے یہ سرمایہ داروں کی خوراکیں ہیں؟ تمہیں معلوم ہے تو پھر تم زعفران کیوں پیدا کرتے ہو''۔۴۹

کیا غزل کی اہمیت ختم ہو گئی ہے یہ سوال ایک حکومتی ادبی رسالے کی محتسب کمیٹی نے اردو کے چند شاعروں سے ۱۹۵۱ء میں کیا۔ یہ پوچھ کچھ بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ یہ ایسے وقت کیا گیا۔ جب اردو کی دنیا پر باہر سے لایا ہوا رنگ جمالے والے خود اپنا رنگ اڑا ہوا دیکھ رہے تھے پرانے ادب و شعر کو بیک جنبش قلم مٹا دینے کے یہ دعویدار یہ خود ساختہ ''لڑ بھیے جرنیل'' یا تو اپنی تصوری فتوحات کے نشے میں آرام فرما چکے تھے یا اپنی شکست خوردگی کی حالت میں غرق ندامت تھے۔ حفیظ جالندھری تو رنگا رنگ کی عشقی، فطری، جنگی، خوش آہنگی یا بے ڈھنگی نظموں، گیتوں، نغموں اور ترانوں وغیرہ کا شاعر ہے۔ غزل کے سلسلے میں جس فساد کی انکوائری ہو رہی ہے یہ بھی ان فسادیوں میں شریک ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں حفیظ نے کہا کہ

> ''میں تو غزل ہی کا شاعر ہوں۔ مجھے غزل کے سوا اور کچھ آتا ہی نہیں۔ شعر کی روح جسے تغزل کہتے ہیں میرے مذاق سخن کے پیکر میں بسی ہوئی ہے میں نے اس تغزل کو رنگا رنگ کی صورتیں دینے، پوشاکیں پہنانے کے سوا اور کچھ کیا ہی نہیں۔ لہذا یہ مناسب نظر نہیں آتا کہ میں غزل کی اہمیت پر ایک گراں بار مقالہ کے تلے تفتیش کمیٹی کی پیٹی ڈھیلی کرنے کا ملزم بھی بن جاؤں البتہ عینی شاہد ہوں فساد کے اصلی واقعہ کا جو میرے روبرو گذرا تھا اس لیے تحریری بیان پیش کر دیتا ہوں تاکہ تحقیقات میں مدد دے اور سند رہے''۔۵۰

اس بیان میں یہ تھا کہ حفیظ اور ان کے چند ہم عصر ساتھی ادب و شعر کے جانے پہچانے لوگ تھے۔ یہ نئے آنے والوں کے لیے پرانے انجینئر، مستری، محنتی مزدور، اردو شعر و فن کی نئی نئی تعمیریں اٹھانے، سجانے اور پرانی تعمیرات عالیہ کو دستِ حوادث سے بچانے میں لگے ہوئے تھے کہ اچانک دور بازار کی طرف سے جوش و خروش کی آوازیں آنے لگیں یہ آوازیں شوریلی، بھیانک اور ڈراؤنی تھیں۔ اس وقت ہڑتالیں اور سیاسی جلسے جلوس کوئی نئی بات نہیں تھی کچھ عجیب و غریب قسم کے لوگ سروں کے بال الجھائے ادبی راہ گیروں کو مکے دکھاتے اور نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے غزل کو ختم کر دو، غزل کو مار ڈالو، غزل کو دفن کر دو۔ حفیظ اور اس کے ساتھی ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ یا اللہ! یہ کیا تماشا ہے یہ تو نئی طرز کا فساد ہے غزل بیچاری کی کم بختی کیوں آ گئی ہے؟ اتنے میں ان لوگوں نے حفیظ اور اس کے ہمعصر ساتھیوں کو گھیر لیا اور ان کو مکے دکھانے لگے جس پر وہ ہنسنے لگے ان کے ہنسنے کی وجہ سے ان کو اور زیادہ ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ ہنسنے کی وجہ یہ تھی کہ حفیظ اور ان کے ساتھیوں نے ان لوگوں کو پہچان لیا تھا ان میں سے چند کچھ عرصہ بیشتر ادب و شعر کے کاریگر بننے کی خاطر حفیظ اور ان کے چند ہمعصر شعراء کے پاس شاگردی کے ارادے سے آیا کرتے تھے۔ ان میں شعر و شاعری کے نازک کام کی اہلیت کچھ کم تھی اور ان میں شعر و شاعری کے نازک کام کی اہلیت کچھ کم تھی اور کاریگری کے لیے محنت اور مشق

پر بھی آمادہ نہ تھے اس لیے وہ کچھ نہ سیکھ سکے۔ ان لوگوں نے ایک انجمن تحسین باہمی بنا رکھی تھی یہ لوگ خود کہتے تھے کہ یہ انجمن روس سے آئی ہے یہ کسی کالج میں ریڈر یا لیکچرار تھے اور پروفیسر کہلواتے تھے اور حفیظ اور ان کے ساتھیوں کو فرسٹ ایئر فول سمجھ کر گھر کنے کے لہجے میں سبق دینے لگے تھے کہ تمہاری غزل میں سے ہمیں رنگ رنگ کی اخلاقی خوشبوئیں آتی ہیں یہ خوشبوئیں تمہاری شاعری کی پشت پناہ ہیں۔ امیروں کے چونچلے ہیں۔ پرانے زمانے کی شاعری غزل ہے جس کو تم سب سے بہتر سمجھتے ہو یہ غلامی کے دور کی یادگار ہے یہ لفظ تغزل کے کیا معنی ہیں؟ جس کو تم شاعری کی روح کہتے ہو ان میں سے ایک پروفیسر کہنے لگا میرا فرض بنتا ہے کہ تم کو بتاؤں یہ تغزل کوئی لفظ نہیں۔ اصلی لفظ ''تگ جل'' ہے۔ تگ چلنے کو کہتے ہیں اور جل کے معنی جُل دینا، دغا بازی کرنا ہے۔ یہ غزلیں لکھ کر تم دغا بازی کرتے ہو، تمہاری شاعری کیا ہے۔ دھوکا، طلسمی فانوس، ''تگ جُل''۔ تم نے اسے تغزل بنا دیا اور اپنی مذہبی بولی میں ملا لیا ہے۔ تمہاری غزل انسان کو غلام بنانے میں دنیا بھر کی شاعری کی سربراہ بنی ہوئی ہے۔ تم غزل کے شاعر ہو اور اب زمانہ بدل چکا ہے مزدور جاگ اٹھا ہے ہم نے اسے جگا دیا ہے۔ تمہاری غزل فن شعر کی ملکہ ہے۔ ہم کسی ملکہ کے ماتحت مزدوروں کو کام نہیں کرنے دیں گے مزدور ہمارے لیے کام کریں گے ہم نے یونین بنالی ہے۔ غزل جو کچھ بھی ہو، جیسی بھی ہو، جہاں بھی ہو اس کو خاک میں ملا دو۔ دفن کر دو۔ تمہاری غزل کی موجودگی ہمارے نئے فن کو آگے بڑھنے نہیں دیتی ترقی کرنے نہیں دیتی۔ حالانکہ مزدور کا دور ترقی کرنے کے لیے ہے ہم مزدور کا دور لا رہے ہیں۔ ہم مزدوروں کی ترقی کے لیے کام کرتے ہیں ہم ترقی پسند ہیں۔ تمہاری غزل میں محض غم کھانا اور اپنا ہی خون جگر پینا ہے۔ ہم انقلاب چاہتے ہیں ہم عوام کے شاعر ہیں ہم پیٹ بھرنے اور کھانے پینے کی بات کرتے ہیں۔ غزل ہمارے مرض کا علاج نہیں ہے۔ نئی دنیائے انقلاب کی خوش نصیبی اور پرانے اخلاق کی بدنصیبی یہ ہے کہ کالجوں میں کسی نہ کسی طرح ہمارے یہ کامریڈ ریڈر اور لیکچرار بن گئے ہیں اور پروفیسر کہلاتے ہیں پھر ان کے درس و تدریس اور فیض صحبت سے سب جواں ہمت نوجوانوں کو تعلیم ترک کر دینے کی جرأت ملی ہے نوجوانوں نے سروں کے بال بڑھا لیتے ہیں ہم کنگھی نہیں کرتے ہم کانوں کی لوؤں کے نیچے تک بالوں کی لمبی لمبی قلمیں رکھتے ہیں جسے جوئی بنانے والے مزدور کی کھرپی۔ یہی ہے انقلابی شاعروں اور فن کاروں کی وضع قطع ہم صرف وضع قطع پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم درسگاہوں میں نہیں کافی ہاؤسوں میں نئی زندگی کا عرفان حاصل کرتے ہیں۔ ہمارا عرفان بدھ مت کا گیان ہے تمہاری غزلوں کے نام نہاد نفاست نے حکومت کے کارندوں کے دل و دماغ میں حلول نہ کیا ہوتا تو وہ ہمارے ایم اے پاس ساتھیوں کو ڈپٹی کمشنر بننے کا اہل شمار کرتے۔ خیر یہ اچھا ہی ہوا اس طرح ہم سب انقلابی ادیب اور نقاد بن گئے ہیں۔ نئے ادب کے موجود قرار دیئے گئے۔ البتہ تمہاری یہ غزل کی شاعری یہ گیت، یہ نغمہ و نالہ ختم کر دیں گے۔ یہ تمہاری غزلیں جذباتی دوائیں اور شعائیں ہیں۔ ہم تم کو مفید کام کرنا سکھائیں گے تم صرف ہماری طرح اناج کے کھیتوں میں کھاد بنانے کا کام کیا کرو گے یا آٹا پیسو گے چکیوں میں ''کھٹ بڑھی'' بنو گے نئی دنیا کو غزل کے شاعر درکار نہیں ہیں۔ ہم عوام کی بولی میں بات کرتے ہیں

رفتہ رفتہ تم بھی یہ بولی سمجھ جاؤ گے۔ تم ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ گے ترقی پسندوں کے نقادوں سے تحسین پاؤ گے۔ مجنونانہ مسرت کے نعروں میں یہ چند الفاظ گونج رہے تھے غزل ماردی گئی۔ غزل کو دفن کیا جا رہا ہے آؤ ساتھیو سب مل کر غزل کو دفن کریں اور آزادی کے گیت گائیں۔

اس پر حفیظ اور ان کے ہمعصر ساتھیوں نے ایک دوسرے پر حیرت ہی نہیں عبرت کی نگاہیں ڈالیں ڈر کے مارے مسکراتے نہیں بلکہ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ جب یہ نقاد صاحبان یہ نئے شاعر اپنے اردگرد کے ترقی پسندوں کو ساتھ لے کر لیکچر دینے والے پروفیسر حضرات کو ساتھ لے کر غزل ماردی گئی کی پکار پر ہتھوڑے اور درانتی کی جھنڈیاں ہلاتے ہوئے قبرستان کی طرف چل دیئے۔ تو حفیظ اور انکے ساتھیوں نے اطمینان کا سانس لیا اور ٹھنڈی آہیں بھریں۔

حفیظ کہتے ہیں کہ تغزل ہی میرا فن ہے، میں غزل ہی کا تو شاعر ہوں اور جہاں تک غزل کی اہمیت کی بات ہے یا افادیت اور ذوق طلب کی۔ مجھے نہیں معلوم اس کا کیا حشر ہوا ممکن ہے غزل کے ساتھ غزل کی اہمیت بھی مار ڈالی گئی ہو شاید یہ سمجھ کر چھوڑ دی گئی ہو کہ بے چاری نقادی کی ماری خود بخود مر جائے گی۔

حفیظ انکوائری کمیٹی کے بزرگوں سے کہتے ہیں کہ میں دوسروں کے بارے میں رائے نہیں دے سکتا اپنی صورت حال بیان کر دیتا ہوں کہ میں اب اس عمر میں کھٹ بڑھئی شاعر بننے کا حوصلہ نہیں رکھتا چکی راہنا میرے بس کی بات نہیں میں نظم لکھوں یا گیت تغزل کے بغیر نہیں لکھ سکتا۔ جب تحقیقات ختم ہو جائیں اور فیصلہ سنا دیا جائے تو مجھے بھی یاد فرما لیجئے گا۔ شاید میں غزل کی اہمیت پر روشنی ڈال سکوں۔

(xv) ہمارے تمدنی دوزخ اور اہمیت

اس مضمون ''ہمارے تمدنی دوزخ اور بہشت'' کا اسلوب سادہ سلیس اور رواں ہے مثال کے طور پر

> ''سندھ، متوسط ہند، گجرات اور دکن میں برطانویوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا گلا دبانے والے کون تھے۔ کون تھے اپنے اپنے ظروف میں مسلمانوں کا خون بھر بھر خود پیتے اور دوسروں کو پلا کر انعام سے سرخرو ہونے والے؟ کون تھے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو ناکام رکھنے کے لیے گوروں سے ساز باز رکھتے تھے کون تھے وہ عفریت جن کے حوصلے پر چند گورے ہم کروڑوں کو کالے نگر کے نام سے اپنے جوتے صاف کرانے کے لیے دست دراز دکھاتے رہے''۔۵۱

اس مضمون میں تمدن کی دو صورتیں دکھائی گئی ہیں ایک عوام الناس کا تمدن اور دوسرا خواص الناس کا تمدن۔

عوام الناس میں محنتی مزدور، کسان، بڑھئی، معمار، درزی، تیلی، دھوبی، نائی، دکاندار، قصائی، صنعت و حرفت

کرنے والے تاجر، موچی، لوہار، چوہڑے، چمار، حلوائی، نانبائی، پان فروش، پھیری لگا کر سودا سلف بیچنے والے، سر پر رکھ کر ٹوکریاں ڈھونے والے پیشہ ور لوگ عوام الناس میں شامل ہیں اور خواص الناس میں امیر لوگ شامل ہوتے ہیں۔ جن کے پاس باغات، پارک، بنگلے، شاندار کوٹھیاں اور پھول پھل آرائش وزیبائش ہیں۔ یہ ہماری گھٹتی ہوئی دنیا سے الگ دنیا ہے۔

اس دنیا کے رہنے والے شکل وصورت سے تو ہم عوام جیسے انسان ہیں لیکن یہ خود اپنی زبان سے اور ہم سے بھی خواص الناس کہلواتے ہیں۔ یہ عوام الناس میں شامل ہو کر نہیں رہ سکتے اور نہ ہی ان کی زبانوں سے ہم کو انسانوں کی طرح مخاطب کیا جاتا ہے۔ عوام الناس کی گلی کوچ بازار سڑاندھ گالی گلوچ شوروشر سے بھرے رہتے ہیں لیکن خواص الناس جہاں رہتے سہتے ہیں وہاں سکون، اطمینان اونچی آوازوں کی مناہی ہے۔ باغات میں عوام الناس میں سے ہی مالی چند پیسوں کی خاطر کام کرتا ہے اور خواص الناس کے سوپر، چپڑاسی، پہرہ دار وغیرہ بھی عوام الناس میں سے ہیں۔ پہلے پہل یہ ایک ہی برادری تھے ان میں کوئی تفریق نہ تھی۔ رفتہ رفتہ تفریق پیدا کی گئی دوسروں کی کمائی اور دوسروں سے اپنے کام کرانا چند آدمیوں نے شروع کر دیا یہ آغاز بڑھتا اور ترقی کرتا ہوا زمین پر ہی ایک طبقہ بڑا طبقہ دوزخی اور دوسرا جنتی بن گیا۔

دوزخی شہروں کی گلیوں میں کوٹھڑیوں، جھونپڑوں اور مکانوں میں آباد ہیں لیکن کوئی ایسی آبادی یا کوئی ایسی جگہ نہیں جس کے اردگرد گندگی کے ڈھیر نہ ہوں۔ دونوں طبقوں کی الگ الگ تعلیم گاہیں بھی اپنے اپنے بہشت اور اپنے دوزخ کی نمائندگی کرتی ہیں۔

بہشتی طبقے کے اسکول کانونٹ اور اونچے درجوں کے کالج ہیں۔ ان کالجوں اور اسکولوں کی تعمیر عوام الناس ہی نے کی ہے مگر ان کے بچوں کو ایسے بڑے اداروں کی طرف دیکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے کہ دوزخی تمدن والے کا وجود اتنی بلندی کو پستی کا بے ہودہ مظہر دکھائی دیتا ہے۔ اب تک جو چند ہزار ہمارے مہربان سب کروڑوں مسلمان مرد وزن کے سروں پر چڑھے ہوئے ہیں اور اپنی حرکات کو اس کوڑھ کی کھاج بنائے ہوئے ہیں جو کوڑھ انگریز نے ہمارے معاشرے اور تمدن میں انہی ذہنی کوڑھیوں کے ذریعے پھیلایا تھا۔

انگریز نے ہم مسلمانوں میں سے چند مسلمان فروش چن لیتے تھے اور ان کو اس طرح سدھایا جیسے شکار کے لیے کتے سدھائے جاتے ہیں اور یہ کتے شاندار سرکاری کتے کہلواتے ہیں۔ ساری دنیائے اسلام کی ذلت کے لیے انگریز نے ان کو مفت خوری کی لذت سکھائی تھی۔ امیروں کے گھروں میں ہر کسی کا الگ الگ کمرہ ہوتا ہے اور سنگار روم بناؤ تناؤ کے سامانوں کے ساتھ بھرا پڑا۔ الگ الگ باتھ رومز، الگ الگ ڈرائنگ روم، جنرل اور سپیشل، سٹڈی روم بھی الگ ہوتا ہے اور لان بھی خوبصورت ہوتا ہے اور ایک بڑا میدان بھی جس میں ٹینس کھیلنے کا پورا سامان موجود ہوتا ہے۔ یہ خواص الناس کی جنت ہے یعنی بہشت ہے۔

دیباچہ

حفیظ جالندھری ''پیغام سروش''(ایم اسلم) کے دیباچہ میں رسالوں اور ماہناموں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردو ادب میں رسالوں پر گہری نظر نہیں ڈالی جاتی۔ یہ علم وادب کے خزانے یونہی بند الماریوں کی زینت بنے رہتے ہیں۔

ایم اسلم نے ''مخزن'' میں شائع ہونے والے اپنے مضامین اور افسانوں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ حفیظ بتاتے ہیں کہ ایم اسلم کا طرز تحریر سلاست کے لیے خاص طور پر مشہور ہے اور وہ مشکل بات کو آسانی سے بیان کر جاتے ہیں۔اس دیباچہ میں حفیظ جالندھری نے پیغام سروش کے مندرجات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں یورپ کے اہل قلم میں سے بہترین اہل قلم کے افسانے شامل ہیں۔اس کے علاوہ ایم اسلم کے اپنے طبع زاد افسانے اور مقالات بھی ہیں۔ان تمام مجموعات نے مل کر اس کتاب کو بہترین بنادیا ہے۔

حفیظ جالندھری چوں کہ خود صف اول کے شاعر تھے اس لیے ان کی نثری تحریروں میں بھی ایک شاعرانہ رنگ اپنی چمک دمک دکھاتا ہے۔عبدالمجید بھٹی کی کتاب ''نام ونگ'' کا دس گیارہ صفحات پر خوب صورت تعارف ان کی عمدہ اور دلکش تحریر کا نمونہ ہے۔اگر تعارف میں عبدالمجید بھٹی کی زندگی کی مختلف نشیب وفراز کا ذکر کرنے کے بعد ان کا شاعری کی طرف آنا ،بڑے دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔بھٹی صاحب روزگار کے لیے کئی مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔اس سلسلے میں وہ بچوں کے لیے ایک رسالہ نکالنے کا ڈول ڈالتے ہیں تو حفیظ صاحب سے بھی فرمائش کرتے ہیں کہ آپ اس رسالے میں بچوں کے لیے نظمیں لکھا کریں۔حفیظ صاحب معذرت کا اظہار کرتے ہیں۔معذرت کا جو رد عمل سامنے آتا ہے۔وہ یہ ہے کہ عبدالمجید بھٹی صاحب خود نظمیں لکھنا شروع کر دیتے ہیں اس طرح ان کی زندگی میں شاعری کا ایک خوش کن دریچہ کھل جاتا ہے۔اس پس منظر میں حفیظ صاحب لکھتے ہیں۔

''آپ نے دیکھا نہیں تو سنا ہوگا کہ جب زلزلہ آتا ہے تو بعض جگہ سنگلاخ چٹانوں کے جگر سے صاف شفاف پانی کے فوارے پھوٹ نکلتے ہیں۔بے آب وگیاہ زمین شاداب ہونے لگتی ہے۔بعض جگہ پتھر پھٹ جاتے ہیں۔دھواں اٹھتا ہے۔آگ کے شعلے لپکتے ہیں۔لاوے بہہ نکلتے ہیں۔زمین کی روئیدگیاں جل جاتی ہیں۔'' ۵۲

عبدالمجید بھٹی نے بچوں کے رسالے کے لیے نظمیں مانگیں تھیں۔حفیظ کے انکار پر عبدالمجید بھٹی نے خود لکھنا شروع کر دیا۔اس کیفیت کو حفیظ نے یوں بیان کیا ہے۔

''میرے انکار نے اور میرے انکار کے بعد چند دوسرے صاحبان سے معاملہ کرنے میں ناکام رہنے کی وجہ سے مجید کا سینہ شق ہو گیا اور وہ سب کچھ آبشیریں کے فواروں اور آگ اور گندھک کے شعلوں کی طرح پھوٹ نکلا۔ جس کو عرف عام میں شعر شاعری اور گیت نظم وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے۔ جہاں کسی کو بھی پچیس برس تک شعر و شاعری اور نغمے کا نشان نظر نہ آتا تھا۔ وہاں ایک دریا بہتا دکھائی دینے لگا۔'' ۵۳

حفیظ کو اپنی زندگی کے آخری مراحل میں یہ اندیشہ تھا کہ ان کے بعد ان کا کوئی وارث نہیں ہے جو ان کے قلمی ورثے کا محافظ بھی بن سکے۔ صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر ملک میں جہاں جہاں مسلمان حفیظ کے نظم و نثر کے شائق ہیں۔ ان تک حفیظ کی کتب تک پہنچاتے رہنے کا اہتمام کرے۔ ورنہ سب برباد ہو جانے کا ڈر تھا۔ بالآخر حفیظ کا یہ اندیشہ دور ہو گیا اور ان کو قائداعظم کے پرانے رفیق جناب عبدالکریم سومار صاحب مل گئے پھر جناب لطف اللہ خان مل گئے۔ جن کا وجود آرٹ سخنوری اور سخن نوازی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ جناب شمیم احمد مل گئے۔ جو اسلام کا پیغام جاری رکھنے والی کتب کے پبلشر اور کراچی میں سومار صاحب ملے۔ سید مقدس علی جو ہر ادبی و اسلامی ثقافتی تحاریک کا بشوق اہتمام فرماتے ہیں۔ خواجہ حمید الدین کو تو اپنا صیاد قرار دے چکے تھے۔ جناب غلام احمد، جناب سومار کے عزیز اور کاروبار کے سربراہ ہیں۔ جناب رحمٰن کیانی جو شعر و سخن ہی میں اسلام کے لیے تبلیغ اتحاد و جہاد کے معاملے میں حفیظ کے مثنی تھے۔ ان اصحاب نے عبدالکریم سومار کی قیادت میں ایسا ادارہ قائم کیا جو حفیظ کے دکھ کا مداوا تھا۔ اس ادارے کا نام ''ابوالاثر حفیظ جالندھری ٹرسٹ'' رکھا گیا۔ اس ٹرسٹ نے حفیظ کی کتابوں اور تحریروں کو چھپوانے کا ذمہ لے لیا اور آغاز شاہنامہ اسلام سے کیا اور یہ ٹرسٹ حفیظ کی تحریروں کے ذریعے موجودہ اور آئندہ نسل کے ذہن و قلب میں روشنی پہنچائے گا۔ جو میرے کلام کو سرکار دو عالم کی محبت اور بزرگان دین مبین اور قدمائے شعر و ادب سے ملتی ہے۔

حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام کی جلد چہارم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کا احسان ہے کہ یہ جلد چہارم مکمل ہو گئی ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ یہ کتاب انتہائی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے اور لوگ اس سے متاثر بھی ہوں اور اپنے ارد گرد کے لوگوں کو بھی سنائیں۔ دلچسپی پیدا کرنے اور مرد و زن کی توجہ کھینچنے کے لیے حسن و عشق وصال و فراق کی کوئی جھلک ناز و کرشمہ کا کوئی نظارہ اس کتاب میں داخل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ پڑھنے والے یا سننے والے کی توجہ اصل مقصود سے ہٹ کر شعر و شاعری کی ظاہری اور بناوٹی مرصع کاری کی طرف نہ جائے کیوں کہ توجہ کا اس طرح ہٹنا خصوصاً ایسی تصانیف کے لیے موزوں نہیں نظر آیا جو قوموں کی احیاء صادقہ کے لیے لکھی جاتی ہیں۔

عوام الناس کو پست خیال تصور کیا جاتا ہے۔ مرد و زن، بوڑھوں، بچوں، جوانوں نے اس کتاب کو یہ ذوق و شوق حاصل کیا۔ لاکھوں نے اسے پڑھا اور دوسروں کو بھی سنایا اور بہت سے خطوط اس بارے میں حفیظ کو موصول ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ

بہت سے نئے اور بہت سے پرانے شاعروں نے اس طرز سخن کو موثر پایا اور متعدد کتابیں اور بے شمار نظمیں اسی طرز پر لکھی گئی ہیں لیکن ایک طبقہ ایسا ہے جسکو چاہنامہ اسلام سے چڑھ ہے۔ اس طبقے میں مصنف کے بعض ایسے ہمعصر شاعر لوگ ہیں جن کو شاہنامہ اسلام کی کامیابی میں اپنے فن کی ناکامی کا غلط احساس نہ جانے کیوں پیدا ہو گیا ہے۔ ان میں جو زیادہ تلخ نوا ہیں کہتے ہیں کہ

> ''اس قسم کا لٹریچر جو شاہنامہ اسلام پیش کر رہا ہے اور جو صرف مسلمانوں ہی کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی متحدہ قومیت اور خالص پرستش وطن کے تصور کے لیے خطرناک ہے۔ ان سچے وطن پرستوں کا مطالبہ یہ ہے کہ ہر شاعر کا فرض ہے۔ موجودہ دور میں اسلامی روایات کا تمسخر اڑانے اور ہندوستان میں رہنے والی دس کروڑ آبادی کو اپنے ماضی سے بیزار کرنے کے سلسلے میں ان کی تقلید کرے۔ ان کا بیان ہے کہ اس طرح ہندوستان میں انقلاب آجائے گا اور ان کی لوح مزار پر شاعر انقلاب ایسے حروف میں لکھا جائے گا جس کے پڑھنے والے شاعر اور انقلاب دونوں سے بے خبر ہوں گے۔'' ۵۴

اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حفیظ کی شاہنامہ اسلام میں وہ دلچسپیاں نہیں ہیں جو حفیظ کے دوسرے کلام میں نظر آتی ہیں۔ شاہنامہ اسلام کے مجموعے ملک کے سامنے پیش کیے۔ نغمہ زار، سوز وساز، شاہنامہ اسلام پہلی جلد، دوسری جلد، تیسری جلد اور مختلف رسالوں میں نئی غزلیں اور نظمیں بھی۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ حفیظ گزشتہ برسوں کے مشہور شعراء کے کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔

حفیظ کی شاعری کے بارے میں مختلف لوگوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ جس کو حفیظ نے اپنے اس دیباچ میں بھی شامل کیا ہے۔

یو پی کے مشہور نقاد اور شاعر پروفیسر رگھوپتی فراق فرماتے ہیں کہ

> ''جہاں تک شاہنامہ اسلام کا تعلق ہے مجھے اور شاید بہتوں کو حفیظ کی شاعری کے اس خاص رنگ اور خاص انداز سے شاہنامہ اسلام بالکل بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی اسے بے اختیار ہو کر سراہنے پر تلا ہوا ہو تو اسے جھوم جھوم کر پڑھ سکتا ہے اور اگر حفیظ کی دوسری شاعری کے مقابلے میں شاہنامہ اسلام کسی کو پسند نہ آئے تو وہ یہ سمجھ لے کہ ملٹن نے فردوس گمشدہ لکھنے کے بعد کئی ایسی چیزیں لکھیں جن میں شعریت سے زیادہ نثریت ہے ہر ایک فطری شاعر کی زندگی میں کبھی کبھی نثریت کا دور بھی آتا ہے۔'' ۵۵

شاہنامہ اسلام جذبہ ملی سے لکھا گیا ہے۔ اس میں بہت ہی سادہ الفاظ میں شاعرانہ الجھاؤ اور کسی کی رنگ آمیزی کے بغیر واقعات نظم کیے گئے ہیں۔ شاہنامہ اسلام کو ایک قلعہ ہے۔ اور قلعے بہت مدت تک قائم رہنے کے لیے تعمیر کیے جاتے ہیں۔

حفیظ جالندھری نے چراغ سحر کا دیباچہ شاعری کی صورت میں لکھا ہے۔ اردو میں اگرچہ دیباچ نثری صورت میں لکھے جاتے ہیں مگر حفیظ نے اردو شاعری کی صورت میں دیباچہ لکھ کر نئی روایت کا آغاز کیا ہے۔

تعارف نامے

حفیظ صاحب نے اپنے شعری مجموعے ''سوز وساز'' کا تعارف تفصیل سے لکھا ہے۔شاعری کی ابتدا کا ذکر زمانہ طالب علمی کے حوالے سے کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جن دنوں وہ لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں شامل ہوئے۔ان دنوں وہ محض ساتویں کلاس کے طالب علم تھے اور جب وہ بہت سی شاعری تخلیق کر چکے تو لوگ ان سے مجموعہ کلام طلب کرنے لگے۔تب حفیظ صاحب نے اپنی کتاب ''نغمہ زار'' مرتب کی اور باقی کلام انہوں نے اپنے شاگرد فاخر کو دیا کہ وہ مرتب کریں تو انہوں نے بہت سا کلام کانٹ چھانٹ کے بعد ان کو ضائع کر دیا اور کچھ اشعار حفیظ جالندھری کے دوستوں نے اپنے کلام میں شامل کر لیے۔

اس طرح ''سوز وساز'' میں ایک سادہ مرثیے کی صورت میں حفیظ جالندھری نے وہ غم رقم کیا ہے جو ان کو ان کی والدہ کی وفات کے بعد لاحق تھا۔اس غم کو مٹانے کے لیے حفیظ کو ان کے ساتھی رقاصہ کی محفل میں لے جانے لگے۔ان حالات سے متاثر ہو کر انہوں نے نظم ''رقاصہ'' لکھی اور بھرے دربار میں سنانے کے جرم میں حوالات کی سیر بھی کی۔حفیظ صاحب اپنے اس تعارف میں بلبل ہند سروجنی نائیڈو کی اپنے لیے تحسین وآفرین کے کلمات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ 1927ء کے دسمبر کی آخری تاریخوں کا واقعہ ہے مشاعرے میں مصرع طرح کی غزلوں سے ''بور'' ہو کر ان بزرگوں نے مجھ سے میرے اندازِ نو کا کلام سننے کی فرمائش کی۔میں نے ''پریت کا گیت'' ''میرا سلام لے جا'' ''کرشن بنسری'' اور ''راوی میں کشتی'' نظمیں اور ترانے سنائے جن کو سن کر محترمہ سروجنی دیوی اٹھیں۔انگریزی میں تقریر کی، جس کا ماحصل یہ تھا کہ ہندو مسلمان تو بیرونی اقتدار کو ملک سے دور کرتے کرتے اپنے اپنے جماعتی اقتدار کے لیے دست وگریبان ہو گئے ہیں اور آج ان کے لیے کوئی واحد سٹیج نہیں جہاں مل بیٹھیں۔الاشعر وشاعری کا سٹیج جہاں آج ہم سب جمع ہیں۔آج گاندھی جی سے بھی زیادہ سوکھے ہوئے اس پنجابی شاعر نے ہمیں پریت گیت سنا کر جو راہ سمجھائی ہے اے کاش! ہم اسے اختیار کر سکیں۔ہم کو چاہیے کہ سیاسی لوگ جو کام نہیں کر سکے، شاعروں کے ذمے ڈال دیں۔میں اس جوان صدر مشاعرہ کو اس رہنمائی کے لیے مبارکباد دیتی ہوں وغیرہ وغیرہ''۔۵۶

اس تعارف نامے میں حفیظ جالندھری نے اپنے شعر وسخن کے اولین مجموعے کا ذکر کرتے ہوئے اردو شاعری کی اہمیت بھی بتاتے ہیں کہ نغمہ راز کی پہلی کتابت ۱۹۲۴ء میں اور اس کی طباعت واشاعت ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی۔اردو شاعری کو خرید کر

پڑھنے والے بہت کم لوگ ہیں۔تعلیم یافتہ افراد ذوق ادب کے لحاظ سے خلا ہی خلا ہیں۔سب انگریزی کے تابع ہیں اور اپنی اولاد پر اردو کا دھبانہ لگنے کے خواہشمند ہیں۔حفیظ کہتے ہیں:۔

> ''ہمارے وطن کے اس حصے کی جہاں اردو کے لیے کٹ مرنے کے دعوؤں کے ساتھ اسے قومی زبان تسلیم کیا گیا ہے،اردو بولنے اور پڑھنے والے روز بروز گھٹ رہے ہیں اس کے باوجود میرا بھتیجا علاؤالدین مظہر جو میرے خاندان بھر میں میرے کلام میں دلچسپی لینے والا اولین تنہا فرد ہے یقین دلا رہا ہے کہ نغمہ راز کی مانگ موجود ہے اور اصرار کے ساتھ اسے نئی وضع سے چھاپ رہا ہے''۔۵۷

حفیظ نے بڑے دلچسپ انداز میں اپنی شاعری کی ابتداء کا ذکر زمانہ طالب علمی کے حوالے سے کرتے ہوئے بتایا ہے،۱۹۰۷ء میں اپنی عمر کے ساتویں برس ایک محفل مشاعرہ میں پہلی مرتبہ بغیر اذن کے جا پر یہ بات سمجھ میں آئی کہ شاعری عام انسان ہی گھڑتے ہیں۔انہوں نے اپنی پہلی نظم ''منصۂ شہود پر جلوہ'' جب لکھی اور اسے اپنے ہم جماعتوں کو سناتے ہوئے پکڑے گئے اور مولوی فتح دین سے چانٹے کھائے تو یہ ان کی شاعری کی پہلی داد تھی۔

حفیظ پر ۱۹۱۱ء میں عشق کا پہلا اور شعر گوئی کا دوسرا حملہ ہوا۔انہوں نے غزل کی مشق جاری رکھی۔ساتویں کا امتحان دے کر سکول سے بھاگ گئے اور امرتسر،دہلی،میرٹھ بلکہ بمبئی تک گئے۔حفیظ کو جالندھر میں اصلاح کے لیے اپنے سے بہتر کوئی نہ ملا اور وہ جالندھر میں اب کسی کا طالب علم بننے کی بجائے خود طالب علموں کا بھلا کرنے لگے۔

اس تعارف نامے میں حفیظ کے بارے میں اور اس دور کے ادبی ماحول اور شخصیات کے بارے بہت قیمتی معلومات بھی ہیں۔

حفیظ نے ذریعہ معاش کے لیے مختلف کام کیے۔تجارت سوجھی،عطر اور خوشبویات کی دکان کھولی،جو عشق محبت کی دکان ثابت ہوئی۔جسمانی مزدوری بھی کی۔ایک مشاعرے میں اول انعام سونے کا تمغہ اور دوسرا انعام روپے دونوں مل گئے۔تمغہ یافتہ شاعر ہونے کے باوجود شاعر برادری حفیظ کو استاد کہتی تھی۔سسرال لاہور میں ہونے کی وجہ سے آنا جانا لگا رہتا تھا۔پھول اور تہذیب نسواں سے بھی منسلک رہے۔لاہور میں علامہ اقبال سے بھی ملاقات ہوئی۔

جالندھر سے ایک ادبی رسالہ اعجاز جاری کیا۔جو تین ماہ بعد بند ہو گیا،مگر اس کے طفیل حفیظ کی ملاقات بڑے بڑے ادیبوں سے ہوئی۔حفیظ کا شاگرد فاخران کو ایک مشاعرے میں لے گیا۔جہاں انہوں نے ایک غزل تحت اللفظ سنائی۔ جس سے وہ محفل پر چھا گئے اور ان کو بہت داد ملی۔ان کو مولانا گرامی کی تلقین یاد آئی ''تقلید نہ کر اپنی ذات کو باہر نکال''۔

شباب اردو، ہزار داستان، نونہال، تہذیب نسواں اور پھول کے علاوہ بہت سے دوسرے اداروں میں قلم کی چکی پیسی۔ارباب علم کے مشاعروں اور لاہور کے سخن سنج فہم حلقوں میں شامل ہونے لگے اور لاہور میں جم کر اپنے آپ کو شاعر منوالیا اور اپنے شعروسخن کے پہلے مجموعے نغمہ زار کو مکمل کیا۔

اس تعارف نامے میں حفیظ جالندھری نے اپنے مجموعہ کلام ''تلخابہ شیریں'' کے متعلق تفصیل سے بات کی ہے۔ اس میں انہوں نے شاعری کے ساتھ گہری وابستگی کا بھی ذکر کیا ہے۔تلخابہ کو انہوں نے شیریں بھی کیا ہے۔اس میں ان کی غزلیں اور بہت سی طویل نظمیں شامل ہیں۔جو انہوں نے نغمہ زار اور سوز وساز کی اشاعتوں کے بعد لکھیں اور یہ مختلف رسائل میں شائع ہوئیں۔

حفیظ لکھتے ہیں کہ وہ مولانا گرامی کے پاس گئے اور گرامی نے فرمایا کہ ''تقلید نہ کر اپنی ذات کو باہر نکال''۔ شاگردی، رنگ پیروی اور تقلید ان کے لیے رہنے دے جن کے پاس اپنی ذات نہیں تو اپنی ہی روح کو اپنے قالب سے باہر نکال۔تلخابہ شیریں کیفیات میں ''نغمہ زار'' اور ''سوز وساز'' دونوں سے الگ ہے۔اس میں انفرادی اور نظری انانیت کا نشہ ہے۔ایک نرالی دھن، منصوبہ اور وہ منزل درپیش ہے اس میں وہ بیج اُگے اور بارآور ہوئے جو ابتدائی ماحول نے بوئے۔

حفیظ اس تعارف نامے میں اس زمانے کے سیاسی ماحول ،فکری بیداری، انفرادی اور اجتماعی شعور کی بات کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ۱۹۳۳ء کے بعد ہندوستان اور اس میں بسنے والے ہم تم اور سب بڑے چھوٹے اب وہ نہیں جو پہلے تھے۔ ملکی سیاسیات اور معاشیات کے عام اور معمولی مدوجزر کا دور گزر چکا۔تلاطم وطوفان کا زمانہ ہے۔فرد کی انفرادیت ختم نہیں ہوئی لیکن اجتماعیت کا زندہ و بیدار اور خوش گوار شعور پیدا و پنہاں ہم آغوش کے لیے چاروں طرف بازو پھیلا رہا ہے۔ جماعتی احساس کی آگ بھڑکی اور بھڑک رہی ہے۔نئی آرزوئیں جو پوری ہو کر رہیں گی۔ نئے جماعتی احساس بیداری کا شعور کہیں رفتہ رفتہ ،کہیں بہ سرعت حسب حالات دونوں کی پہنائیوں تک پہنچ رہا ہے، یہ نئی زندگی کہیں برسر کار ہے کہیں برسر پیکار۔رہنماؤں کی اپنی اپنی منزلیں ہیں۔ رہنما حیران ہیں کہ زندگی کی منزل اور آگے اور آگے کیوں ہے یہ بزرگ بے بال و پری کی ایسی اڑان دیکھنے متوقع نہ تھے۔اب یہ بال و پری ان کو روکے نہیں رکتی ان کو معلوم نہ تھا کہ احساس حیات تازہ، خود ہی بال و پر ہے یہ احساس، یہ یقین اب جذباتی اور خیالی نہیں حقیقی اور واقعاتی ہے۔انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔''تلخابہ شیریں'' اس زندگی تازہ سے خالی نہیں، چھوٹی چھوٹی غزلیں بھی، لمبی لمبی نظمیں بھی ۔ ہلکے پھلکے گیت بھی، شاید سب میں اپنے وقتوں کے میوؤں کا رس ہے میرے تجربوں کی ہلکی تلخی لیے شیریں ہے۔۵۸

مختصر یہ کہ اس تعارف میں حفیظ نے اپنی اور اس زمانے کی سوچ وفکر پر بھرپور انداز میں روشنی ڈالی ہے۔خاص طور پر حفیظ کے فکری وشعری اور شخصی ارتقاء پر قیمتی مواد میسر آتا ہے۔

خطوط

ماہنامہ نقوش شمارہ ۱۰۹ خطوط نمبر کے نام سے شائع کیا جس میں مختلف ادبی شخصیات کے خطوط شائع کیے گئے ہیں۔ اسی شمارے میں حفیظ جالندھری کے عزیز ملک کے نام ۳۲ خطوط شائع کیے گئے ہیں۔ یہ خطوط ذاتی خطوط میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان خطوط میں حفیظ اور عزیز ملک کی ذاتی زندگی کے گوشے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ یہ خطوط ۱۹۴۰ء سے ۱۹۶۲ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ یہ خطوط عزیز ملک نے محمد طفیل مدیر نقوش کے کہنے پر ان کو مہیا کیے تھے۔ پہلا خط حفیظ نے ۱۱ دسمبر ۱۹۵۱ء کو عزیز ملک کے نام لکھا تھا۔ اور آخری خط انہوں نے ۱۹۶۲ء میں لکھا تھا۔

حفیظ اپنے خط میں عزیز ملک کے احساسات کو جانتے ہوئے ایک دوست کے حوالے سے کہتے ہیں کہ جس طرح بیٹے، بیٹیاں اور بھائی بہنیں ایک دوسرے کی نیت کو نہیں جان سکتے تو ہم ایک دوسرے پر کیسے ایمان لا سکتے ہیں۔ اس کی مثال دو جسموں اور دو روحوں سے دیتے ہیں کہ ان میں قرب تو ہو سکتا ہے مگر وہ ایک نہیں ہو سکتے ہیں۔ ضمیر سے بھی عزیز کی خیریت حفیظ کو مل جاتی تھی۔ حفیظ نے ۱۳ نومبر ۱۹۵۱ء کو ایک خط عزیز کے نام لکھا جس میں عزیز کو نصیحت کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حوصلہ اور صبر کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ وہ قوم وملت کی بقا چاہتے ہیں کہ میں اپنی قوم وملت کے معاملے میں پوری وفا کے ساتھ کام کروں گا۔ فوج کو مضبوط کرنا اور رکھنا قوم وملت کے مصائب کے سامنے کوئی بڑا کام نہیں ہے۔

ایک خط میں انہوں نے عزیز ملک کو اپنے ساتھ مری چلنے کی دعوت دی ہے اور مری جانے کا ارادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایسی بات ہے جس کو میں کسی دوسرے سے کہہ نہیں سکتا۔ اس لیے اب عزیز صاحب کو ان کے ساتھ مری جانا پڑے گا اور اس سلسلے میں ان کا کوئی بہانہ نہیں سنیں گے۔

بہت سے خطوط میں انہوں نے اپنی بیٹی کی بیماری کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی بیٹی سعیدہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔ سعیدہ مرگی کے مرض میں مبتلا ہے اور ہسٹریا کے دوروں کے سبب نہایت تکلیف میں زندگی گزار رہی ہے ۲ جون ۱۹۵۳ء کو تحریر کردہ ایک خط میں بھی انہوں نے اپنی بیٹی کی بیماری کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ دوروں سے تو بچ نکلی ہے لیکن بہت برے حال میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کی زندگی ختم نہیں ہو رہی یعنی کہ زندگی کا عذاب ختم نہیں ہو رہا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان کی بیٹی کی بیماری کا قصہ اتنا طویل ہے کہ اس پر ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب تحریر کی جا سکتی ہے۔

کچھ خطوط میں انہوں نے اپنی نوکری کے متعلق بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ میرا معاملہ محکمہ سے الجھ گیا ہے۔ کیونکہ وہ انہیں ۳ سال سے پہلے قانوناً جواب نہیں دے سکتے تھے اس لیے اب لڑائی کا آغاز ہو گیا اور آخر میں انہوں نے ایک شعر سے خط کا اختتام کیا ہے۔

اُدھر دنیا ہے اور دنیا کے بندے
اِدھر میرا خدا اور میں ہوں

حفیظ نے جو خط عزیز ملک کے نام لکھے وہ انتہائی اہم نوعیت کے خط ہیں۔ جس میں انہوں نے اپنے ذاتی حالات کھل کے بیان کیے ہیں۔ ایک خط میں انہوں نے دیر سے جواب دینے کی معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ پچھلے دو مہینے سے مکان کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے اب آ کر انہوں نے کراچی کے مضافات میں ایک گھر چار سو روپے ماہوار پر لیا ہے۔ یہ مکان بھی انہوں نے خود نہیں لیا بلکہ ایک فلم پروڈکشن کمپنی نے چند ماہ رہنے کے لیے ان کو دیا ہے اور حفیظ صاحب عزیز صاحب کو لکھتے ہیں کہ اسلام میں تو شاعر کی گنجائش نہیں لیکن اس کے باوجود عزیز صاحب انہیں شاعر کی حیثیت سے قبول کر چکے ہیں تو اب وہ انہیں ایک فلم بنانے والے کی حیثیت سے بھی تسلیم کر لیں کیونکہ یہ فلم عامیانہ سوقیانہ ہونے کی بجائے کسی مقصد پر بنائی جائے گی اور حفیظ اس فلم کو اس لیے بنا رہے ہیں کیونکہ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ حکومت نے ان کو مئی کی تنخواہ وقت پر نہیں دی جس کی وجہ سے وہ مالی مشکلات کا شکار ہو گئے اپنی مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

''زندہ باد حفیظ جالندھری شاعرِ اسلام فردوسی انام''

آخر میں وہ بتاتے ہیں کہ اتنے برے حالات میں کہ ان کی زندگی کا یہ مشکل دور صرف خدا ہی دیکھ سکتا ہے۔

ایک انتہائی مختصر ترین خط ہے جو کہ تین لائنوں پر مشتمل ہے۔ اس خط میں انہوں نے بچی کی کالی کھانسی کا ذکر کیا ہے اور ان کو کہا ہے کہ ان کی بھیجی ہوئی دوا سے اس کو کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا اور کہا کہ ان کی زندگی آج کل بہت تنگ گزر رہی ہے۔

ایک خط میں انہوں نے بچی کی کالی کھانسی کا ذکر کرتے ہوئے عزیز ملک سے دوائی بھیجنے کی تلقین کی ہے۔ دوسرے حصے میں گھر کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی بیوی ان کو چھوڑ کر چلی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر وقت دوستوں کے ساتھ مصروف رہتے ہیں اور اس کی بیوی اس سلسلے میں ان کو حد مقرر کرنے کا کہتی ہے۔ بچی بہت بیمار ہے اس کا سانس بند ہو جاتا ہے، پانچ سال کی عمر میں وہ بچی شدید تکلیف برداشت کر رہی ہے۔

انہوں نے اپنی بچی کی بیماری کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ پتہ نہیں چل رہا کہ کالی کھانسی ہے یا دمہ۔ بچی ساری رات کھانستی رہتی ہے، پھیپھڑوں میں تشنج اور آنکھیں ابل پڑتی ہیں۔ بچی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی ہے اور اکثر اوقات بے ہوش ہو جاتی ہے اور دوسرے حصے میں اپنے کھانے پینے کا احوال لکھا ہے چونکہ ان کی بیوی گھر میں نہیں ہے۔ اس لیے وہ خود ہی کھانے بنا کر کھا رہے ہیں، کھانے چونکہ باسی ہو چکے ہیں اس لیے ان کے پیٹ میں تبخیر اٹھ رہا ہے اور وہ اسی عالم میں عزیز صاحب کو خط لکھ رہے ہیں۔ اس خط میں انہوں نے حکیم صاحب کی بیماری کے متعلق دریافت کیا ہے اور ان کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ حفیظ کے لیے ایسا وجود دنیا میں پھر آنا ممکن نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کراچی جانے سے پہلے وہ ایک بار حکیم

صاحب کو ملنے ضرور آئیں گے لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ کس تاریخ کو آئیں گے کیونکہ ان کی اپنی بیوی کی صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ حفیظ صاحب کہیں اور آ جا سکیں۔ اور وہ عزیز صاحب کو لاہور آنے سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں آنے کی تکلیف نہ کریں بلکہ وہ خود ہی حالات سدھرنے کی صورت میں اسے جا ملیں گے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی بہتری ہوگی اس وقت ان کے گھر میں ہر دوسرا فرد بیمار پڑا ہے۔ اور ان کے نزدیک ان کے چاروں طرف علالت ہی علالت موجود ہے ان کی بیوی کینسر کے مرض میں مبتلا ہے۔ ان کے خیال میں ان کی بیوی جس درد و کرب سے گذر رہی ہے اس سے اگر ان کو گزرنا پڑے تو وہ کبھی اس کو برداشت نہ کر پائیں۔ ان کی بیٹیاں بھی اپنی ماں کی تیمارداری میں لگی ہوئی ہیں لیکن ان کے خیال میں ان کی بیوی اس دنیا میں چند روزہ مہمان ہے۔ وہ اپنے معاشی اور گھریلو معاملات پر الجھ کر رہ گئے ہیں۔

۷ مارچ ۱۹۵۴ء کو حفیظ نے عزیز کے نام لکھا کہ سہ پہر ۳ بجے ان کی رفیق حیات کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ عزیز صاحب کو اس خط میں بتا رہے ہیں کہ سید ضمیر جعفری وصیت یاب خان، اشک صاحب اور بریگیڈیئر حبیب الرحمٰن صاحب کو اطلاع دے دیں کیونکہ میں اب ہر کسی کو الگ الگ خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی بیوی ابدی نیند سو گئی ہے لیکن انہیں جاگنا ہے محض اس لیے کہ ان کے کاندھوں پر ان کی چھ بیٹیوں کا بار ہے۔ اب اللہ کے بعد ان کی ذمہ داری حفیظ پر پڑتی ہے۔

۱۲ مارچ ۱۹۵۴ء کو حفیظ نے حکیم صاحب کے نام تحریر کیا۔ اس خط کے آخر میں ایک نوٹ لکھا ہے کہ یہ خط تعزیت کے جواب میں مولانا نے تحریر کیا ہے۔ اس میں وہ حکیم صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہیں ان کا غم بٹانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور اپنی بیوی کی وفات کی خبر سب سے پہلے عزیز کو اس لیے دی کیونکہ وہ انہیں بے لوث اور مخلص تصور کرتے ہیں۔ یہاں عزیز اور حفیظ کے مخلص تعلقات اور دوستانہ رویہ کھل کر سامنے آ گئے، خط کے دوسرے حصے میں انہوں نے حکیم صاحب کو ایک بات بتائی ہے کہ ان کی حکومت کی جانب سے پنشن مقرر کر دی گئی ہے جس پر وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں۔

۲۰ جولائی ۱۹۵۴ء کے خط میں حفیظ نے عزیز صاحب کو اپنی زندگی کا سب سے لازمی جزو قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اب میں زندگی کے ان مقامات پر ہوں جہاں انسان اپنے رہے سہے سانس پورے کرتے ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ اس دور میں عزیز ان کے ہاتھ پاؤں بن جائیں جس سے وہ اگلی زندگی پرسکون بنا سکیں۔ انہوں نے عزیز صاحب کو کہا ہے کہ جب بھی کوئی نئی چیز تحریر کریں تو ان کو بھیج دیں وہ ضرور اس پر اپنا کوئی نہ کوئی خیال عرض کریں گے۔ اس خط میں انہوں نے اپنے قومی ترانے کا ذکر بھی کیا ہے کہ آخر کار ان کا ترانہ مرکزی وزارت کے مرحلے سے گزر گیا ہے۔

ایک خط میں انہوں نے اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پچھلے دو ماہ سے چارپائی پر ہیں اور اس حال میں کہ کوئی ان کو دیکھ کر پہچان نہیں سکتا اور وہ چل پھر بھی نہیں سکتے اور ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ خود کو تنہا نہ سمجھیں اللہ تعالیٰ ہر حال میں ان کے ساتھ ہیں۔ اس خط میں انہوں نے انسانیت کی معراج حضور ﷺ کی ذات تک پہنچنا قرار دیا ہے۔ اس سے آگے کوئی مقام نہیں، لیکن وہاں تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ خط کے آخر میں انہوں نے دو تازہ شعروں سے اختتام کیا ہے۔

عرض ہنر بھی وجہ شکایت ہو گئی
چھوٹا سا منہ تھا مجھ سے بڑی بات ہوگئی
دیکھا جو کھا کے تیر کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

ایک خط میں انہوں نے اپنے آئندہ کام اور سٹاف کی ضرورت وغیرہ پر عزیز صاحب کو مشکلات سے آگاہ کیا ہے یہاں ان کو کہتے ہیں کہ وہ ان کو رسالہ کے ایڈیٹر کے طور پر لے سکتے ہیں لیکن وہ اب ایسا نہیں کریں گے کیونکہ وہ انہیں کہتے ہیں کہ سکول سے حساب دانوں کی طرح حساب لگا کر ان کو حالات سے آگاہ کریں تا کہ وہ اس رسالے کا کام آگے بڑھا سکیں۔

۷ جولائی ۱۹۵۵ء کے خط میں حفیظ نے عزیز صاحب کو اطلاع دی ہے کہ ڈاکٹر اعظم کریوی کے ایک دوست انتہائی بے رحمی سے قتل کر دیئے گئے ہیں۔ وہ حفیظ صاحب کے مددگار تھے، اس خط میں انہوں نے حسرت موہانی کی وفات کی خبر بھی دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب حسرت کو اور ان کی شاعری کو خراج تحسین پیش کیا جا رہا ہے اگر یہ خراج تحسین ان کی زندگی میں ان کو پیش ہوتا تو ان کی حوصلہ افزائی ہو جاتی۔ اور کہا کہ عزیز صاحب کراچی سیر کے لیے گئے اور انہیں نہیں بتایا اگر وہ اپنے اس ارادے کے بارے میں بتا دیتے۔ تو ان کی آپس کی ملاقات ہو جاتی کراچی سے لاہور ہو کر راولپنڈی چلے گئے اب اگر وہاں ہی ہیں تو انہیں ایک خط میں اطلاع دے دیں کہ وہ راولپنڈی میں ہی ہیں یا نہیں تا کہ ان کی ملاقات ہو سکے۔

۳۰ اگست ۱۹۵۷ء کے خط میں انہوں نے عزیز سے ان کے والد حکیم عبدالرحمٰن کی وفات پر تعزیت کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ عزیز کی وجہ سے ان سے بے پناہ محبت تھی لیکن سر عبدالقادر، سید راس مسعود، گرامی مرحوم کے بعد یہ وہ شخصیت تھی جو حفیظ کو حفیظ کی طرح سمجھتی تھی اور وہ خود بھی حکیم صاحب کو اپنے والد کی طرح تصور کرتے تھے۔ وہ عزیز صاحب کو تسلی دینا بے معنی سمجھتے ہیں ان کے خیال میں جو ہونا تھا ہو گیا ہے اور وہ بڑے بھائی کی حیثیت سے یہی کہیں گے کہ لوگ تعزیت کرنے کے لیے آئیں۔

۲۳ ستمبر ۱۹۵۷ء کو حفیظ نے خط میں عزیز کی کتاب ''خون حسین'' کے بارے میں تبصرہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے اس کتاب پر نوائے وقت میں بھی تبصرہ پڑھ چکا ہوں۔ جس میں کتاب کو سراہا گیا ہے۔ حفیظ صاحب کے نزدیک یہ ان کا شعبہ نہیں کہ وہ کسی کتاب پر تبصرہ یا اس کی تحقیق پر کوئی رائے دے سکیں لیکن ان کے نزدیک اس کتاب کا اسلوب بہت بہترین ہے۔ البتہ حفیظ صاحب کو اس کتاب میں چند باتیں ایسی لگیں جن پر سوال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آئندہ کتاب کا مطالعہ ان سوالات کو بھی دور کر دے گا۔

بعض خطوط میں حفیظ عزیز کو بڑے بھائی کی طرح نصیحت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ عزیز کے

والدان سے بہت پیار کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کو کہیں نہیں جانے دیتے کیونکہ وہ ان سے بہت پیار کرتے ہیں لیکن عزیز کو یہ بات پسند نہ تھی۔ یہاں پر انہوں نے گدھوں اور کتوں سے مثال دی ہے کہ جس طرح گدھے اور کتے الگ الگ خصلتیں رکھتے ہیں اسی طرح انسانوں میں بھی گدھا پن اور کتا پن ہوتا ہے اور جب وہ دور ہوتا ہے تو انسان تنہا رہ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

> ''یہ تنہائی ہے جس کا تم شکار ہو اور شکار رہے ہو۔ یہی ہے سمجھ لینے کی بات گدھے، کتے اور اس طرز کے جانور تنہا نہیں ہوتے انسانوں میں بھی گدھے، کتے بیشار ہیں۔ یہ سب ''گدھے کھرکی'' اور ''کتا بھونکی'' کو رفاقت جانتے ہیں۔ کلیلیں بھی کرتے ہیں۔ دولتیاں بھی جھاڑتے ہیں۔ لیکن آدمی۔آدمی تو تنہا ہی رہنے کے لیے مجبور ہے۔ آدمی حصول رفاقت کے لیے مارا مارا پھرتا ہے اور کسی کو نہیں پاتا۔ آدمی کا کوئی رفیق نہیں۔ جیسے جیسے گدھا پن اور کتا پن دور ہوتا جاتا ہے۔ آدمی کی تنہائی بڑھتی جاتی ہے''۔۵۹

خط کے دوسرے حصے میں اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہیں کہتے ہیں کہ اب میرا جسمانی طور پر ختم ہو جانا یقینی ہے آج کل وہ ان احساسات میں مبتلا ہیں۔ جو موت کے وقت ہی طاری ہوتے ہیں کوئی بھی حرکت اپنے ارادے سے نہیں کرسکتا بالکل جیسے ایک ذبح شدہ جانور اپنی مرضی سے کوئی حرکت نہیں کرسکتا۔ حفیظ خود کو ایسے ہی جانور سے تشبیہ دیتے ہیں۔

۱۶ مارچ ۱۹۶۱ء کے خط میں حفیظ نے آغاز بسم اللہ سے کیا۔ یہاں حفیظ کے خط میں غالب کے انداز تحریر کا واضح عکس ملتا ہے جہاں وہ مکتوب الیہ کو ایسے مخاطب کرتے ہیں جیسے وہ سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ اس خط میں وہ کہتے ہیں کہ تم سب نے روزے رکھے ہیں اور تم لوگ مولویوں کے بیٹے ہو اس لیے سب کو عید مبارک ہونی چاہیے اور حفیظ خود بیماری کی وجہ سے ۱۵ روزے نہ رکھ سکے اور یہاں وہ مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں کہ ۱۵ روزے رکھنے کی وجہ سے آدھی میدان کی بھی ہوسکتی ہے۔ اس لیے عید کے دوسرے روز پنڈی پہنچ کر ان سے ملاقات کریں گے اور عزیز صاحب کی کتاب کی کاپی بھی ساتھ رکھیں گے۔

ایک خط میں انہوں نے عزیز ملک کو لکھا کہ عزیز صاحب کا ۲۷ ستمبر ۱۹۶۱ء کو لکھا ہوا خط ان کو پہلے موصول ہو گیا تھا اور ۲۶ ستمبر ۱۹۶۱ء کا پوسٹ کارڈ بعد میں ملا تھا لیکن وہ ان ساری چیزوں کا جواب جلدی نہیں لکھ سکے۔ اس کی وجہ یوں بتاتے ہیں کہ مولوی عبدالحق کی وفات کے بعد کچھ نوجوان طالب علم ان کے پاس آئے اور انہیں کہا کہ وہ انجمن ترقی اردو کا یہ عہدہ سنبھال لیں لیکن حفیظ نے ان طالب علموں کو جواب دیا کہ میں اس سازش کے گڑھ میں قدم رکھنا پسند نہیں کرتا اور انہوں نے اپنی ذاتی زندگی میں بہت دفعہ پنجابی ہونے کا طعنہ سنا مگر تندہی اور اردو کی خدمت کرتے رہے۔ مولوی عبدالحق نے بے شک

اردو کے لیے بہت محنت کی ہے اور اردو یونیورسٹی بھی بنانا چاہتے تھے۔لیکن جن لوگوں کو انہوں نے اپنا رفیق بنایا وہ اردو کی محبت کے بجائے دنیاوی لالچ میں مبتلا تھے۔انہوں نے اپنی ذاتی خواہشات کے لیے انجمن کو ذریعہ بنایا اور مولوی عبدالحق کے اتنے مخالف ہو گئے کہ حفیظ نے خود ان کو آٹھ آٹھ آنسو روتے ہوئے دیکھا ہے۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے مولوی عبدالحق کو ان لوگوں کے چنگل سے آزاد کرایا اور جب مولوی عبدالحق کی وفات ہو گئی تو اب ان تعریفوں کو سراہا جا رہا ہے۔انجمن ترقی اردو کی جڑیں لوگ کاٹ رہے ہیں۔مولوی عبدالحق نے پاکستان کے طلبہ کو مدد کے لیے پکارا طلبہ نے لبیک کہا اور مجلس طلبہ مرکزی بابائے اردو قائم کی گئی اور اس طرح کی مجالس پوری ملک میں قائم کی گئیں۔اب مولوی عبدالحق کی وفات کے بعد جو ہر کے مولوی عبدالحق کو ملنے آتے تھے ان کا مقصد یہ تھا کہ کراچی میں کچھ طلبہ نے جبل پور کے مسلمانوں کے قتل عام کے لیے غم و غصے میں مظاہرے کیے تھے اس کا مجلس طلبہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔لیکن سب طلبہ اس ہنگامے کی لپیٹ میں آ گئے اب وہ طلبہ یہ چاہتے ہیں کہ حفیظ ان کی رہنمائی کریں مگر حفیظ نے ان کو کہا کہ وہ بہت بیمار اور تنہا ہیں میں یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا لیکن ان کے خیال میں فیلڈ مارشل ایوب خان اس ملک کی بہتر سرپرستی کر سکتے ہیں اس لیے اگر طلبہ یہ شرط مانتے ہیں کہ صدر مملکت ایوب خان نے جو راہ تجویز کی ہے اس پر چلیں گے تو وہ سرپرستی کرنے کے لیے تیار ہیں۔اس طرح انہوں نے حفیظ کے گھر میں بیٹھ کر میٹنگ کی اور دوسرے حفیظ کو اپنا سرپرست اعلیٰ بنانے کا اعلان اخبار کے ذریعے کر دیا۔حفیظ اس سلسلے میں دو مقاصد بتاتے ہیں کہ مسلمان طلبہ اچھی تعلیم حاصل کریں اور اردو کی ترویج و ترقی کے لیے کام کریں اور میں ان کا ساتھ نبھاؤں گا۔

ایک خط میں انہوں نے خدا سے لو لگانے اور اپنی بیٹی کی بیماری کا تذکرہ کیا ہے اور عزیز ملک کو کہا ہے کہ ان کی کتاب کا ریویو لکھنے کے لیے عقل اور اسلوب کی ضرورت ہے اور وہ معاشی حالات میں الجھے ہوئے ہیں اس لیے انہوں نے خاکی صاحب کو خط لکھ دیا کہ وہ اس کتاب کا ریویو لکھ دیں۔

۳ مارچ ۱۹۶۲ء کو حفیظ نے عزیز کو جو خط لکھا اس خط میں عید کی مبارکباد دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ بیوی بچوں اور تم سب کو عید مبارک ہو اس خط میں وہ حمید نظامی کی وفات پر اپنی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی وفات کا غم مجھے مفلوج کر گیا ہے لیکن میں اللہ کی رضا کو تسلیم کرتا ہوں۔

۲۳ مئی ۱۹۶۲ء کو حفیظ نے عزیز کے نام تحریر کیا۔اس خط میں انہوں نے عزیز صاحب سے پوچھا کہ ان کو ماہنامہ افکار کے مدیر صہبا لکھنوی کا خط مل گیا ہے اب وہ جو پوچھیں گے اس کا وہی جواب دیں گے۔عزیز صاحب حفیظ کے آنے کی توقع نہ رکھیں کیونکہ شاید زندگی حفیظ کو اتنی مہلت نہ دے کہ وہ عزیز سے ملاقات کے لیے جا سکیں۔

۷ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ایک خط میں انہوں نے ایک تصویر کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے عزیز صاحب کو ارسال کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ ایک یادگار فوٹو ہے۔اس کے پیچھے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی یادگار ہے لیکن صرف حفیظ کے لیے کیونکہ وہ تسنیم کی تحریر

ہے۔اس لیے اس کا میرے پاس رہنا بہتر ہے۔وہ عزیز کو کہتے ہیں کہ وہ اس فوٹو کا بلاک بنوا کر یہ فوٹو حفیظ صاحب کو واپس کر دیں۔اور کہتے ہیں کہ عزیز ملک تم بھی میری طرح بیماری کا شکار ہو گئے ہو۔اسے بخار کی حالت میں دیکھ کر حفیظ کو ذرا حیرانگی نہیں ہوئی کہ عزیز صاحب چڑ چڑے ہو رہے ہیں کیونکہ حفیظ خود بھی انہی کیفیات سے گزر چکے ہیں۔عزیز تم نے مجھے اپنے خط میں وہ حالات لکھ دیئے ہیں جو شاید تم کسی کو بتانا پسند نہیں کرو گے تم پڑھے لکھے لوگوں کی پڑھی لکھی اولاد ہو لیکن اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے مسلسل عذاب میں ہو۔وہ کہہ رہے ہیں کہ خطوط میں مجھے مضمون نویسی سے نفرت ہے اس لیے جب تک عزیز صاحب کے قریب نہ ہوں ان کو کوئی سہارا نہیں دے سکتے۔ترجمہ القرآن کے سلسلے میں جب لاہور پہنچوں گا تو عزیز سے ملاقات کرنے کی کوشش کروں گا۔تمہاری کتاب ''میں نے کہا'' ایک ہفتہ کے اندر اندر میرا خیال ہے نکل آئے گی۔دوسرے مجموعہ کا نام ''بے نقاب چہرے'' نہ جانے کیوں علاؤ الدین کو پسند نہیں۔اس نے ایک نام تجویز کیا تھا۔ ''تکونے پیالے'' جس کے کوئی معنی نہیں تھے لیکن بہر صورت ایک نام رکھا تو ضرور جائے گا۔

ماہنامہ نیرنگ خیال نے خطوط کے آئینہ میں کے عنوان سے خطوط کا ایک سلسلہ شروع کیا۔جس میں مشہور لوگوں کے وہ خطوط شائع کیے جاتے ہیں جو کسی بھی مقتدر شخصیت کے نام لکھے گئے ہوتے۔اس سلسلے کا باقاعدہ آغاز حفیظ جالندھری کے خط شائع کرنے سے کیا گیا، یہ وہ خطوط ہیں جو حفیظ جالندھری نے ضمیر جعفری کے نام خط لکھے ہیں اور یہ خط پہلی بار نیرنگ خیال میں شائع ہونے کے بعد منظر عام پر آئے یہ ۱۰ خطوط ہیں۔

۲۰ مارچ ۱۹۵۴ء کو حفیظ نے سید ضمیر جعفری کے نام یہ خط تحریر کیا۔جس میں انہوں نے ساری زندگی اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ان کے نزدیک مادی زندگی مادی اسباب چاہتی ہے۔یہاں حفیظ صاحب اپنی کیفیت کا اظہار بحیثیت شاعر یوں کرتے ہیں۔

> ''میں ٹھیک ہوں، روتا نہیں، ہنستا بھی نہیں کیونکہ اگر میں روؤں تو ڈراما ہوتا ہے۔ہنسوں تو ڈراما ہوتا ہے اور دونوں ڈرامے میرے اندرونِ قلب میں ہوتے ہیں'' ۶۰

دوسرے خط میں وہ بتاتے ہیں کہ اپنی نظموں میں سے مصرعے طرح کی پابندی ہٹادی ہے کیونکہ بوڑھے لوگ اب اس پر نہیں لکھ سکتے یہاں انہوں نے ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ضمیر نے جگن ناتھ آزاد کو نہیں بلایا وہ دوسرے بھارتی شعرا کی نسبت پاکستان سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور ان کو پنڈی سے بھی خاص لگاؤ ہے۔حفیظ بتاتے ہیں کہ مجھے اپنے ملک کی فوج سے دل کی گہرائیوں سے محبت ہے، مشاعرہ کے صدر محبوب جنرل شیر علی خان ہیں اور حفیظ ان کے مشاعرے میں جا کر اپنا کلام سنانا باعث فخر سمجھتے ہیں۔

تیسرے خط میں حفیظ صاحب ضمیر جعفری کو بتاتے ہیں کہ انہوں نے مشاعرے کا انتظام بہت خوب کیا ہے لیکن حفیظ اب مشاعروں کو پسند نہیں کرتا اس لیے وہ ضمیر جعفری کو کہتے ہیں کہ آؤ مشاعرہ چھوڑ دیں اور اپنی باتیں کریں اور پھر وہ

اپنا حال عرض کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی نئی بیٹی ابھی لاہور میں ہی ہے اور سعیدہ جو حفیظ کی بڑی بیٹی ہے اس نے ایف اے تو کر لیا مگر اس کی اردو میں کمپارٹمنٹ آ گئی ہے یہاں حفیظ اس جملے کی معنی خیزی کو بیان کرنے کے لیے دوبارہ یہ الفاظ دہراتے ہیں "اردو میں کمپارٹمنٹ آ گئی ہے"۔

ایک خط میں حفیظ اپنی بیماری کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ان کے بدن کو لگی بیماری ان کے اعصاب کو جھنجھوڑ رہی ہے اور کچھ ایسے لمحات ہیں جن کے بارے میں وہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کتنے مہلک ہیں اور ان کی یہ حالت مسلسل محنت، فکر اور مشقت کا نچوڑ ہے۔ خط کا اختتام انہوں نے اس شعر سے کیا ہے۔

پیاروں کی موت نے میری دنیا اجاڑ دی
یاروں نے دور جا کے بسائی ہیں بستیاں

خط میں وہ کراچی کے موسم کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں یہاں موسم عجیب ہے بارش ہر روز برستی ہے اور پانی کے ساتھ مکھیاں، مچھر بھی لے آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں میں بہت بیمار ہوں، ذہنی طور پر اور جسمانی طور پر بھی بیمار ہوں۔ تمام جسم درد، منہ اور پُورپُور درد دل میں مبتلا ہے کام بہت ہے اور میں تھک چکا ہوں۔ حکیم عبدالرحمٰن صاحب کی طرف جایئے گا تو حفیظ کہتے ہیں کہ ان کا سلام اور ان کی طرف سے عیادت کیجئے گا یہاں حفیظ حسرت بھرے لہجے میں کہتے ہیں کاش ہم سارے ایک جگہ ہوتے۔ ایک تازہ قطعہ پر اختتام کرتے ہیں۔

ان تلخ آنسوؤں کو نہ یوں منہ بنا کے پی
یہ مَے ہے، خودکشید اسے مسکرا کے پی
اتریں گے کس کے حلق سے یہ دلخراش گھونٹ
کس کو پیام دوں کہ میرے ساتھ آ کے پی

ایک خط میں وہ اپنے سفر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں بہاولپور سے لاہور، لاہور سے کراچی، کراچی سے رحیم یار خان اور پھر کراچی اور اب وہ کراچی میں بیٹھے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عزیز ملک کا کوئی خط انہیں نہیں ملا۔ وہ بے چارہ خود حالات کا مارا ہوا ہے۔ حفیظ صاحب کہتے ہیں کہ میں اس سے بھی زیادہ بے چارہ ہوں اور اپنی غیرت کو مدنظر رکھتے ہوئے ملازمت سے سبکدوش ہونے لگا ہوں۔

ایک خط میں انہوں نے کہا کہ جس زمین پر ان کی نظر ہے وہ زمین اگر ان کو مل جائے تو وہ لاہور والا مکان بیچ کر اسے خرید لیں گے اور اس پر چار کمروں کا ایک مکان تعمیر کروائیں گے۔ جس میں ان کی بیٹیاں آ کر رہا کریں گی یا وہ جو کنواریاں ہیں وہ رہ جائیں گی اور پھر صرف میں، میری بیوی اور یہ مکان رہ جائے گا۔ سامنے نیچے درخت کے حفیظ صاحب کی نشست لگائی جائے گی۔ زمین پر سبزیاں کاشت کی جائیں گی، چند بکریاں، دو گائیں، دو بھینسیں، ۳۰ مرغیاں، شہد کی مکھیاں پالنے کی

صندوقچیاں، ایک حوض جس میں مچھلیاں پالی جائیں گی ایک نہانے کا حوض۔ جب وہ ایسی جگہ بنالیں گے اور وفات پا جائیں گے تو یہ جگہ ضمیر جعفری اور ان کے خاندان کے سپرد ہو جائے گی۔

۳۰ نومبر ۱۹۵۶ء میں جو خط تحریر کیا۔ اس میں وہ ضمیر جعفری سے اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ میرا دل کرتا ہے کہ تم دس پندرہ دن میرے پاس آکر رہو اور مجھے لکھو بلکہ تار بھیجو کہ چھٹی ملی ہے یا نہیں۔ یہاں پر دوبارہ اس زمین کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا دل کرتا ہے کہ میں وہ زمین کا ٹکڑا خرید لوں وہاں پر آتے جاتے دوست مل لیا کریں گے، مر جاؤں گا تو ضمیر جعفری کے قریب ہی قبر ملے گی اور وہ وہاں مشاعرہ بھی کروالیں اس طرح میری روح کو بھی ثواب پہنچے گا۔

۷ فروری ۱۹۵۶ء کو جو خط لکھا اس میں کہتے ہیں کہ میں تندرست نہیں ہوں مجھ پر کام کا اتنا بوجھ ڈالا گیا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ڈالا گیا۔ حفیظ ضمیر جعفری کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ وہ ان کی آزردگی کا سبب جان گئے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کا گلا شکوہ نہیں کرنا چاہتے وہ چاہتے ہیں کہ کوئی جاننے والا ایسا ہو جو ان کو جان سکے اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ عزیز ملک اور ضمیر جعفری ان کو جا کر ملیں اور اگر یہ نہیں آسکتے تو ان کی یہی کوشش ہوگی کہ یہ ان کو جا کر مل آئیں۔

مجلّہ افکار کے مرتب صہبا لکھنوی نے افکار حفیظ نمبر کے نام سے شائع کیا۔ اس میں انہوں نے حفیظ جالندھری کے چند خطوط بھی شامل کیے ہیں جو حفیظ نے مختلف شخصیات کو لکھے ہیں جن میں "مدیر افکار"، سید ضمیر جعفری، پروفیسر محمد منور، محمد خورشید عاصم، اکرام قمر، قیس شیروانی (مدیر فردوس سیالکوٹ) کے نام خطوط شامل ہیں۔

حفیظ نے ۳۱ جولائی ۱۹۶۲ء کو مدیر افکار کے نام لکھا۔ جس میں وہ کہتے ہیں کہ حفیظ نمبر نکالنے کا خیال ان کی عزت افزائی ہے لیکن ابھی ان سے بہتر لوگ موجود ہیں پہلے ان کے لیے آپ کو کام کرنا چاہیے۔ مگر انہوں نے حفیظ کی بات نہ مانی اور اعلان کر دیا کہ چونکہ جوش نمبر نکالا جا چکا ہے اس لیے حفیظ نمبر نہ نکلا تو کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ حفیظ کہتے ہیں کہ وہ جالندھری ہیں تو کیا ہوا ان کو اردو زبان کے شاعروں میں ہی گنا جا چکا ہے۔ ان کا حفیظ نمبر کے سلسلے میں پہلا تعاون اپنے قلم سے واضح کر دیا کہ ان کا شعر و شاعری کی کسی حسینہ نازنین کے معاشقے میں جوش کے رقیب نہیں ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں جوش ملیح آبادی سے ان کی شناسائی کا آغاز ہوا ان دنوں جالندھر سے ادبی رسالہ "اعجاز" نکلتا تھا۔ اسی دوران وہ دہلی، میرٹھ، کان پور، رام پور، لکھنؤ اور دوسرے اردو مراکز کی سیاحت کے لیے نکلے۔ گرامی صاحب نے ان کو دہلی میں حکیم اجمل خان اور جناب نواب سائل کے نام اور لکھنؤ میں عبدالحلیم شرر کے نام تعارفی خطوط دیئے تھے۔ لکھنؤ میں ان کی ملاقات عزیز لکھنوی سے بھی ہوئی۔

جوش کا پہلا مجموعہ کلام شائع ہو چکا تھا انہوں نے لکھنؤ میں اس سے استفادہ کیا ان کو دوسرے شعراء کے دواوین سے قدرے الگ نظر آئی۔ کان پور میں ان کی ملاقات مرزا صاحب، حسرت موہانی اور جگر صاحب سے ہوئی۔ ملیح آباد میں جوش سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات چند لمحوں کی تھی اس وقت سے ذاتی شناسائی ہے۔ بعد میں ان دونوں کی ملاقات

کسی محفل یا کسی بزم احباب میں ہو جاتی تھی۔ان دونوں کے مشاغل، خیالات اور اظہار خیالات میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔

غزل میں تو بہت سے شاعر اپنی اپنی جداگانہ روش کے باوجود ایک قدر مشترک رکھ سکتے ہیں۔لیکن قلب و نظر کے معاملے میں تضاد ہو تو ہم مصری ہمراہی نہیں ہو سکتی۔حفیظ مقصدیت کے پیش نظر حالی اور اقبال سے متاثر ہیں۔معاشرے کی ذہنی یا عملی صحت کے لیے ان کے خیال و نظر کے لیے اپنی بساط کے مطابق اپنی صلاحیت فن کو استعمال کر رہے ہیں۔لہذا وہ جوش کے ساتھ بانہہ میں بانہہ ڈال کر کیسے چل سکتے ہیں۔جوش نمبر کے لیے لکھنے والے بزرگ حفیظ نمبر کے لیے لکھنا پسند نہ کریں گے کیونکہ حفیظ کی سب سے پہلی یا داللہ ہے اور ان میں سے اکثر اہل نظر بھی ہیں۔اسلوب بیان کی نزاکتوں اور زمان کی انونؤں کو جاننے والے بھی ہیں ان کی تحسین بھی فرماتے ہیں لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جہاں مقصدیت کم ہو لیکن پرانا جذبہ تربیت وطنیت وافر ہو وہاں ''کند ہم جنس باہم جنس پرواز'' کا نقش ہر عالم پیدا و ہویدا رہتا ہے۔

ان کے قدر دانوں کا حلقہ تو محض عوام الناس ہیں۔ہندو ہوں یا مسلمان، دل تو رکھتے ہیں لیکن زبان قلم سے کام نہیں لے سکتے ہیں۔ان کو بہتر طور پر جاننے والوں میں سے ایک نام ضمیر جعفری کا بھی ہے۔حفیظ کی پنجاہ سالہ جشن حیات منانے کے دو اولین مفکرین میں سے ایک ضمیر صاحب بھی تھے۔

حفیظ کے یاران قدیم میں سے اولین مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی ہیں پھر ایم اسلم ہیں، صوفی غلام تبسم ہیں، ڈاکٹر نذیر پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور، سید ذوالفقار علی بخاری، امتیاز علی تاج، سید عابد علی عابد ہیں۔یہاں پر حفیظ دعا مانگتے ہیں کہ اللہ ان کو ان کی رحلت کے بعد کم از کم تیس برس زندہ رکھے تا کہ ان کی موت پر مضحکہ انگیز حرکات پوچھنے پر مواد مل سکے۔ اور جو عالم بالا پر ہیں ان میں سے ان کے محسن اور بزرگ دوست اور جو حلقہ نیاز مندان لاہور بھی ہیں ان میں شیخ عبدالقادر، علامہ اقبال، سرراس مسعود، بابائے اردو مولوی عبدالحق، سالک، تاثیر، حسرتؔ، پطرس، قاضی عبدالغفار اور دوسرے بہت سے ادیبوں کو حفیظ بہت قریب سے جانتے تھے اور ان کے شاگردوں میں ہری چند اختر اور کرشن کانت مالویہ بھی مدت ہوئی جا چکے ہیں اور جو باقی ہیں انہوں نے بھارت میں ڈیرہ جما لیا ہے وہ ان کو کیا یاد رکھیں گے جو خود اپنی پرانی ادب زندگی بھلا چکے ہیں۔بھارت کے اندر دیوان برندرا ناتھ اور ظفر پیامی ہیں اور ان کے پرانے دوستوں میں بابا پیارے لال بیدی ہیں۔حفیظ سیاسی لوگوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتے کیونکہ سیاستین ابھی تک ان اہل قلم کو یہاں بھی اور وہاں بھی اور مقام دینے کی فرصت نہیں پا رہے جن کی سینہ کاویوں سے زندگی بنتی ہے اور جو دلوں کو جوڑتے ہیں اور توڑتے ہیں۔

بھارت میں خالص شعر و ادب کی وجہ سے ان کو عزت بخشنے والوں میں رشید صدیقی ہیں اور بھارت میں ان کے جاننے والوں میں دوارکا داس شعلہؔ بھی ہیں۔حفیظ نے ان کو ان کی عنفوانِ شباب کے وقت شاعری کے لیے خوار ہوتے دیکھا، شاعروں کی دھما چوکڑی سے بچایا تھا اور ان کے پتا سے حفیظ نے مسلمان اور شاعر ہونے کے باوجود ''بھلا وانس''

ہونے کا خطاب پایا تھا۔ اگر دوار کا نے اپنی خاندانی جھنجھٹوں سے فرصت پا کر کچھ لکھ دیا تو وہ جہاں تک حفیظ کے پرانے ملنے جلنے والوں اور شعر و شاعری کی وجہ سے جاننے والوں کو تعلق ہے ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں ہو جائے گا اور خطوط کے لیے ضمیر جعفری سے پوچھیے وہ کسی نہ کسی سے لے دیں گے۔ حفیظ کے اپنے خطوط بھی حسینوں کے لیے نہیں ہیں۔ جو لوگ ان کی اپنی وضع قطع کے ہیں ان کو خط لکھتے اور جواب دیتے ہیں اور وہ خط لکھنے میں انتہائی گھامڑ اور بے ربط ہیں۔ بے تکلف دوستوں سے عبارت آرائی کبھی ان کا مقصود نہیں تھا۔ خط کی طوالت کی وجہ سے بات ختم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان میں بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ جتنا کچھ وہ بن چکے ہیں اس کی مرمت کا اہل نہیں ہیں۔ اب دوسرے جو کچھ ان کو بناتے ہیں بنوا لیجئے۔ افکار کی حفیظ نمبر کی آمد ان کو جس رنگ میں نظر آ رہی ہے۔ ان کے لیے اپنے ہی ایک شعر کی صورت ہے۔

پری رُخوں کی زبان سے کلام سن کے میرا
بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

''حفیظ کے خطوط'' جو حفیظ نے سید ضمیر جعفری کے نام لکھے تھے۔ ضمیر جعفری ان خطوط کے بارے میں ایک خط مدیر افکار کے نام لکھتے ہیں۔ جس میں حفیظ نمبر کے لیے ضمیر سے حفیظ صاحب کے خطوط کی فرمائش کا تذکرہ کیا ہے وہ ان خطوط کے بارے میں خود بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کے حفیظ سے ذاتی روابط کی ابتدا ۱۹۴۸ء میں جہلم کے ایک مشاعرے میں ہوئی۔ جس کا انتظام ان کے سپرد تھا۔ حفیظ ان کو اپنے عزیز دوستوں میں شمار کرتے تھے۔ ان کا حفیظ سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی تھا، ضمیر نے پورے کے پورے خطوط نقل کر دینے کی بجائے اقتباسات پیش کر دیئے تا کہ شخصیت کی وہ تصویر خطوط کے آئینہ سے جھلکتی ہوئی واضح ہو کر سامنے آ سکے۔ یہ خطوط جس دور میں لکھے گئے وہ حفیظ کی بعض معرکہ آرا کامیابیوں اور کئی دل خراش حوادث کا زمانہ ہے۔ ان کی گولڈن جوبلی منائی گئی قومی ترانے کی تخلیق ہوئی۔ ہلال امتیاز کا خطاب ملا۔ اس کے برعکس اسی زمانے میں ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔ بعض یارانِ قدیم کی موت کا سانحہ دیکھا بچیوں کی بیماری سے دوچار ہوئے اور خود بھی طویل علالت سے گزرنا پڑا۔ مجموعی طور پر یہ زمانہ ان کے لیے انتہائی ذہنی و جسمانی اذیت اور کرب کا زمانہ رہا ہے۔ جس کا نہایت گہرا اثر ان کے خطوط میں بھی جا بجا نظر آتا ہے۔

پہلا خط ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو حفیظ نے ضمیر کے نام تحریر کیا۔ اس خط میں حفیظ صاحب ضمیر کے ذریعے اپنے کسی دوست کو پیغام بھیجنا چاہ رہے ہیں کہ ان کے معاملات اللہ کے سپرد ہیں۔ اللہ کی مدد شامل حال ہے جس کی وجہ سے انہوں نے ۱۹۴۷ء سے اب تک کے حالات کا سامنا صبر کے ساتھ کیا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر یقین نہ ہوتا تو اب تک پاگل ہو چکے ہوتے۔ تنہائی اور بے کسی کا احساس آہ کرنے کے گناہ کا ارتکاب کسی اللہ کے بندے کے سامنے کرا دیتا ہے۔ جب ان کے وقت کی آنکھ کھلے گی تو وہ دیکھے کہ اس نے کتنا عمدہ جوہر ضائع کیا ہے جو اس وقت کا اپنا ہی جوہر تھا۔

ایک خط میں حفیظ صاحب اپنی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہیں کہ طبیعت کے ملال کا اظہار اپنے دوستوں سے کر کے ان کو پریشان کرنا بڑی بے ہودگی ہے۔ انہوں نے شاعری کے ساتھ ذمہ داری کی زندگی بھی اختیار کی۔ اس ذمہ داری کی زندگی میں ان کا گھرانا، ان کے خویش و اقارب کے ساتھ ان کے دوست، آشنا اور وہ لوگ بھی تھے جو کسی نہ کسی طرح ان کی زندگی کی راہ میں سامنے آئے۔ انہوں نے روٹی کمانے کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرنی تھی۔ اس خط میں انہوں نے اونٹ کی مثال دی ہے جس طرح اونٹ پر وزن لادا جاتا ہے، اسی طرح ان پر ذمہ داریوں کا بوجھ لادا گیا۔ جس نے ان کی کمر توڑ دی۔ حفیظ صاحب ضمیر کو اپنی انتہائی کش مکش کا گواہ کہتے ہیں۔

ایک خط انتہائی مختصراً لکھا۔ اس میں حفیظ صاحب اپنے دوست کو کہتے ہیں کہ ضمیر وہ تعلقات بھی عزیز تھے لیکن بلوغیت دل و نگاہ کے بعد تعلقات کی نوعیت بدل جاتی ہے اور بدل جانی چاہیے وہ خود جذباتی قسم کے آدمی ہیں لیکن ان کو ہمیشہ گہرے احساس وفا اور گہرے احساس ذمہ داری کی تلاش رہی ہے۔

۲ دسمبر ۱۹۵۴ء میں حفیظ نے ضمیر کے نام جو خط تحریر کیا۔ اس خط میں حفیظ مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ مشاعرے میں شریک نہیں ہونا چاہتے۔ وہاں ان کے لیے خطرہ ہے، اپنی بیوی سے مار کھا لینا آسان ہے دوسروں کی بیویاں مارنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتیں اور وہاں مکھیاں بہت ہوں گی ان کی بھن بھن سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ ان کو شادی یا عقدِ ثانی کی جسمانی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ وہ شادی کو جوئے سے تشبیہہ دیتے ہیں کہ یہ جوا ہے اور انہیں جوا کھیلنا نہیں آتا۔ ان کے مصائب، پریشانیاں، جسمانی علالتیں، ان کے مزاج کے نقائص ان کے دوستوں کے حدودِ محبت اور وسعت نفرت وغیرہ سب ان کی نظر میں ہے۔ ان حالات میں ان کو ایک ایسے دوست کی ضرورت ہے جو آخری سانس تک ان کو چلتے رہنے کا حوصلہ دے۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ ایسا رفیق کہاں ہے؟

ایک خط میں حفیظ صاحب اپنی تنہائی کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتے ہیں اور اپنے دوست کو کہتے ہیں کہ وہ ڈوب رہے ہیں وہ کسی کو بلانا بھی نہیں چاہتے بس چاہتے ہیں کہ کوئی آواز دیتا جائے تا کہ وہ مطمئن رہیں کہ کوئی ان کے ڈوبنے کی ادا کو دیکھ رہا ہے۔

اگلے خط میں حفیظ صاحب اس زمانے کی دوستیوں اور تعلقات کا ذکر کرتے ہیں کہ اوقات گزاری، اکٹھے مل بیٹھنا اور مشکل وقت میں ساتھ دینا اس زمانے کی دوستی اور تعلقات کی ایک قسم ہے مگر حفیظ صاحب دوستی کے متعلق مختلف خیالات رکھتے ہیں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سچی، بے تکلف اور صاف بات کرتے ہیں۔ انہوں نے شعر و شاعری کے سلسلے میں کوئی بڑا پاپڑ نہیں مارا کہ ان سے پہلے صاحبانِ فن اس سے محروم رہ گئے ہوں۔ ضمیر کے خط کی ایک بات پر حفیظ صاحب کو اختلاف ہے۔ حفیظ صاحب کی فطرت میں خوشامد اور جھکنا نہیں ہے۔ انکسار اور بات ہے، دنیاوی طاقتوں کے سامنے جھکنا اور بات ہے۔ مگر حفیظ صاحب اخلاص اور محبت کے ساتھ بڑے دل، بڑے ہنر اور بڑی اخلاقی و تخلیقی شخصیت کے سامنے جھکتے ہیں۔

حفیظ ان لوگوں کو بڑا انہیں سمجھتے جن کو ضمیر صاحب نے بڑا سمجھا ہے۔ وہ ان بڑے لوگوں کو بڑے بڑے سینگوں والے بیل اور بڑا اژدھا سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ ان کو پاکستان سے محبت ہے اور وہ یہ وطن انعام وہ پاکستان کے جھنڈے کو اسلام کا جھنڈا سمجھتے ہیں۔ حفیظ ضمیر سے کہتے ہیں کہ ان لوگوں سے پوچھو کہ آخر وہ ترانے میں کون سے الفاظ چاہتے ہیں اس بات پر بحث کا آغاز ہوگا۔ حفیظ کے خیال میں ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

ایک خط میں حفیظ کہتے ہیں کہ انہوں نے آغازِ حیات شعروسخن میں کسی کا دل نہیں دکھایا ان کو ایک بھی رفیق ایسا نظر نہیں آیا جو ان کے کلام کے نقائص کی بنا پر پے در پے وار کرے۔ بلکہ ان کی کامیابیوں کی وجہ سے وار کرتے رہے ہیں۔ وہ اس پر حیران ہیں کہ وہ کب سے ان لوگوں کے ساتھ گزارہ کر رہے ہیں۔ حفیظ صاحب شاعر ہیں۔ پاتک بار، ہر حال میں ان سے مختلف ہیں۔ ان کا منصب شعروسخن کے سلسلے میں سنجیدہ خدمت انسانیت ہے۔ یہ معاملہ کہ قومی ترانے کی دھن پہلے تھی اور الفاظ بعد میں لکھے گئے اس لیے ترانہ کمزور ہے۔ حفیظ صاحب نے اس دھن میں پروقار، پرشوکت الفاظ رکھ کر ترانے کو قومی بنایا ہے۔ حسن صورت اور حسن معنی کے لحاظ سے بھی ترانہ مکمل ہے اگر اردو میں سے عربی اور فارسی کے الفاظ نکال دیئے جائیں تو پیچھے ہندی رہ جاتی ہے۔

حفیظ کہتے ہیں کہ یہ ترانہ عوام کے ان ان پڑھوں کی زبان میں نہیں ہے جو پاکستان میں ۹۵ فی صد ہیں اور وہ لوگ چاہتے ہیں کہ بلوچی، مکرانی، بروہی، سندھی، کچھی، گجراتی، مارواڑی، حصاری، رہتکی، بنگالی، لاہور، پوٹھوہاری، پنجابی، مری کے اردگرد کی پہاڑی، ہزاروی، کشمیری بلتستانی، گلگتی، چترالی، پشتو لکھنوی، دہلوی، ناگپوری، حیدرآبادی، مدراسی اور بنگالی بولنے والے مختلف عناصر جو اَن پڑھ ہیں۔ اپنے اپنے لہجے اور الگ الگ بولیاں بولتے ہیں۔ ان سب کے لیے ان کے جاہلانہ لہجوں اور زبانوں کے مطابق ایک ترانہ لکھا جائے۔ حفیظ صاحب کہتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ سب اَن پڑھوں کو تعلیم دینا مقصود نہیں۔ ان کی جاہلیت کو برقرار رکھنے اور ایک جاہلانہ سطح پر رکھنے کے لیے قومی ترانہ بھی جاہلانہ ہونا چاہیے۔ ان لوگوں کو اتنے مختلف جاہلوں کی مختلف بولیوں کو یک جا کر کے ایک ترانہ لکھنے سے کون روکتا ہے۔ حفیظ قومی ترانے کو ایسے مضحکے کے خیال سے بھی قریب نہیں رکھنا چاہتا وہ اس معرکے سے بدلے نہیں ہیں۔ گالیاں شکست خوردہ دیا کرتے ہیں۔ شاعروں کا یہ گروہ ترانہ تو لکھ نہیں سکا اب کمینگی کا مظاہرہ کر رہا ہے اور تاریخ ادب میں ان کا یہ شور اعتراف شکست کی صورت میں قائم رہے گا۔ آخر میں وہ کہتے ہیں کہ یہ لمبا خط چارپائی پر لیٹے رہنے کی وجہ سے ممکن ہے اور یہ پریشان خیالی کا مجموعہ ہے۔

ایک خط میں حفیظ صاحب کہتے ہیں کہ باہر دنیا جنگ کی تیاری میں ہے اور گھر میں ہر کوئی دل تنگ ہے اور اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں وہ بیماری، معذوری، کسمپرسی کے ساتھ بے وفائی کا شکار ہیں۔ لیکن وہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے انہیں آلائشوں سے پاک رکھا ہے۔

سہارا کیوں لیا تھا ناخدا کا
خدا بھی کیوں کرے امداد میری

۱۳ جنوری ۱۹۵۵ء کو حفیظ نے ضمیر کے نام جو خط تحریر کیا۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ آج ۱۳ جنوری ہے اور کل وہ ۵۵ برس کے ہو جائیں گے۔ امید نہیں تھی کہ جوبلی کے بعد انہوں نے یہ پانچ سال کیسے گزارے۔ جس مشکل سے وہ قدم اٹھا رہے ہیں وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتا۔ ہر حال زندگی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت ہے، اس کا کوئی مقصد ضرور ہوگا ان کا اپنا ہی شعر ہے۔

کرم کیا دل بے مدعا دیا تو نے
ترے کرم کا مگر کوئی مدعا نہ ملا

آخر میں وہ کہتے ہیں کہ ان بے ربط باتوں کو چھوڑو کوئی کام کی بات کرتے ہیں اور انہوں نے جو بھی کام کی باتیں کیں وہ اس وقت ان کے ارد گرد شکستہ و بوسیدہ، ٹکڑے ٹکڑے، پرزے پرزے ہو کر بکھری پڑی ہیں۔

۱۹۵۵ء کے خط میں وہ بتاتے ہیں کہ ابھی مشاعرہ ہونے میں ڈیڑھ مہینہ باقی ہے اور ان کے فضلی صاحب، روش، جگر اور ساغر سے پرانے تعلقات ہیں اور جب کہ زندگی اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکی ہے اور اگر ان کو اپنے پرانے دور کو دیکھ لینے کی گنجائش مل جائے تو بڑی بات ہے۔ شاید پرانے دور کی کوئی جھلک ان کے خشک لبوں پر خوشی کی لہر پیدا کر دے۔

۳۱ اگست ۱۹۵۵ء کو حفیظ نے ضمیر کے نام لکھا کہ شعر و سخن ایک فن ہے۔ اس کا تعلق انسانی صلاحیتوں کی انتہائی گہرائیوں سے ہے۔ اس کے لیے دل میں جذبہ، دماغ میں خیال اور طبع میں احساس کا ہونا ضروری ہے۔ یہ جذبہ، خیال اور احساس کے حسین اظہار کا نام ہے۔ کانے، لُولے، لنگڑے بچے پیدا کرنے سے ماں کا پیٹ تو خالی ہو جاتا ہے لیکن دنیا میں حسین صورتوں کی فراوانی نہیں ہوتی۔

ایک خط میں وہ اپنے گھر کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انہوں نے ۳۰ ستمبر کو ملیر چھاؤنی کا مکان چھوڑ دیا ہے اور اب کراچی کی نئی آبادی میں ۴۰۰ روپے ماہوار کرایہ پر دو سال کی پیشگی دے کر ایک نامکمل مکان کی تکمیل میں مدد کر رہے ہیں۔ حفیظ ضمیر کو کہتے ہیں کہ آپ کا خط ٹائپ میں تھا لہٰذا اتنا ہی بے کیف تھا۔

اگلے خط میں اعظم کریوی کے قتل کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اعظم کا راز وہ بھی نہیں سمجھ سکے۔ حفیظ صاحب کو حسرت کی جدائی کا غم بھی ہے وہ حسرت اور ضمیر کے تعلقات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ حفیظ کو تاثیر اور حسرت وغیرہ سے ملاقاتوں کے دن بھی یاد ہیں۔ ان کے اور حسرت کے درمیان سوائے شعر و سخن کے کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ حفیظ کے خیال میں تاثیر کے بعد حسرت کی نظر سب سے زیادہ گہری تھی۔ حسرت کی معلومات اس دور کے اخبار نویسوں سے بہت زیادہ تھی

اور وہ شگفتہ نویس بھی تھے۔

چودھواں خط ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو حفیظ نے ضمیر کے نام تحریر کیا اس میں انہوں نے صرف ایک شعر درج کیا ہے۔

خط نہیں آیا مہینہ ہو گیا
جعفری بالکل کمینہ ہو گیا

یہ خط صرف اسی ایک شعر پر مشتمل ہے۔

پندرھواں خط ۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء کو حفیظ نے ضمیر کے نام تحریر کیا۔ اس خط میں وہ اپنے دوست عزیز ملک کی ناراضگی کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ان کے دوستوں کو ان سے ناراض ہونے کا اور انہیں اپنے قدموں میں جھکانے کا حق حاصل ہے۔ عزیز کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ حفیظ صاحب عزیز سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ضمیر صاحب کو کہتے ہیں کہ ضمیر عزیز کو تنہائی میں لے جا کر اسے اٹھا کر منہ چوم لے اور عزیز حیران ہو کر دیکھے تو عزیز کو بتا دینا کہ یہ حفیظ کی طرف سے ہے۔

ایک خط حفیظ نے ہلالِ امتیاز کے خطاب پر ضمیر کی طرف سے مبارکباد کے ایک تار کے جواب میں لکھا کہ ضمیر ایک تار دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوگیا کہ حفیظ کو ملک الشعرا، حسان الملک، بہادر خان بہادر وغیرہ کے خطابات سے نوازا گیا ہے۔ لیکن انہوں نے ان کو استعمال نہ کیا اور نہ ہی ان کو ان خطابات پر فخر ہے۔ لیکن ہلال امتیاز کو وہ اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کو ہلال کی مانند پاکستان کو روشن کرنے کے لیے ابھی جینا اور کام کرنا ہے۔

اس مجموعے میں شامل حفیظ کے زیادہ تر خطوط پر تاریخ درج نہیں ہے۔ ایک خط میں حفیظ صاحب اپنی دولت کا ذکر کرتے ہیں جو ان کو اللہ کی دی ہوئی صلاحیت قلب ونظر سے خود پیدا کی ہے اور ان کی وہ دولت ان کا لکھا مواد ہے جو مکمل اور نامکمل ہے اور ان کو یہ فکر ہے کہ وہ نامکمل کو مکمل کریں اور جو ان کے سینے میں دفن ہے اس کو بھی لکھ ڈالیں۔

ایک جگہ وہ اپنے دوستوں کو بے وقوف کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر کس قدر خوش رہ سکتے ہیں۔ وہ ایک آنکھ سے روتے اور ایک آنکھ سے ہنستے ہیں اور ان کو کہتے ہیں کہ محاورے میں ایسا جانور سنا تو ہوگا مگر دیکھا نہ ہوگا اور آ کر ایسی مخلوق کا نظارہ کر لو کیونکہ نہ ایسی مخلوق پیدا کی جائے گی اور نہ ہی ہو سکتی ہے۔

۲۳ جولائی ۱۹۵۶ء کو حفیظ نے ضمیر کے نام ایک خط تحریر کیا اس خط میں حفیظ صاحب ضمیر سے اس زمین کا تذکرہ کرتے ہیں وہ اسے خریدنا چاہتے ہیں اور ضمیر کو کہتے ہیں کہ وہ وہاں بیٹھ جائیں اور وہاں سے گزرتے ہوئے دوستوں سے بھی مل لیا کریں گے اور جب وہ مر جائیں گے تو ضمیر صاحب کو قریب وہاں ایک درگاہ بن جائے گی جہاں ضمیر صاحب مشاعرہ کرا لیا کریں گے اور اس مشاعرے کا نام مشاعرہ پیر رکھ دیا جائے گا اور اسی طرح حفیظ کی روح کو ثواب پہنچ جائے گا۔

ایک خط میں حفیظ صاحب ضمیر سے کہتے ہیں کہ تمہاری دعاؤں سے وہ ابھی تک سلامت ہیں اور پھر حفیظ کہتے ہیں کہ اگر

سلامتی کے معنی یہی ہیں کہ کسی گاڑی کے نیچے آ کر کچلا نہیں گیا، ہاتھ پیر ٹوٹ نہیں گئے، چلتے پھرتے لوگوں کے ساتھ ہنستے، ہنساتے اور تنہائی میں رو بھی دیتے ہیں۔ لیکن پھر حفیظ صاحب ضمیر سے پوچھتے ہیں کہ ضمیر نے کبھی کسی پرندے کو ہاتھ سے ذبح ہوتے دیکھا یا کیا ہے۔ وہ جسے ذبح کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے، وہ پھڑ پھڑاتا، بازو ہلاتا اور اس کا سر ڈھلکا ہوا لیکن آنکھیں کھلی ہوئی۔ وہ کوئی پرندہ ہو یا جاندار اس کی یہ حرکت ''حرکت مذلوحی'' کہلاتی ہے۔ یہاں پر حفیظ اپنی سلامتی کو اس سے تشبیہہ دیتے ہیں کہ ان کی سلامتی بھی ایسی ہی ہے۔

۲۱ جنوری ۱۹۵۸ء کو حفیظ نے ضمیر کے نام جو خط تحریر کیا اس خط میں حفیظ صاحب نے پنڈت ہری چند اختر کی موت کا ذکر کیا ہے کہ ان کو پنڈت صاحب کی موت کے بارے میں کسی نے نہیں بتایا۔ ان کو ٹیلی فون پر ممتاز حسن صاحب کی بیگم نے بتایا اور پھر انہوں نے کراچی میں ہی ذوالفقار بخاری، محمود نظامی اور احمد سلمان وغیرہ کو ٹیلی فون کر کے بتایا۔ حفیظ کو کسی نے بھی پنڈت پر کچھ کہنے یا لکھنے کو نہیں کہا۔ حفیظ کی بچیوں کو پنڈت کی موت کا صدمہ ہوا کیونکہ پنڈت کے ہاتھوں میں وہ کھیلی اور پلی ہیں۔ ان کا گھر ایسا ماتم کدہ تھا جس میں ماتم تو تھا مگر ماتمی کوئی نہیں تھا۔ ممتاز حسین پنڈت جی کے مخلص دوست ہیں۔ ان کے وجود نے حفیظ کی لاج رکھ لی۔ حفیظ سوز و ساز کا دیباچہ ''بقلم خود'' کے عنوان سے لکھنا چاہتے ہیں اور اس میں پنڈت کا تذکرہ بھی لازمی سمجھتے ہیں۔

ایک خط میں حفیظ صاحب ضمیر کو ان کے لاعلمی پر بے وقوف کہتے ہیں کہ وہ اپنے سانس کو جاری رکھنے کے لیے اپنی جان و جسم کے کن خشک زروں سے توانائی حاصل کر رہے ہیں۔ انہوں نے شیخ نذیر کی نظم ''دارا مارا'' کسی اخبار میں آئی اور پڑھی اور بعد میں ابن انشاء سے بھی سنانے کو کہا۔ شیخ نذیر کتنا بڑا مشتاق ہے۔ حفیظ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ان کا ایک دوست ایسا بھی ہے۔ آخر میں وہ ایک شعر بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں حفیظ کی جگہ نذیر لکھ لیجئے۔

شعر ہر رنگ میں کہنا ہے ترا کام حفیظؔ
آج ہم مان گئے ، مان گئے ، مان گئے

حفیظ نے مری سے ۱۸ جولائی ۱۹۵۸ء کو ضمیر کے نام ایک خط لکھا۔ اس میں حفیظ صاحب ضمیر سے کہتے ہیں کہ تم کو ان کے جذبہ دل نے کھینچ بلایا تھا۔ اب اپنے وعدے کو یاد رکھو اور ہفتے کی شام پہنچ جاؤ۔ رات رہو اور دوسرے دن یعنی اتوار کی شام واپس چلے جانا۔ یہاں پر وہ ایک شعر کہتے ہیں۔

جاؤ ہاں جاؤ ہوئی صبح شب وصل نمود
سلسلہ نامہ و پیغام کا جاری رکھنا

حفیظ اور ان کی بیوی اور ننھی بچی وارڈ میں مریض اور مریضائیں ہیں۔ آخر میں وہ ایک شعر بیان کرتے ہیں جو خواجہ رشید کے رُشد سے ہے۔

ابھی باقی ہے معیادِ مصیبت

ابھی کچھ اور جینا چاہتا ہوں

۱۹ اگست ۱۹۵۸ء کو حفیظ نے ضمیر کے نام تحریر کیا۔ اس خط میں حفیظ صاحب ضمیر کو نصیحت کرتے ہیں کہ والدہ کا سایہ آپ پر ہمیشہ قائم رہے یہ ذات پھر کبھی نہ ملے گی۔ اگر تمہاری سستی نے تم کو اپنے فرض سے غافل رکھا تو آخری دم تک خود کو معاف نہیں کر پاؤ گے۔ حفیظ ضمیر کو گاؤں چلے جانے کا کہتے ہیں کہ ہر وقت اپنی ماں کے پاس جا کر بیٹھو اور ان کے وہی بچے بن جاؤ جو توتلی زبان میں اپنی ماں کے دل پر راج کرتا تھا۔

حفیظ نے مری سے ۱۰ جون ۱۹۵۹ء کو ضمیر کے نام تحریر کیا۔ اس خط میں حفیظ صاحب دوستی کے بارے میں کہتے ہیں کہ دوست ہونا مشکل کام ہے، دوستی کرنا اور نبھانا آسان کام نہیں ہے مگر باپ، بھائی، بیٹا، بھتیجا، چچا، نانا، ماموں یا شوہر وغیرہ آسان ہے۔ دوستی کی راہ میں ایسے مقام بھی آتے ہیں جن کے بارے میں گرامی نے کیا خوب کہا ہے۔

ولایتے کہ درآں بندہ بے خداوند است

ایک خط حفیظ نے ماڈل ٹاؤن لاہور سے ۵ دسمبر ۱۹۶۱ء کو ضمیر کے نام لکھا۔ حفیظ صاحب اس خط میں کہتے ہیں کہ انہوں نے جن لوگوں کے لیے بھاگ دوڑ کی اپنے ذاتی معاملات کو بھی قربان کر دیا۔ آج جب حفیظ بھنور میں ہیں تو وہی لوگ ان پر ذاتی معاملات کے بارے میں کوتاہی کا الزام لگا رہے ہیں۔ یہاں پر وہ اپنے تین تازہ اشعار کا ذکر کرتے ہیں۔

غم موجود ہے، آنسو بھی ہیں، کھا تو رہا ہوں پی تو رہا ہوں
جینا اور کسے کہتے ہیں، اچھا خاصا جی تو رہا ہوں
یارو میں نے اپنا سینہ اپنے ہاتھوں چاک کیا ہے
سچ کہتے ہو، لیکن دیکھو اپنے ہاتھوں سی تو رہا ہوں
خونِ جگر آنکھوں سے نہ ٹپکا۔ شعلہ بن کر منہ سے لپکا
شعبدہ بازی فن پر ہنسیے میں بھی ہنستا ہی تو رہا ہوں

حفیظ اس وقت گھر بیٹھے ہیں۔ ان کی بیوی، بیماری بچی کو لے کر لاہور شہر کے ایک ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی ہے۔ ان کو نزلے کی شکایت ہے مگر ضعیف ہونے کی وجہ سے کہیں آنے جانے میں سستی کا شکار ہیں اور ایک چیک ضمیر کو بھیج رہے ہیں۔ حفیظ ضمیر کے بال بچوں کو دعا دینے کے بعد اپنی بچیوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اللہ یا تو ان کو ان کی موت سے پہلے ہی اٹھا لے یا پھر اللہ ان کے لیے کوئی سامان فرما دے۔ آخر میں وہ شعر پر اس خط کا اختتام کرتے ہیں۔

کوئی چارہ نہیں دعا کے سوا
کوئی سنتا نہیں خدا کے سوا

ایک خط میں حفیظ صاحب ضمیر کو کہتے ہیں کہ ان کو ضمیر کا مقالہ ''حفیظ کے ساتھ چند لمحے'' ''ماہِ نو'' میں دیکھا۔ حفیظ نے ضمیر کے اس مقالے کی تعریف اس لیے نہیں کیونکہ حفیظ اس سے بھی بہتر کام کر سکتا تھا لیکن ضمیر نے جس رنگ میں لکھا ہے اسے کوئی دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ حفیظ کے خیال میں شعر کی طرح شعر پر کچھ لکھنا بھی محنت چاہتا ہے لیکن محنت کی عادت کس کو ہے؟۔

حفیظ نے پروفیسر محمد منور کے نام بھی خطوط لکھے ہیں۔ افکار حفیظ نمبر میں حفیظ کے پروفیسر محمد منور کے نام صرف ۲ خطوط شائع ہوتے ہیں۔

۲۸ ستمبر ۱۹۶۰ء کو مری سے حفیظ نے محمد منور کے نام خط لکھا جس میں حفیظ کہتے ہیں کہ منور صاحب کا خط 24 ستمبر کا کل ملا ہے اور ان کے لیے اتنا لکھنے کی زحمت کیوں کی۔ قوم وملت کی نگاہیں اگر ایک ہی نقطے پر سمٹ آئی ہیں تو ان کے لیے ایک نگاہ ہی کافی ہوگئی ہے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ زیادہ نگاہوں سے فرار میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ حفیظ کہتے ہیں اس دنیا سے جاتے وقت بڑے بڑے بھاری بھاری بہت سے بوجھ کون اٹھائے۔ بس چند یادیں یا ایک آدھ شفقت یا محبت کافی ہے ۔حفیظ ساری عمر اپنی ملت سے سے ملتے جلتے رہے ہیں۔ ان کے کام جلنا نہ آیا لیکن ان کا ملنا موجودہ صورت حال ان کے لیے انعام کے طور پر لایا۔ وہ بہک رہے ہیں، حفیظ کا منور سے جو ایک قلبی تعلق ہو گیا ہے اس میں نہ منور صاحب کی کوئی خوبی ہے اور نہ ہی حفیظ کی کوئی کمزوری ہے۔ قلبی تعلق کے لیے خوبی خرابی دونوں بے معنی ہیں۔

یہیں ختم ہے بحث معیار حسن
جو دل لے گیا، دلربا ہو گیا

حفیظ اور منور کے تعلقات سے دنیا کو کیا واسطہ ہے اور منور کبھی یہ غلطی نہیں کریں گے کہ لوگوں کو ان کے انوکھے ملاپ کا پتہ چلے اگر لوگوں کو پتہ مل جائے تو وہ حفیظ میں ایسے کیڑے ڈالیں گے کہ منور کو چننے مشکل ہو جائیں گے۔

حفیظ کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا اس کائنات میں کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ منور صاحب کو اپنے لیے دعا کرنے کو کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر زندگی رہی تو پھر اکیلے بیٹھیں گے اور ان کی سرگزشت سننا، ایسی کہانی، ایسا افسانہ یا ایسی سرگزشت منور نے شاید کسی آٹو بائیوگرافی میں تو کیا کسی ناول میں بھی نہ پڑھی ہوگی۔ حفیظ یہاں سے راولپنڈی چلے جائیں گے اور منور صاحب کو اپنے وہاں کے ٹھکانے کا پتہ بتا دیں گے۔ حفیظ نے چشتی کو لائل پور کے پتے پر مبارک باد کا خط بھیج دیا ہے۔ قریشی عبداللہ شاہ کے لیے لکھنے کا یہ وقت نہیں ہے اور حفیظ نہ ہی ان کا نام ضمن میں لینے کی جرأت کر سکتے ہیں۔

دوسرا خط حفیظ نے کراچی سے ۶ مارچ ۱۹۶۱ء کو مرزا صفدر کے نام تحریر کیا۔ اس خط میں حفیظ اپنے ذاتی حالات کو

لکھتے ہیں۔حفیظ کا خیال ہے کہ ان کا خط منور کو نہیں ملا بلکہ کسی اور کے ہاتھ لگ گیا ہے کیونکہ ان کو یقین ہے کہ انہوں نے خود ڈاک کے سپرد کیا تھا۔ان کو اس لیے دکھ ہے کیونکہ اس میں انہوں نے ذاتی مصائب کا ذکر کیا تھا اور وہ دعا گو ہیں کہ وہ خط منور کو مل جائے۔حفیظ کہتے ہیں کہ کاش منور آپ نہ ملتے۔ان کے ملنے سے حفیظ اپنی اس دنیا سے مفارقت چند روز یہیں رہنے کی حسرت ساتھ لیے جا رہے ہیں۔لاکھوں، ہزاروں مداحوں، واہ واہ کرنے والوں اور لاکھوں ہزاروں دعائے خیر کرنے والوں کے درمیان حفیظ جن کو شاعر پاکستان اور یہ اور وہ سب کچھ کہا جاتا ہے۔تن تنہا اور خود بھی بیمار ہیں اور اپنی بیمار بیٹی کے تیمار دار بھی ہیں۔ان کی سب سے بڑی بیٹی تسنیم دماغی عارضے کا شکار ہے اور حفیظ خود ہی چوبیس گھنٹے اس کی تیمارداری کرتے ہیں۔ان کا اپنا جو حال مری میں ہوا تھا اور جس کے سبب انہیں قطعی آرام کرنے کے لیے تلقین کی گئی تھی۔ اب وہ آرام کے قابل ہیں لیکن اللہ کی مرضی پر راضی ہیں ان کا نہ کوئی بھائی نہ کوئی بیٹا اور نہ کوئی یار دوست ہے۔جو ان کے قریب رہ کر ان کی مدد کرے۔ہنسنے بولنے والے لاکھوں ہیں مگر اس کرب کی حالت میں کوئی بھی اپنے آپ کو دوسرے کا روگ نہیں لگاتا۔حفیظ کو منصور صاحب کا خط ملا جس کی وجہ سے ان کا قلبی سکون حاصل ہوا۔حفیظ خورشید کے خط کا جواب نہیں دے سکے۔کیونکہ ان کی دماغی حالت ایسی ہے کہ بڑی مشکل سے ایک لائن ہی لکھ سکتے ہیں۔مرزا منور کی محفل میں کسی وجہ سے بیٹھنے کے لیے وہ لازماً کچھ نہ کچھ لکھیں گے، جس کی ان کو بڑی خوشی ہے۔

حفیظ جالندھری نے محمد خورشید عاصم کے نام بھی خطوط لکھے جن میں سے دو خطوط افکار حفیظ نمبر میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

حفیظ نے ۲۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو محمد خورشید عاصم کے نام مری سے تحریر کیا۔اس خط میں حفیظ کہتے ہیں کہ ان کا خط خورشید کے لیے باعث تشویش اس لیے ہے کیونکہ انہوں نے مسکرانا چھوڑ دیا ہے۔ان پر معاشرے کا نزلہ گرا ہے اور یہ نزلہ ہر باشعور اور حساس آدمی کو ورثے میں ملتا ہے کیوں کہ یہ لوگ معاشرے میں معاشرے کے عضوِ ضعیف ہیں اور نزلہ بر عضو ضعیف ریزد ہے۔معاشرہ نزلہ بن کر حساس اور باشعور لوگوں پر گرتا ہے اور حفیظ کو خورشید بھی حساس اور باشعور نظر آرہے ہیں اور خورشید کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ اپنی جوانی کو معاشرے سے بچنے کے سپر بنائے۔حفیظ حرکت مذبوحی میں مبتلا ہیں ان کے دور کے لوگ چلے گئے ہیں اور وہ اب جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ منور صاحب قریشی جی کو زندہ سمجھ کر ان پر ایک بہت ہی دلچسپ کتاب لکھیں حالانکہ قریشی صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔لیکن روحانی طور پر قریشی صاحب منور میں حلول کیے ہوئے ہیں۔حفیظ چاہتے ہیں کہ منور کم از کم دو گھنٹے ہر روز ان کے لطائف وظرائف اور ان کی زندگی کے حسن کو کاغذ پر ڈھالیں اور پھر ان کے حوالے کر دیں اور وہ اگر زندہ رہے تو اس کو اپنے قلم سے چند اشعار کے ساتھ کتاب کی صورت میں چھاپ دیں گے۔حفیظ کے لیے خورشید اور منور دونوں اس دور میں دو رحمت کے فرشتوں کی طرح جھلک رہے ہیں۔وہ بہت پرانے اور پسے ہوئے سُرمے کی طرح ہیں۔شاید چشم بصیرت کو اس سُرمہ سے بھی تھوڑی سی جلا مل سکے۔حفیظ کا مری میں

رہنے کا پروگرام حیدر چشتی کے چلے جانے کے بعد تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ یہاں سے لاہور یا کراچی جانے پر مجبور ہیں، حسن ابدال بھی جائیں گے یہاں سے پلٹ کر راولپنڈی ایک آدھ دن ہی قیام کریں گے۔ ان کی بیوی اور بچی بیمار ہیں، اور وہ اس مرتبہ خطوط میں بیماری اور لاچاری کے علاوہ کچھ کہہ نہیں سکے۔

یہاں پر وہ داغ کا شعر لکھتے ہیں:

ہم تو فریاد و فغاں آہ و بکا کرتے ہیں
جن سے کچھ ہو نہیں سکتا وہ دُعا کرتے ہیں

حفیظ نے دوسرا خط کراچی سے ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو محمد خورشید عاصم کے نام لکھا۔ حفیظ کا یہ خط بغیر سلام دعا کے شروع ہوا اور بغیر نام کے ختم ہوا۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ ہر وہ شخص گدھا ہے جو اپنے برابر کے دوستوں کو گدھا کہے اور وہ اپنے دوستوں سے محترم کے معنی بھی دریافت کر رہے ہیں اور اپنے ایک دوست گجر سے مخاطب ہیں کہ ان کا خط ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو ملا۔ حفیظ کو گجر کے طرزِ خطاب سے غصہ آیا لیکن انہوں نے غصہ تھوک دیا اور کہا کہ اگر گجر کا وہ خط مل جاتا تو وہ تار دے کر پنڈی بلا لیتے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی اور بچی بھی ہیں اور وہ اپنے ایک رشتے دار جو حکومت کے ڈپٹی سیکرٹری ہیں ان کے گھر اپنی بیوی کو چھوڑ کر حسن ابدال جانا ممکن نہ تھا۔ حفیظ کو پنڈی میں پشاور روڈ پر مکان ملنے والا ہے اور جب وہ وہاں آگئے تو ہر تیسرے چوتھے روز وہ اپنی موٹر کار پر سوار ہو کر حسن ابدال جایا کریں گے اور گجر کے ساتھ گاجریں کھایا کریں گے اور مزہ اڑائیں گے۔

حفیظ صاحب خورشید سے کہتے ہیں کہ مرزا منور کا دماغ قطعاً خراب ہو گیا ہے اور ان کو ڈرانے دھمکانے پر آمادہ ہے۔ لیکن وہ اب مرزا کے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں اس لیے وہ خورشید سے اس سازش کا حصہ بننے کو کہتے ہیں کہ مرزا کو کسی بہانے پنڈی بلا لیں اور ایک ٹانگ توڑ ڈالیں اور دونوں آنکھوں پر کھوپے چڑھا دیں، پھر نہ پڑھ سکے گا اور نہ ہی بھاگ سکے گا اور خوب مار مار کر کھلائیں پلائیں گے۔ حفیظ صاحب خورشید سے یہ شرط رکھ رہے ہیں مغل کو اس کا پتہ نہ چلے اور جو کچھ ان کے دل میں تھا انہوں نے کہہ دیا اور وہ اب خورشید کا جواب آنے پر پھر لکھیں گے۔

حفیظ نے قیس شروانی (مدیر فردوس سیالکوٹ) کے نام خط تحریر کیا۔ اس خط کی تاریخ نہیں درج کی گئی۔ اس خط کا آغاز بھی بغیر سلام دعا کے کیا گیا ہے۔ حفیظ کہتے ہیں کہ ان کو فردوس ادب کا شمارہ مل گیا اور اس کے ساتھ چند خطوط بھی ملے ہیں جو فردوس ادب سے لطف اندوز ہونے والوں نے حفیظ کے لیے لکھے ہیں۔ انہوں نے حفیظ نے پہلا مکتوب پڑھتے ہی فردوس کا باب کھولا تو دروازے کے اندر ان کی آنکھوں کو اپنا وہی ذاتی نیاز نامہ جلوہ آرا نظر آیا۔ وہ قیس سے کہتے ہیں کہ انہوں

نے ان کو جیتے جی فردوس میں داخل کر ہی لیا۔ البتہ وہ فردوسیوں کو کیسے بتائیں کہ

زندگی سے نبٹ رہا ہوں ابھی
موت کیا ہے میری بَلا جانے

فردوس میں جہاں تک شعر کا تعلق ہے ملک کے دوسرے ادبی طریقوں سے بہت زیادہ سلیقہ موجود ہے۔ حفیظ خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ کاش وہ بھی دوسری دنیا کے فردوس کی طرف کشاں کشاں لے جائے جانے سے پیشتر ایک آدھ پھول پنکھڑی اپنے دل پرخون کی یادگار کے طور پر چھوڑ سکیں۔ وہ کہتے ہیں اگر زندگی رہی تو اپنے معذور قلم سے کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں گا۔ وہ ایک جگہ اٹک گئے کہ قیس نے جموں اور کشمیر میں پہلے کُل ہند مشاعرے پر جو کچھ لکھا ہے انہوں نے بہت سے مشاعروں کی یاد کو ایک ہی نقطے میں سمیٹ دیا ہے۔ حفیظ کا مشاہدہ ہے کہ جموں اور کشمیر کے اس پہلے مشاعرے میں جب پہلی مرتبہ سیمابؔ صاحب کے ساتھ ساغرؔ صاحب اور جمال صابری جموں وارد ہوئے تھے۔ پنڈت ہری چند اختر، حکیم یوسف حسن، امر چند قیس اور موہن لال ساغرؔ شامل نہیں تھے۔ حفیظ کو یاد ہے کہ وہ مولانا سُہیا کے پاس لاہور میں بیٹھا تھا کہ مولانا تاجور صاحب تشریف لائے وہ جموں سے پلٹے تھے۔ تاجور صاحب نے جموں کے مشاعرے کا تذکرہ کیا جہاں وہ ارباب علم کے شعراء کے ساتھ لے جا کر شریک ہونے کے لیے گئے تھے۔ مولانا نے انہیں بتایا کہ سیمابؔ صاحب دو عدد خوبرو چھوکرے ساتھ لاتے تھے۔ ایک کا تخلص ساغرؔ اور دوسرے کا جمالؔ تھا۔ مولانا تاجور بڑے لسان تھے انہوں نے ساغر صاحب کے شعر پڑھنے ہی کا نہیں بلکہ اسٹیج پر تھرکنے کا سماں بیان کیا اور اعتراف کیا کہ خود تاجور اور ان کے ساتھ ان ہر دو عروس کے براتی بن کر رہ گئے تھے اور حفیظ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ حفیظ صاحب آپ اس وقت تو ہنس رہے ہیں اگر آپ بھی وہاں ہوتے تو آپ کو بھی ہماری ہی طرح کھسیانا ہو کر آنا پڑتا۔ تاجور صاحب نے بتایا کہ سیمابؔ صاحب اور ان کے چھوکرے بھی کل ہی لاہور پہنچے ہیں۔ مولانا سہا نے حفیظ کی فرمائش پر آدمی بھیجا کہ سیماب صاحب کو دعوت دی جائے اور ان کے چھوکروں کی ادائے شعر خوانی سے لذت حاصل کی جائے۔ لیکن آدمی نے واپس آ کر خبر دی کہ وہ لوگ رات ہی کی گاڑی سے آگرے جا چکے ہیں۔

حفیظ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ اس کے دوسرے سال جموں ہی میں تاجور اور ان کے ساتھی شاعروں کی بجائے حفیظ اور ان کے چند ساتھیوں کو دعوت دی گئی۔ رام رچھپال صدارت کے لیے بلائے گئے۔ حفیظ نے سیماب و ساغر کو اس وقت تک دیکھا نہیں تھا اس لیے ان کو دوچار ہونا پڑا۔

حفیظ خیر پور سندھ بطور شاعر دربار چلے گئے۔ جہاں چند ماہ رہ کر انہوں نے ''رقاصہ'' لکھنے اور دربار میں سنا دینے کی پاداش میں تین دن حوالات میں رہنا پڑا۔ اس کے بعد جموں کا وہ مشاعرہ آتا ہے جس میں حفیظ اور حفیظی حلقہ شعر انظر آتے ہیں۔ حفیظ کی بزم پنجاب سے لاہور میں شعر و فن کے الگ الگ محاذ بن چکے تھے۔

حفیظ اوران کے ساتھ ڈاکٹر تاثیر، پنڈت ہری چند اختر، سوہن لال ساحر اور امر چند قیس جموں پہنچے تھے اور قیس کی قدیم حویلی میں ریذیڈنٹس روڈ پر ٹھہرے تھے۔ حکیم یوسف حسن مدیر یزنگ خیال اگرچہ شاعر نہ تھے مگر حفیظ اوران کے ساتھیوں نے ان کو اپنے ساتھ ''طائفہ'' کے بینڈ ماسٹر کی حیثیت سے لیا تھا تا کہ ساغر اور جمال کی نگاہوں سے شاعروں کے دل قابو میں رہیں۔ مشاعرے کے صدر رام رچھپال سنگھ شیدا ان کے ساتھ ٹرین کے ایک ہی خانے میں سے جموں اسٹیشن پر اترے تھے۔ تاجور صاحب کے ارباب علم میں سے محض برادرم اثر صہبائی اور سید عابد علی عابد ہی آئے تھے۔ سیماب صاحب دوسرے دن آئے تھے۔ ان کے ساتھ ساغر تو تھے مگر جمال نہ تھے ان کے ایک فرزند بھی تھے۔ آگرے کے ایک جوتوں کے سوداگر حاجی محمد عمر بھی موجود تھے اور ان کو صاحب دیوان بھی بیان کیا گیا تھا اور یہ بھی ثابت ہوا تھا کہ سیماب صاحب نے ایک دیوان حاجی صاحب کے لیے خاصی قدر و قیمت سے شائع فرما دیا ہوا تھا، حفیظ کو اس مشاعرے میں جو کچھ پیش کیا مصرع طرح تو یاد نہیں البتہ دیوانہ چاہیے افسانہ چاہیے زمین تھی۔

حفیظ اوران کے ساتھی آغاز ہی سے مشاعرے میں شامل تھے۔ لیکن سیماب صاحب کی طرف بار بار بلاوا بھیجا جا رہا تھا اور جواب آتا کہ ابھی تو غزلیں صاف ہو رہی ہیں، مشاعرے میں مقامی شعراء داد سخن دے رہے تھے۔ سیماب صاحب نے قیام گاہ سے مشاعرے تک کا فاصلہ ٹانگے پر طے کیا اور ان کے آتے ہی شور برپا ہو گیا، حفیظ اور ان کے ساتھ مزا لے رہے تھے۔ سامعین مشاعرہ کے شور نے منجھے ہوئے اخبار نویس اور کہنہ مشق شاعر رام راچھپال سنگھ شیدا کو مجبور کر دیا کہ اب ساغر کو فوراً پیش کر دیں، ساغر صاحب تشریف لائے اور نظم ارشاد ہوئی پہلے ہی مصرع سے واہ واہ ہونے لگی، شاعر لوگ حیران تھے کہ اکثر اشعار بہت کچھ سر کھر کھنے کے باوجود ہمارے فہم سے باہر ہیں۔ حفیظ کے ساتھی شعرا حیرت میں تھے اور حفیظ نے بھانپ لیا تھا کہ یہ داد شعر کی نہیں یہ داد اس ہاتھ کی ہے جو شعر کا مصرع منہ سے نکلنے کے ساتھ ہی پہلے تو تھوڑی دیر ہوا میں ناچتا ہے اور پھر سامعین کی نگاہوں کو اپنے ساتھ نچواتا ہوا یک لخت مصرعے کے خاتمے کے ساتھ بجلی کی طرح گرتا ہے۔ بے چارے سامعین سمجھتے تھے کہ شعر و شاعری کا کمال شاید یہی ہے۔

حفیظ صاحب قیس کو کہتے ہیں کہ شعر و ادب میں ہر فرد پر ایک دور جاہلیت بھی گزرتا ہے، مولانا تاجور ایسے سخنور ادیب اور لسان اور ان کے ارباب علم والوں پر جموں کے پہلے مشاعرے میں کیا کچھ نہ بیت گئی ہوگی۔ لہٰذا ساغر صاحب کے بیٹھنے سے پہلے ہی انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے حلقہ احباب میں سے کسی کو اس وقت تک اٹھ کر شعر پڑھنے نہ دوں گا جب تک اس طلسم ہوشربا کو توڑ نہ ڈالوں۔ حفیظ نے چٹ پر اپنا نام لکھ کر صدر کی خدمت میں پہنچا دیا۔ تاثیر اور پنڈت روکتے رہے لیکن انہوں نے کہا بہتر ہے کہ سب سے پہلے جموں کی ہُوٹنگ ان کے نصیب میں آئے۔ قیس صاحب کو بھی یاد آ جانا چاہیے کہ حفیظ نے جو نظم جموں کے اس شاعر کش مشاعرے میں پڑھی تھی وہ نظم ''شاندار گنگا'' تھی۔ انہوں نے یہ نظم چوتھی، پانچویں جماعت کے بچوں کے لیے اخبار پھول میں چند برس پہلے شائع کی تھی۔ اس نظم میں دریائے گنگا کے گنگوتری سے

نکلنے اور پھر اپنے میدانی پجاریوں سے خراج لیتے ہوئے بہتے چلے جانے کے چند مناظر تھے۔ جو ہر شخص کی سمجھ اور تصور میں آ سکتے تھے اور بہت ہی سادہ طفلانہ اردو میں نظم کیے گئے تھے۔ سامعین کو اچانک یہ معلوم ہوا کہ شعر تو سمجھ میں بھی آ سکتے ہیں۔ حفیظ یہ نظم پڑھ کر بیٹھ گئے۔ اب طلسم ہوشربا ٹوٹ چکا تھا، ساغرؔ صاحب کو سیماب صاحب نے بار بار اٹھوایا کہ اب مشاعرہ دستکاری کے بس کا نہ پایا۔ شاعر لوگ تو اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ساغرؔ صاحب کو روایتی داد دیتے تھے لیکن سامنے کا ہجوم ان کی داد دینے پر ہنسنے لگا۔ لوگوں کے اصرار نے بار بار حفیظ کو بلایا۔ آخر ''ابھی تو میں جوان ہوں'' کے دوران ہی سیماب صاحب ساغر کو کسی بہانے سے مشاعرے سے باہر لے گئے اور پھر واپس نہ پلٹے اور پھر دوسرے شعرا نے اپنا اپنا کلام اہل ذوق کے اصرار پر بار بار سنایا۔

یہ دور جاہلیت کا وہ معرکہ تھا جو جموں کے معاشرے میں پیش آیا یہی وہ دن تھے جس کے بعد سیمابؔ صاحب اور ساغرؔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حفیظ کے خلاف ہو گئے۔ اس جموں کے مشاعرے کے بعد حفیظ کی ہمیشہ کے لیے جموں کشمیر سے وابستگی ہو گئی تھی۔ اس مشاعرے کے بعد بہت سے مشاعروں میں حفیظ موجود تھے لیکن سیمابؔ و ساغرؔ سے پھر ملاقات نصیب نہ ہوئی۔ حفیظ جاہلیت کا وہ دور بھول چکے تھے۔ جموں کے پہلے مشاعرے کی اس طرحی غزل کا مطلع حفیظ نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان دنوں وہ بھی طرحی غزلیں شوق سے کہتے تھے اور کاش وہ زمانہ چند دن کے لیے دوبارہ آ جائے۔

مل جائے مے تو سجدہ شکرانہ چاہیے
پیتے ہی ایک لغزشِ مستانہ چاہیے

مجموعی جائزہ

حفیظ جالندھری اردو ادب کی ایک سربرآوردہ اور باکمال شخصیت ہیں۔ ان کی شخصیت کی مختلف جہتیں اور حیثیتیں ہیں۔ اگرچہ حفیظ جالندھری کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بہت زیادہ اعتراف کیا گیا مگر ان کے نثری مقام ومرتبہ پر چند مختصر تحریروں کے علاوہ کام نہیں ہوا۔

حفیظ جالندھری نے جہاں تاریخ اسلام اور مناظر فطرت کو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے اشعار کے خوبصورت پیرائے میں ڈھالا ہے وہاں انہوں نے قابل توجہ نثر بھی تحریر کی ہے۔

حفیظ جالندھری کی صحافتی زندگی میں ان کی نثری خصوصیات اجاگر ہوئیں۔ حفیظ جالندھری ماہنامہ اعجاز، شباب اردو، ہزارداستان، نونہال اور مخزن جیسے جرائد سے میکلف رہے اس صحافتی عرصے میں ان کی تخلیقات میں زیادہ تر ادبیانہ اداریے اور جذبات سے بھرپور افسانے شامل ہیں۔ حفیظ جالندھری کی ان تحریروں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی نثر کے بارے میں یہ چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ایجاز واختصار، اظہار مطلب پر گرفت اور موزوں اور مناسب ترین الفاظ کا استعمال ہے۔

حفیظ کی نثری تخلیقات میں 'ہفت پیکر'' (طبع زاد افسانے)، ''معیاری افسانے'' (منتخب کردہ)، ''چیونٹی نامہ''، ''نثرانے'' (مختلف مضامین کا مجموعہ)، دیباچے، تعارف نامے، خطوط وغیرہ شامل ہیں۔ حفیظ کی نثر کا مجموعی جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نثر سادگی اور سلاست کا عمدہ نمونہ ہے۔ ان کے افسانے اردو نثر میں عمدہ اضافہ ہیں۔ حفیظ جالندھری نے جب افسانہ نگاری شروع کی۔ اس دور میں ابھی اردو افسانوں کی بنیاد مستحکم نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی حفیظ جالندھری کے افسانے مختصر افسانے کی ٹیکنیک پر پورے اترتے ہیں۔ حفیظ کا افسانہ ایک مکمل تاثر قائم کرنے کے بعد ختم ہوتا ہے کسی جگہ پر ایسا تاثر نہیں ملتا کہ افسانہ نگار قاری کی توجہ کو غلط راستے پر لے جا کر بے جا طوالت اختیار کر رہا ہے یا بلاوجہ اختصار اختیار کر کے اپنے فرائض سے غفلت کا ارتکاب کر رہا ہے۔ حفیظ جالندھری کے تمام افسانوں میں وحدت تاثر کبھی بھی زائل نہیں ہوتا۔ جو ایک کامیاب افسانہ نگار کی سب سے بڑی خوبی ہے یہی وجہ ہے کہ حفیظ جالندھری کے افسانے کو پڑھتے ہوئے قاری ایک خاص قسم کا لطف، سرور اور بشاشت محسوس کرتا ہے۔ حفیظ جالندھری کے افسانے کا پلاٹ ان کی فن کارانہ صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہے۔ حفیظ جالندھری کے تمام افسانوں کے واقعات کی کڑیاں اس خوب صورتی سے ایک دوسرے سے مستقبل نظر آتی ہیں کہ قاری کسی بھی لمحے عدم دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ اس وجہ سے ایک خاص قسم کا تاثر ابھارنے میں حفیظ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ حفیظ کے افسانوں کے پلاٹ میں ایک ہی قسم کا تاثر قائم رہتا ہے یعنی وہ اپنے

افسانوں میں مخلوط پلاٹ استعمال نہیں کرتے۔

حفیظ جالندھری کے افسانوں کی ایک اور نمایاں خوبی وہ خاص قسم کی زبان ہے جو وہ اپنے افسانوں میں استعمال کرتے ہیں عبارت کے موزوں الفاظ اور مناسب جملے حفیظ کے احساسات کی صحیح اور مخلصانہ ترجمانی کرتے ہیں اگرچہ لسانی لحاظ سے بھی حفیظ کے افسانوں کا معیار بہت بلند ہے لیکن موضوعاتی اعتبار سے بھی حفیظ کے افسانے اس لحاظ سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں کہ ان میں زندگی اپنی تمام رنگا رنگیوں اور تنوعات کے ساتھ ان کے افسانوں میں بے نقاب نظر آتی ہے۔ وہ زندگی کی تمام تفصیلات کو ایک مختصر سے افسانے میں سمو دیتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ جالندھری کے افسانے میں زمان و مکان یکجا ہو کر جذب ہو گئے ہیں۔

حفیظ جالندھری کے افسانوں کے کردار ہماری دنیا کے باشندے ہیں۔ وہ خیالی ہواؤں میں سانس نہیں لیتے بلکہ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کردار کہیں اس کے ہمسائے یا رشتہ دار تو نہیں۔ حفیظ جالندھری نے کبھی بھی زمان و مکان کی حد میں توڑ کر خیالی دنیا میں سفر نہیں کیا۔ حفیظ جالندھری کے افسانوں میں کہیں بھی انوکھا پن اور مافوق الفطرت عنصر موجود نہیں ہے۔ حفیظ جالندھری کے افسانے اردو کے معروف افسانوں سے کسی بھی طرح کم نہیں مگر حفیظ جالندھری کی شاعری کی غیر معمولی شہرت نے ان کے افسانوں پر دہ سا ڈال دیا ہے اور ان کی شاعری کے تناسب سے ان کے افسانوں کی حیثیت ثانوی سی دکھائی دیتی ہے مگر کسی طور بھی حفیظ کے افسانوں کو معیار کے اعتبار سے کوئی ناقد رد نہیں کر سکتا۔ یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ حفیظ جالندھری نے اپنی شاعری اور گیتوں میں جو جگہ بنائی اس کی مثال تلاش کرنا مشکل ہے مگر یہ مرتبہ حفیظ جالندھری اپنے افسانوں میں پیدا نہ کر سکے۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ حفیظ جالندھری نے جس انداز میں اپنی شاعری کو توجہ دی شاید اس لحاظ سے وہ اپنی صحافت اور افسانہ نگاری پر بھرپور توجہ نہ دے سکتے۔ شاید حفیظ جالندھری کے اپنے خیال میں بھی ان کی شاعری کی نسبت ان کا افسانہ نگاری کی حیثیت ثانوی تھی۔ اگر وہ ایک عظیم شاعر ہونے کے بعد خود کو عظیم افسانہ نگار بنانے پر مصر ہوتے تو وہ یقینی طور پر اپنی افسانہ نگاری کے فن کو مزید نکھارتے اور اس میں اضافہ کرتے۔

حفیظ جالندھری صحافت کے میدان سے اگرچہ تا دیر وابستہ نہ رہ سکے لیکن چند سال اخبارات و جرائد میں ان کے لیے کام کرنا بہت مفید ثابت ہوا۔ ان کو شہرت اور پذیرائی حاصل ہوئی اور بہت سے اہم لوگوں سے ان کے تعلقات وابستہ ہوئے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ صحافتی خدمات کے باعث حفیظ جالندھری کا فکری اور سماجی دائرہ وسیع ہوا۔ لندن میں جارج برنارڈ شا سے ملاقات اور انگریزی ادب سے ابتدائی واقفیت کے باعث بھی حفیظ جالندھری کا دائرۂ فکر وسیع ہوا اور ان کی نثر مغربی افکار و الفاظ سے مزین ہوئی۔ حفیظ جالندھری کی صحافتی زندگی نے ان کی شاعری کو ایک لحاظ سے تقویت بھی بخشی۔ حفیظ جالندھری جب لاہور آئے اور انہوں نے بچوں کے اخبار پھول کی ادارت کی اس دوران یے میں ان

کو بچوں کی نفسیات کے مشاہدے کا بھرپور موقع ملا اور انہوں نے

بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر متعدد نظمیں لکھیں، بچوں کی یہ نظمیں ''بہار کے پھول'' اور ''پھول مالا'' کے تحریرِ عنوان دو مجموعوں کی شکل میں شائع ہوئیں اور بعد ازاں ''حفیظ کے گیت اور نظمیں'' کے زیرِ عنوان چار جلدوں میں یک جا کر دی گئیں۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حفیظ جالندھری کی صحافت نے ان کی شاعری کو تقویت بخشی۔

سلاست حفیظ جالندھری کی تمام نثری تخلیقات کا بنیادی اور مشترک جزو ہے۔ حفیظ جالندھری نے طلسم ہوش ربا اور الف لیلیٰ سے بعض کہانیاں اخذ کر کے ان کو آسان اردو میں بچوں کے لیے تحریر کیا۔

چیونٹی نامہ حفیظ کی ایک مستقل نثری تحریر تھی۔ جید ماہرین حیاتیات کے تجربات پر مبنی مشاہدات کی مدد سے حفیظ نے اس کتاب کو مرتب کیا۔ حفیظ کو اس کتاب کو مرتب کرنے کی وجہ ان کی بچپن سے چیونٹیوں سے دلچسپی تھی۔ اس کتاب میں کوئی نصیحت نہیں نظر آتی۔ لیکن جس زیرِ زمین تہذیب کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ سب مخلوق دوستی کی تصویر کشی ہے۔ یہ کتاب بہت شگفتہ انداز میں ہمیں بتاتی ہے کہ ہزار ہا اقسام کی چیونٹیاں اپنی الگ تہذیب اور الگ مقصد زندگی رکھتی ہیں۔ چیونٹی نامہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ مخلوق بھی ایک نظم و ضبط کے ساتھ الگ شہر بناتی اور اپنی زندگی کے الگ اصول رکھتی ہیں۔

نثرانے حفیظ جالندھری کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں ادبی، سوانحی، تنقیدی، اسلامی، معاشرتی اور کچھ متفرق قسم کے مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ مضامین اہم ادبی شخصیات پر تحریر کیے گئے جن میں نمایاں نام علامہ اقبال، غالب، علامہ مشرقی، عابد علی عابد، احمد ندیم قاسمی وغیرہ شامل ہیں۔

دیباچوں کے حوالوں سے حفیظ کی نثر کو دیکھیں تو انہوں نے بہت سی کتب کے دیباچے تحریر کیے۔ جن میں ان کی اپنی کتب اور دوسرے ادیبوں کی کتابوں پر دیباچے شامل ہیں۔

تعارف ناموں میں حفیظ صاحب نے مختلف کتابوں کے تعارف اور اپنی کتابوں کا تعارف کروایا ہے۔

خطوط کے ذریعے حفیظ کی ذاتی اور ادبی زندگی کے بہت سے گوشے وا ہوتے ہیں۔ جن کے ذریعے نہ صرف حفیظ کی ذاتی زندگی کے بہت سے مسائل کا پتا چلتا ہے۔ بلکہ ان کے عہد کے ادیبوں اور ادب کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔ کہیں وہ اپنی بیٹی کی بیماری کا ذکر کرتے ہیں تو کہیں اعظم کریوی جیسے نابغہ روزگار کے قتل کا۔ اس طرح حفیظ کے خطوط نثر میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔حفیظ جالندھری،''چیونٹی نامہ''،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۱ء،ص ۱۰

۲۔سید ضمیر جعفری،''کتابی چہرے''،مکتبہ المختار،راولپنڈی،س ن،ص ۴۵

۳۔بیگم خورشید حفیظ جالندھری،''ابوالاثر.......میرا شوہر''،علمی پرنٹنگ پریس،لاہور،س ن،ص ۲۵۳

۴۔ ایضاً ص ۲۴۱

۵۔حفیظ جالندھری،''نثرانے''، مجلسِ اردو۔کتاب خانہ حفیظ،لاہور،۱۹۷۶ء،ص ۸

۶۔ ایضاً ص ۱۲

۷۔ ایضاً ص ۱۶

۸۔ ایضاً ص ۶۳

۹۔ ایضاً ص ۲۱۱

۱۰۔ ایضاً ص ۲۲۴

۱۱۔ ایضاً ص ۹۴

۱۲۔ ایضاً ص ۱۴۴

۱۳۔ ایضاً ص ۱۹۶

۱۴۔ ایضاً ص ۱۹۶

۱۵۔ ایضاً ص ۲۵۰

۱۶۔ ایضاً ص ۴۶

۱۷۔ ایضاً ص ۵۰

۱۸۔ ایضاً ص ۵۰

۱۹۔ ایضاً ص ۸۳

۲۰۔ ایضاً ص ۸۲

۲۱۔ ایضاً ص ۷۱

۲۲۔ ایضاً ص ۸۱

۲۳۔ ایضاً ص۸۱
۲۴۔ ایضاً ص۲۳۸
۲۵۔ ایضاً ص۲۴۴
۲۶۔ ایضاً ص۲۴۸
۲۷۔ ایضاً ص۲۴۸
۲۸۔ ایضاً ص۱۱۹
۲۹۔ ایضاً ص۱۲۵
۳۰۔ ایضاً ص۳۳
۳۱۔ ایضاً ص۲۱
۳۲۔ ایضاً ص۲۳
۳۳۔ ایضاً ص۲۴
۳۴۔ ایضاً ص۲۴
۳۵۔ ایضاً ص۲۵
۳۶۔ ایضاً ص۴۰
۳۷۔ ایضاً ص۹۸
۳۸۔ ایضاً ص۱۰۳
۳۹۔ ایضاً ص۱۱۰
۴۰۔ ایضاً ص۱۳۰
۴۱۔ ایضاً ص۱۳۴
۴۲۔ ایضاً ص۱۳۹
۴۳۔ ایضاً ص۱۶۵
۴۴۔ ایضاً ص۱۷۲
۴۵۔ ایضاً ص۱۸۲
۴۶۔ ایضاً ص۱۸۵
۴۷۔ ایضاً ص۱۹۰

۴۸۔ ایضاً ص۲۳۹

۴۹۔ ایضاً ص۲۶۳

۵۰۔ ایضاً ص۲۵۶

۵۱۔ ایضاً ص۲۷۹

۵۲۔عبدالمجید بھٹی،''نام ونگ''،تعارف از حفیظ جالندھری،۱۹۴۶ء،ص۱۱

۵۳۔ ایضاً ص۱۳

۵۴۔حفیظ جالندھری،''شاہنامہ اسلام''،دیباچہ(جلد چہارم)،مکتبہ تعمیر انسانیت،اردو بازار،لاہور،س ن،ص۱۲

۵۵۔ ایضاً ص۱۶

۵۶۔ حفیظ جالندھری''سوز وساز''مشمولہ''بقلم خود''،لاہور،مجلس اردو اور کتاب خانہ حفیظ اردو،۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۵ء،ص۲۴۶

۵۷۔صہبا لکھنوی(مرتبہ)،''افکار(حفیظ نمبر)''،حفیظ،مشمولہ''بقلم خود''،مکتبہ افکار،کراچی،س ن،ص،۲۳۹

۵۸۔ ایضاً ص۲۶۹

۵۹۔ محمد طفیل''ماہنامہ نقوش''خطوط نمبر،شمارہ ۱۰۹،ادارہ فروغ اردو،لاہور،اپریل مئی ۱۹۶۸ء،ص۳۵۹

۶۰۔''سالنامہ نیرنگ خیال''،خطوط کے آئینہ میں،راولپنڈی،سال ۱۹۶۹ء،ص۲۲۲

کتابیات

بنیادی مآخذ

حفیظ جالندھری کی نثری تحریریں

۱۔ حفیظ جالندھری، ''ہفت پیکر''، (دوسرا ایڈیشن)، مجلس اردو، لاہور، ۱۹۴۰ء

۲۔ حفیظ جالندھری، ''ہفت پیکر''، مجلس اردو، لاہور، س ن

۳۔ حفیظ جالندھری، (منتخبہ و مرتبہ) ''معیاری افسانے''، دفتر مجلس اردو، ماڈل ٹاؤن، لاہور، ۱۹۴۱ء

۴۔ حفیظ جالندھری، ''نثرانے''، مجلسِ اردو۔ کتاب خانہ حفیظ، لاہور، ۱۹۷۶ء

۵۔ حفیظ جالندھری ''چیونٹی نامہ'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

۶۔ حفیظ جالندھری، ''شاہنامہ اسلام''، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اردو بازار، لاہور، س ن

۷۔ حفیظ جالندھری ''سوز و ساز'' مشمولہ ''بقلم خود''، لاہور، مجلس اردو اور کتاب خانہ حفیظ اردو، ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۵ء، ص ۲۴۶

ثانوی مآخذ

۸۔ اختر حسین رائے پوری، ''ادب اور انقلاب''، نیشنل ہاؤس بمبئی، روشن مینار کراچی، اردو اکادمی سندھ، جنوری ۱۹۵۸ء

۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تحریکیں''، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۹ء

۱۰۔ انیس ناگی، ''تنقید شعر''، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، بار اول، ۱۹۶۸ء

۱۱۔ بیگم خورشید حفیظ جالندھری ''ابوالاثر...... میرا شوہر''، علمی پرنٹنگ پریس، لاہور، س ن

۱۲۔ جمیل جالبی ڈاکٹر، ''پاکستانی کلچر''، کراچی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ایڈیشن پنجم، ۱۹۹۲ء

۱۳۔ جمیل یوسف ''حفیظ جالندھری''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء

۱۴۔ جمیل یوسف، ''باتیں کچھ ادبی، کچھ بے ادبی کی''، منظور عام پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۱۰ء

۱۵۔ حافظ جلیل حسن، جانشین امیر مینائی، مشمولہ معین الادب معروف بہ معین الشعرا، مرتب، منشی غلام حسین آفاق بنارسی، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، طبع جدید، ۲۰۰۳ء

۱۶۔ حافظ محمود شیرانی، ''پنجاب میں اردو'' (حصہ اول) اور اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء

۱۷۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، ''اوزانِ اقبال''، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۳ء

۱۸۔ حمید اللہ ہاشمی، پروفیسر ''فن شعر و شاعری اور روح بلاغت''، لاہور، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء

۱۹۔ خالد علوی، ڈاکٹر، ''غزل کے جدید رجحانات''، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء

۲۰۔ خواجہ محمد زکریا (مرتبہ) ''کلیات حفیظ جالندھری'' الحمد پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۵ء

۲۱۔ ساجد امجد، ڈاکٹر، ''اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات''، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۲۲۔ سلیم احمد، ''بیاض''، لاہور، نئی مطبوعات، ۱۹۶۶ء

۲۳۔ سلیم اختر ڈاکٹر، ''ادب اور کلچر''، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۰ء

۲۴۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ''اشاراتِ تنقید''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء

۲۵۔ سید ضمیر جعفری ''کتابی چہرے'' مکتبہ المختار، راولپنڈی، س ن

۲۶۔ سیدہ ناصرہ، ''حفیظ، فن اور شخصیت'' نیا زمانہ پبلی کیشنز، ۴ا بی ٹیمپل روڈ، لاہور، ۲۰۱۰ء

۲۷۔ طاہر تونسوی، (مرتبہ) "حیات اقبال" مشمولہ، مرزا منور، "ابوالاثر اقبال کے حضور میں" اقبال اکادمی، لاہور، س ن،

۲۸۔ عابد علی عابد، ''اصولِ انتقادِ ادبیات''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

۲۹۔ عابد علی عابد، سید، ''اسلوب''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

۳۰۔ عابد علی عابد، سید، ''شعرِ اقبال''، لاہور، بزمِ اقبال، طبع دوم، ۱۹۷۷ء

۳۱۔ عبدالمجید بھٹی، ''نام و ننگ''، تعارف از حفیظ جالندھری، ۱۹۴۶ء، ص ۱۱

۳۲۔ عزیز ملک (تالیف) ''حفیظ جالندھری (شخصیت اور فن)'' اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء

۳۳۔ عبدالسلام، نگران، اردو انسائیکلوپیڈیا، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۸۴ء

۳۴۔ عبدالسلام ندوی، مولانا، ''شعر الہند'' (حصہ دوم)، لاہور، عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۵ء

۳۵۔ مجنوں گورکھ پوری، ''پردیسی کے خطوط''، دہلی، مکتبہ جامعہ، جولائی ۱۹۶۱ء

۳۶۔ محمد اجمل، ڈاکٹر، ''مقالات اجمل''، لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۸۷ء

۳۷۔ مظفر عباس، ''اردو میں قومی شاعری''، لاہور، منظور پریس، اشاعتِ دوم ۱۹۸۷ء

۳۸۔ ممتاز الحق، ڈاکٹر، ''جدید غزل کا فنی، سیاسی و سماجی مطالعہ''، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، اشاعت دوم، ۲۰۰۴ء

۳۹۔ منیبہ خانم، ڈاکٹر، ''اردو میں قطعہ نگاری''، ملتان، بیکن بکس، ۲۰۰۹ء

۴۰۔ نظیر صدیقی (چیئرمین کورس ٹیم)، مطالعاتی رہنما، اردو ادب کی تحریکات اور تنقیدی نظریات، اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء

۴۱۔نفیس اقبال، ڈاکٹر، ''اردو شاعری میں تصوف میر سودا اور درد کے عہد میں''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
۴۲۔نوازش علی، ڈاکٹر (مرتب)، ''عبارت''، راولپنڈی، ادارہ عبارت، ۲۰۰۲ء
۴۳۔وزیر آغا، ڈاکٹر ''تنقید اور احتساب''، لاہور، جدید ناشرین، ۱۹۶۸ء
۴۴۔یوسف حسین خان، ڈاکٹر، ''اردو غزل''، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۴ء

رسائل و جرائد

۴۵۔حنیف فوق، ڈاکٹر، ''اردو غزل کے نئے زاویے''، لاہور، فنون، جدید غزل نمبر، ۱۹۶۹ء
۴۶۔''سالنامہ نیرنگ خیال''، خطوط کے آئینہ میں، راولپنڈی، سال ۱۹۶۹ء
۴۷۔صہبا لکھنوی (مرتبہ)، ''افکار''، حفیظ نمبر، مکتبہ افکار، رابسن روڈ، کراچی، ۱۹۶۳ء
۴۸۔صغیر احمد جان، ''فنون ادب''، پشاور، منظور عام پریس، ۱۹۵۸ء
۴۹۔محمد طفیل ''ماہنامہ نقوش'' خطوط نمبر، شمارہ ۱۰۹، ادارہ فروغ اردو، لاہور، اپریل مئی ۱۹۶۸

ضمیمہ جات

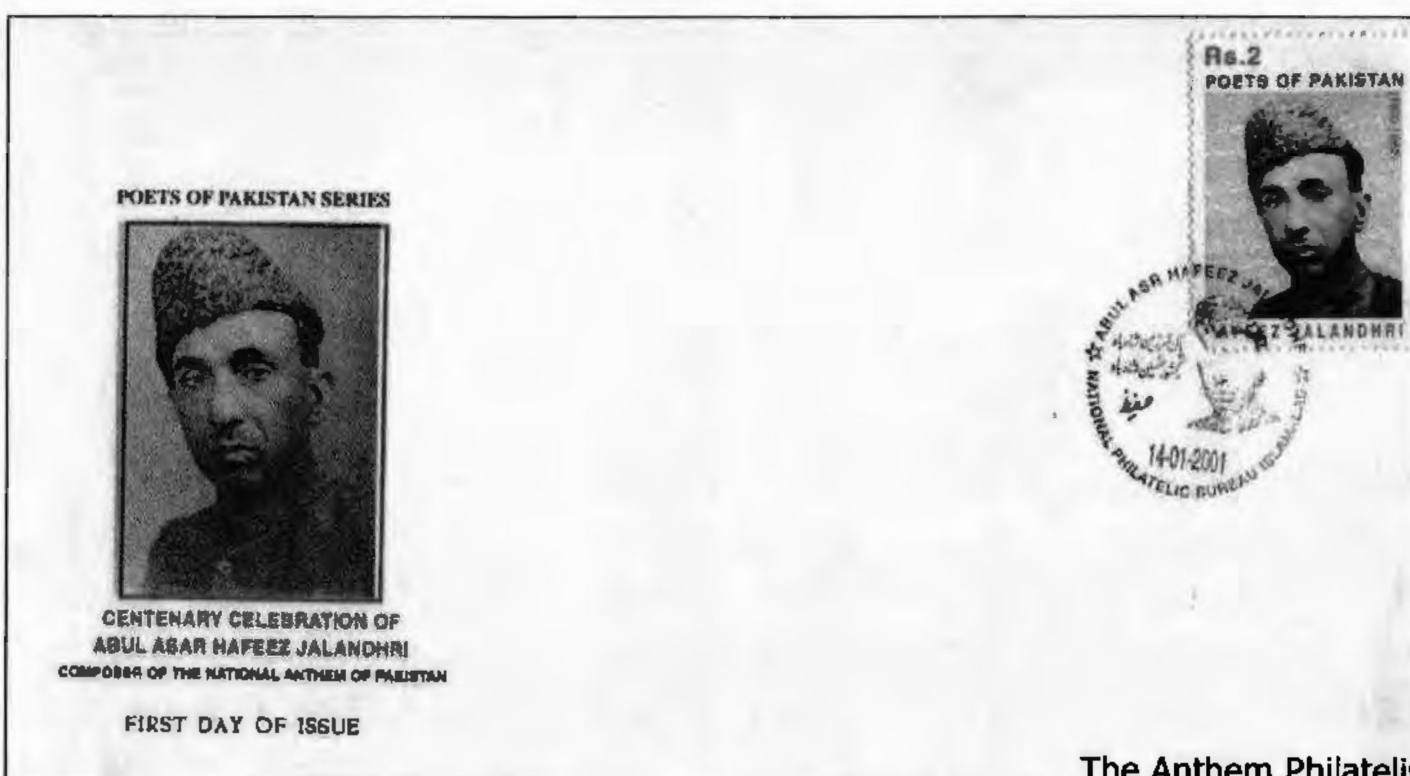

محکمہ ڈاک پاک کی جانب سے شائع ہونے والے حفیظ جالندھری کے یادگاری ٹکٹ

جلد اوّل
شاہنامہ
اسلام
www.pdfbooksfree.blogspot.com
تالیف: حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری کے مزار کا اندرونی منظر

مینارِ پاکستان لاہور کے پہلو میں حفیظ جالندھری کے مزار کا خوبصورت منظر

اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

10

حفیظ جالندھری (شخصیت اور فن)

تالیف : عزیز ملک

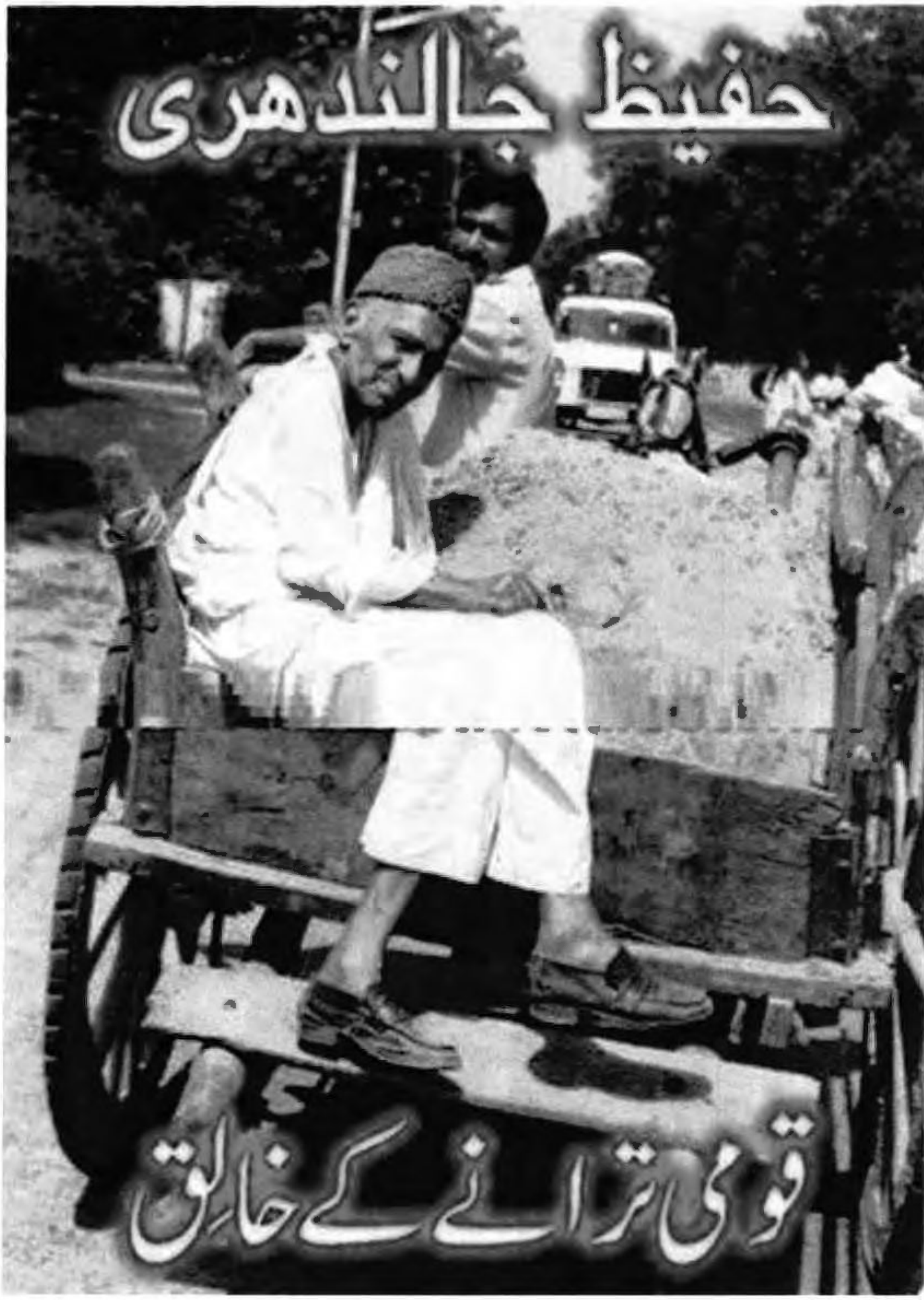

ابوالاثر حفیظ جالندھری کی زندگی کا درویشانہ رنگ

حفیظ

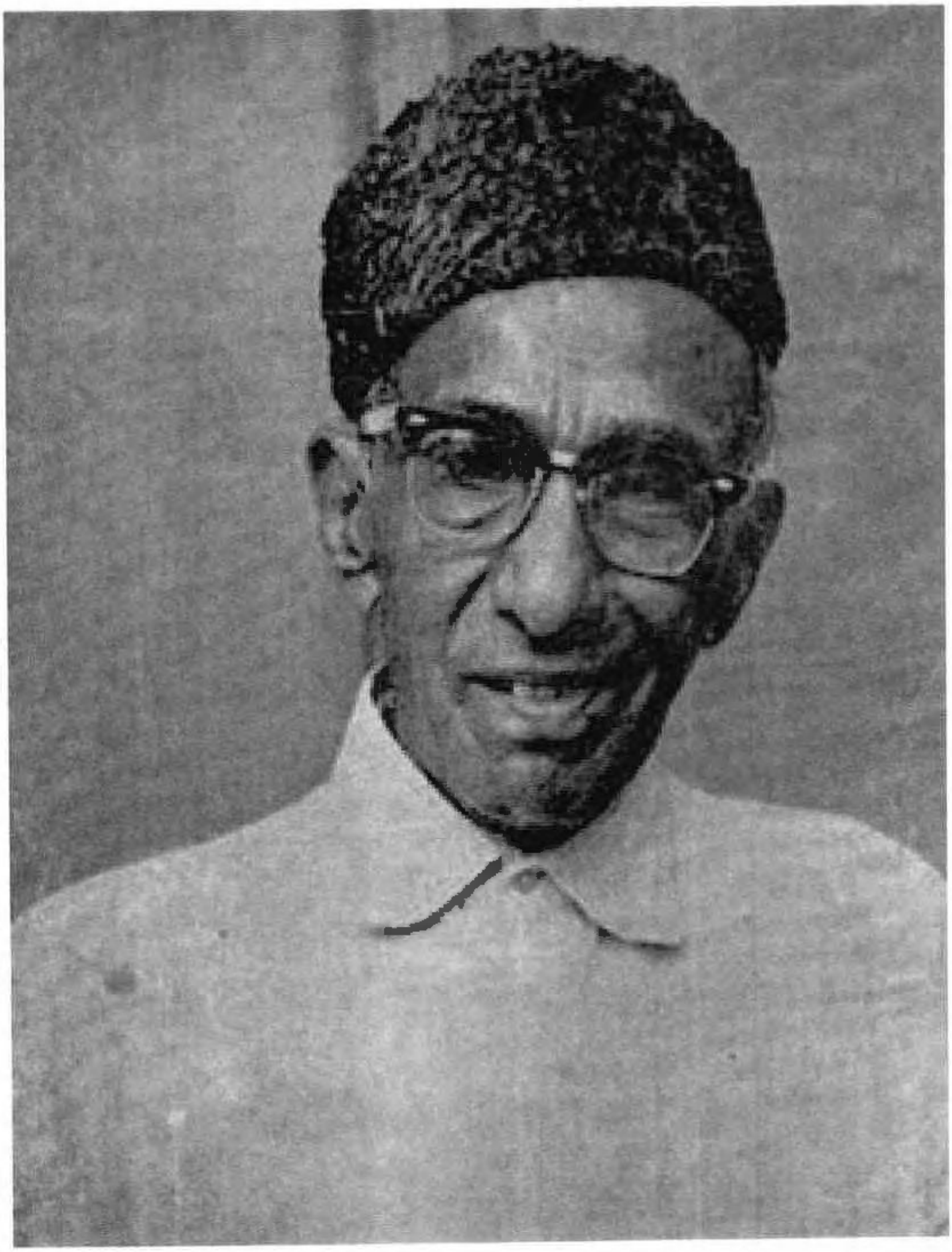

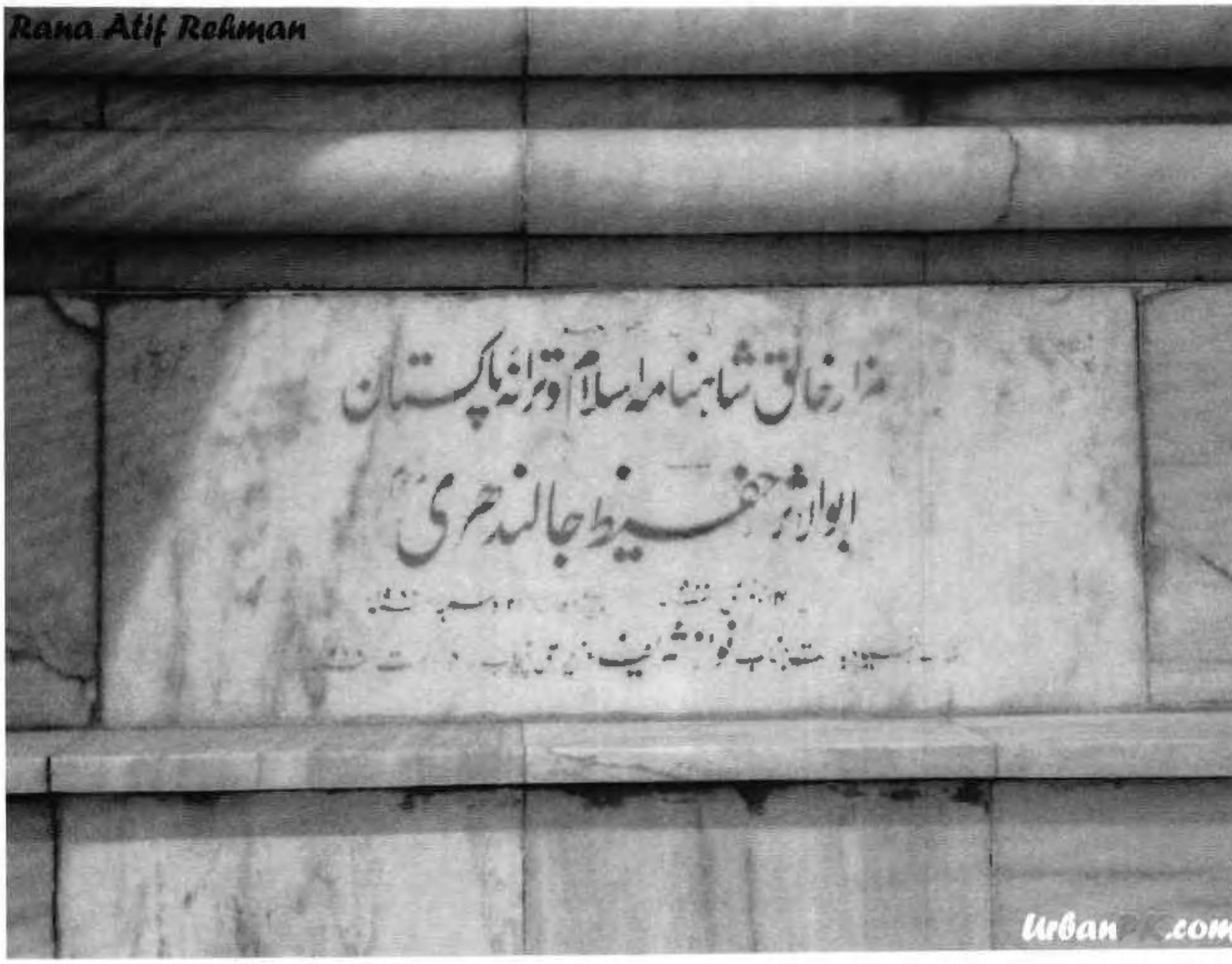

حفیظ جالندھری کی لوحِ مزار

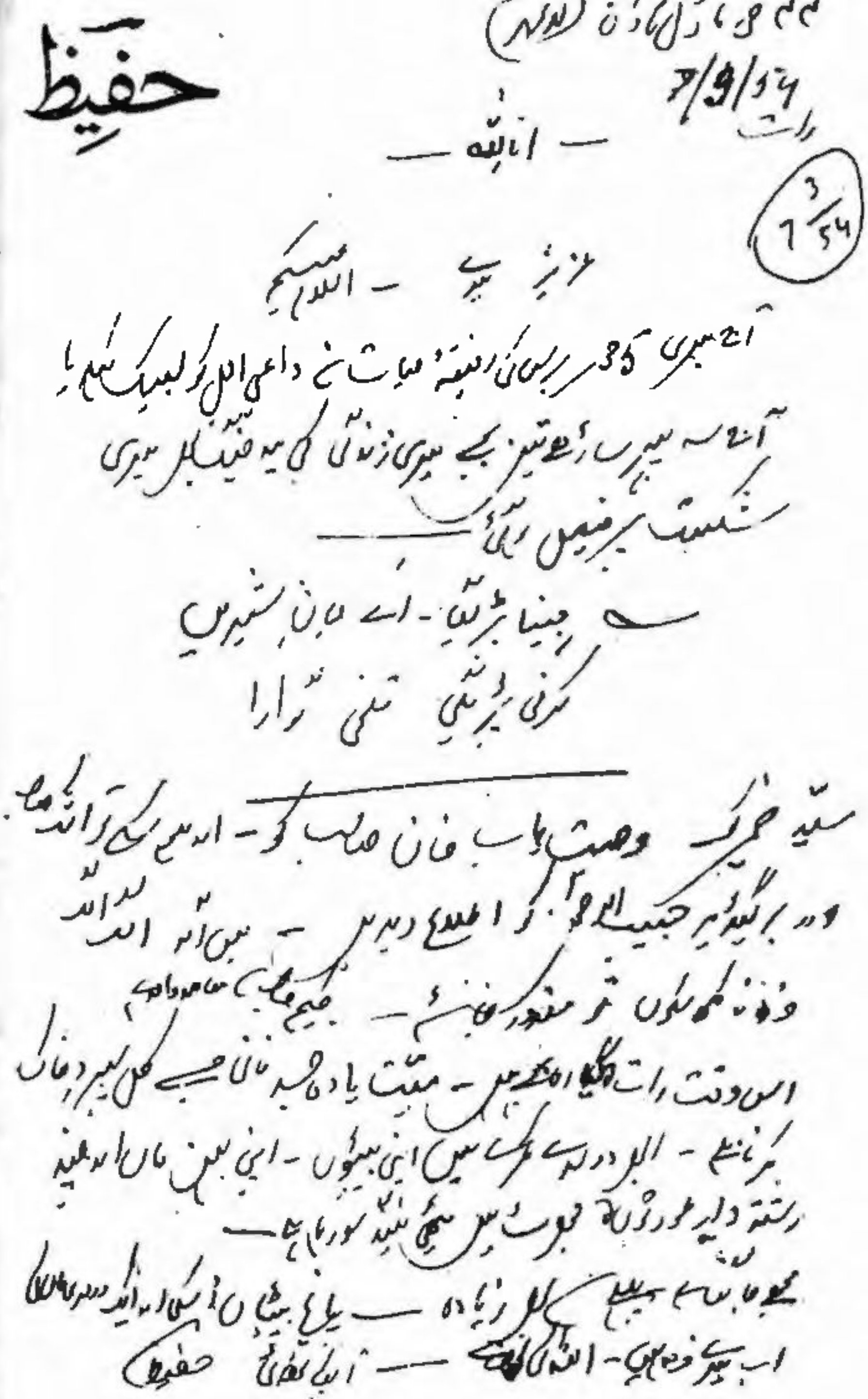

حفیظ جالندھری کا عکسِ تحریر

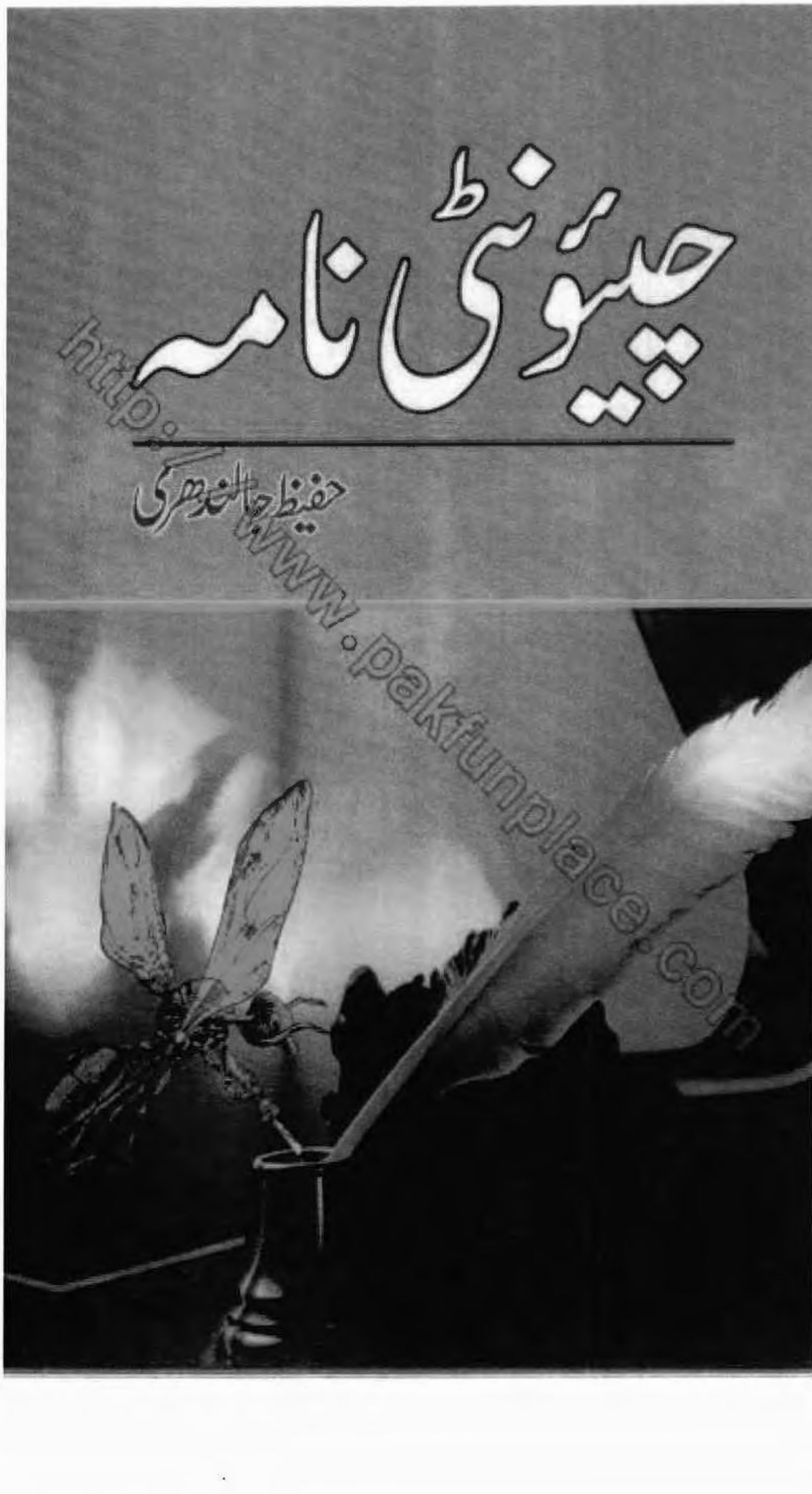

http://www.pakfunplace.com

حفیظ جالندھری کے مزار کا دروازہ

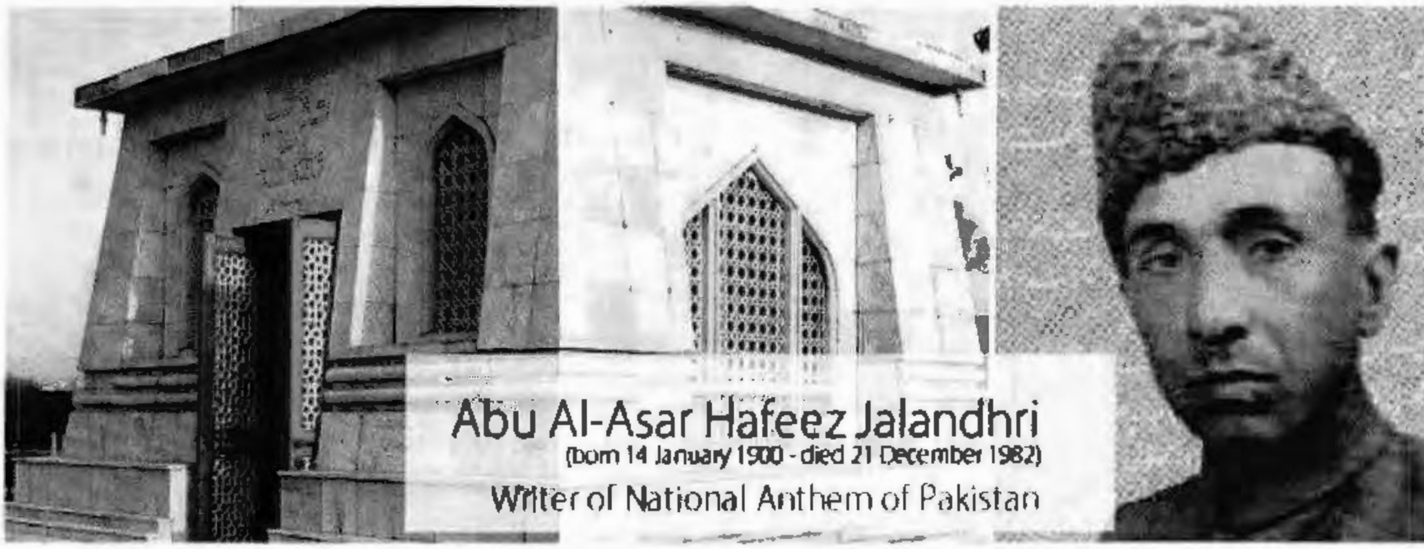

حفیظ جالندھری کی تصویر اور ان کا مزار

کلیات
حفیظ جالندھری